چراغِ راہ

شرح دعائے افتتاح

جلد اوّل

سیّد عقیل الغروی

مکتبہ کائنات۔ دلّی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چراغِ راہ

شرح دعائے افتتاح

علامہ سید عقیل الغَروِی مدّ ظلّہ

مکتبۂ کائنات - دلّی

بنامِ نورِ کائنات

نامِ کتاب : چراغِ راہ (شرح دعائے افتتاح)

تالیف : حجۃ الاسلام علامہ سید عقیل الغروی

سرِ ورق : سید سعود (دلّی)

تصویر : سعید آغا (ہوسٹن - امریکہ)

ناظمِ اشاعت : ڈاکٹر ایم۔آر۔قاسمی (علیگ)

کمپوزنگ : فیضان احمد ندوی (الم کمپیوٹر سینٹر - دلّی)

تاریخ : ۳ رشعبان المعظم ۱۴۲۵ھ (ستمبر ۲۰۰۴ء)

طباعت : ایرانین آرٹ پرنٹرس گلی قاسم جان دہلی

قیمت : دوسو روپے (Rs. 200)

یہ کتاب جناب سید رضوان کاظمی اور جناب سید امیر عباس زیدی صاحبان کے گرانقدر مالی تعاون سے شایع ہورہی ہے۔ مکتبۂ کائنات دونوں حضرات کا تہہ دل سے شکرگزار ہے!

اس کتاب سے ہونے والی آمدنی سفینہ چریٹیبل ہاسپٹل اینڈ ریسرچ سینٹر پر صرف کی جائے گی!

ناشر

مکتبۂ کائنات : 40-41، امام باڑہ لین، رشید مارکیٹ ایکسٹنشن، دلّی-۵۱

فون / فیکس: 22057745

شاخ دفتر : S-9/2، سفینہ روڈ، جوگا بائی ایکسٹنشن، جامعہ نگر، دلّی-25

فون: 26980120

مراکزِ اشاعت

Iternational Islamic Link,

Babul Murad 858, Harrow Road, Sudbury Wembley

London-HAO2PX, England U.K.

Ph: 0044-2089081525, Fax: 0044-2089080055

دفتر حوزۂ علمیہ جامعۃ الثقلین بلوار امین، بلاک ۳۰، قم مقدسہ، ایران

فون: 0098-2512934484

☆☆

عرضِ ناشر

اللہ ہی کے سہارے، جس کا فیض عام اور عنایتیں خاص ہیں!

مکتبۂ کائنات

کا

تصنیفی

تالیفی

اور اشاعتی منصوبہ

نظریاتی اعتبار سے

سخنِ حق

اور حقِ سخن

کا پابند ہے!

ادارہ

فہرست

شرفِ انتساب

عرشِ رحمت کی قندیل

قرۃ العینِ مصطفیٰؐ

حضرتِ فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کی

اس ''مَوَدَّت'' کے نام

جو فریضۂ قرآنی بھی ہے

اور

سرچشمۂ فیوضِ ربّانی بھی!

ہدیۂ ارادت

بہ حضور محدثِ جلیل علامۂ آیت اللہ سید محمد حسین حسینی جلالی (مقیم شکاگو)

جن کے سرچشمۂ علم و عمل کا فیضان

سرابِ زارِ مغرب کے تشنہ کامانِ جاں بلب کے لیے

چشمۂ آبِ حیات

کا ایک واقعی مصداق ہے!

حرفِ تعریف یا الف ولامِ کتاب

رشحۂ قلم حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید ذوالقدر رضوی مدظلہ العالی

اللہ ہی کے سہارے، جس کا فیض عام اور عنایتیں خاص ہیں!

ادب الدعاء انسانی سرمایۂ ادب کا وہ ادب العالیہ ہے جو دینی شعور اور مذہبی ادراکات کے بہترین متن اور بیان پر مشتمل ہے۔ اردو زبان میں اس کی ترجمانی اور تشریح وتفسیر کا کام ابھی ابتدائی مراحل میں بھی داخل نہیں ہوا ہے۔ جس کے اسباب پر یہاں بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔ تاہم اتنا کہے بغیر آگے نہیں بڑھا جاسکتا کہ اردو زبان جس معاشرے میں پروان چڑھی ہے اس میں دینیاتی مباحث کی سطح کچھ ایسی ہی رہی ہے کہ بلند تر سطح کے عرفانی مباحث پروان نہیں چڑھ سکے۔ عام طور پر لوگوں میں دعا کی حقیقت کا شعور تعویذ گنڈوں اور جھاڑ پھونک سے زیادہ نہیں ہے، جبکہ حقیقت دعا کچھ اور ہی ہے۔

مقامِ شکر ہے کہ برادرِ عزیز علامۂ وحید سید عقیل الغروی سلمہ اللہ تعالیٰ کے قلم سے ''تجلیات'' شرح دعائے سمات کے بعد، جس کا اختصار ایجاز کے اعتراض سے نہیں بچ سکتا، اب یہ قدرے مفصل شرحِ دعائے افتتاح سامنے آرہی ہے، اس تصنیف کی نوعیت تجلیات سے بہت مختلف ہے۔

کہنے کو تو یہ ایک دعا کی شرح ہے۔ لیکن دعا کے فقروں کی ترجمانی کے ضمن میں جتنے عناوینِ بحث اور جس قدر مطالب کو شارح نے سمیٹ لیا ہے اس کے دیکھنے سے شارح اور کتاب دونوں کی جامعیت اور کمال پر استعجاب اور مسرت کے ساتھ ہم ربِ اکبر کا شکر ادا کرتے ہیں کہ بحمد اللہ اردو میں بھی کوئی ایسی کتاب سامنے آگئی جس میں عرفانی مباحث کی سطح اس بلندی پر نظر آتی ہے کہ شاید و باید! یہ کتاب اصول وفلسفۂ دین اور تاریخ دین سے متعلق اُمّہاتِ مسائل کا احاطہ کرتی ہے۔ بیشتر مباحث اور مسائل میں فلسفہ، کلام اور عرفان تینوں زاویہ ہائے نظر سے گفتگو کی گئی

ہے اور مختصر ترین عبارتوں میں وسیع الذیل مطالب کو سمونے کی کوشش تو مصنف کی اہم ترین خصوصیت ہے۔ تاریخ کے مباحث جس اختصار، احتیاط اور حقائق پر اقتصار کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں وہ بھی اردو زبان میں بے سابقہ اور بہت قابلِ غور ہے۔ اس کتاب کی زبان اردو میں فلسفیانہ نثر کی بہترین مثال ہے۔ یقیناً جو لوگ بالیدہ ادبی ذوق سے سرشار ہیں وہ اس کتاب کی تخلیقی اور فلسفیانہ نثر سے کما حقہ محظوظ ہوسکیں گے۔

اس کتاب کے بارے میں اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جس اسلوب میں یہ سامنے آرہی ہے حقیقۃً یہی مصنف کا مخصوص اسلوبِ تدریس ہے۔ جن طلبہ نے ان کی مجلس درس سے کچھ بھی استفادہ کیا ہے وہ بخوبی واقف ہیں کہ اُن کے تقاریرِ درس میں بات الفاظ اور معانی کی تحقیق وتحلیل سے شروع ہوتی ہے اور بات ہی بات میں ادبی اور منطقی حوالوں سے گزرتی ہوئی انتہائی دقیق فکری، فلسفیانہ اور عرفانی مباحث تک پہنچ جاتی ہے۔

اس پیش کش میں بہت سے مقامات پر لفظی اور نحوی وصرفی مباحث کو حذف کردیا گیا ہے اگرچہ پھر بھی کہیں کہیں پر یہ بحثیں باقی بھی رہ گئی ہیں۔ اسی طرح صفحات کی محدودیت کے پیشِ نظر کچھ اور مباحث بھی شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، ضرورت محسوس ہوئی تو آئندہ ایڈیشن میں شامل کرلیے جائیں گے۔

مکتبۂ کائنات جناب ڈاکٹر سید رضوان کاظمی اور جناب سید امیر عباس زیدی صاحبان کا ممنون ہے جنہوں نے اِس کتاب کی اشاعت کا بارگراں اٹھا کر ثوابِ عظیم حاصل کرنے کی سعیِ مشکور فرمائی ہے، ہم ان کے لیے ازدیادِ توفیق کی دعا کرتے ہیں اور ان کے بزرگوں کے لیے جوارِ رحمت میں بلند سے بلند تر مقامات کے خواہاں ہیں!

دعا گو

سید ذوالقدر رضوی عفی عنہ

حرفِ تقدیم

از رشحاتِ قلم حضرت استاذ الاساتذہ آیتِ عشق وعرفان

مولانا المولوی السید محمد شاکر النقوی الامروہوی

استاذ الٰہیات جامعۂ مشارع الشرائع

معروف بہ جامعۂ ناظمیہ

حوزۂ علمیہ، لکھنؤ، ہند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دُعا

دعا کیا ہے؟ دنیا کی ہر قوم جانتی ہے اور مانگتی ہے اور مذہب اس کا مبلغ ہے اور اس پر کاربند ہے کیونکہ دعا مذہب کا اساسی و بنیادی عنصر ہے۔ البتہ وہ چند گنے چنے افراد جن کو دُنیا ہی کی خبر نہ ہو دعا سے ناواقف ہو سکتے ہیں ورنہ دعا کا نام تو وہ لوگ بھی جانتے ہیں جو دعا سے ناخوش ہیں یا دعا پر یقین نہیں رکھتے۔

زیرِ نظر کوشش انہیں روٹھے ہوئے لوگوں کو گلے لگانے کے لیے تبلیغی منصوبوں کا ایک حصہ ہے۔ مقصد فقط یہ ہے کہ دعا کی عظیم برکتوں اور حتمی فائدوں سے کوئی محروم نہ رہ جائے کیونکہ دعا نہ صرف انسانیت بلکہ خود انسان کے لیے ایک ضروری سہارا ہے۔ کبھی اس دعوے کا شمار بھی ان بے شمار دعووں میں تھا جن کا ثبوت بس دلیل کا رہین منت رہا کرتا تھا اور اب انکشافات کے طفیل نا قابل یقین دعوے بھی عام معلومات کی فہرست میں گنے جانے لگے، آج موجودات عالم کا اجمالی اثاثہ بھی تفصیلات سے روشناس کیا جانے لگا، ایک وقت تھا جب وجود اور موجود کی بحث بہت اہم اور فہم و ادراک سے بالاتر سمجھی جاتی تھی، واجب الوجود کا یقین ایک کٹھن بات تھی، فلاسفہ کے درمیان معرکے تھے، کسی کا خیال تھا کہ موجود ہی خود وجود ہے، کسی کا کہنا تھا کہ موجود سے ہٹ کر خود وجود کی اپنی ایک حیثیت علیحدہ ہے، اس حیثیت کی ایک شان ہے جو بالکل جداگانہ ہے، کوئی موجود اس سے رشتہ قائم رکھے بغیر موجود ہی نہیں کہا جاسکتا، آج یہ سارے دعوے قیاس واستقراء کی قید و بند سے

آزاد ہو کر تمثیلی سطح پر حل ہو چکے، آج موبائل کے طوفانی استعمال نے عوام کو بھی اس بات کے سمجھنے کی پوری سہولت فراہم کر دی کہ اس عالم میں کچھ مسلمات ایسے بھی ہیں جو حواس خمسہ ظاہری کی گرفت سے بالکل باہر ہیں، کہیں سے کہیں تک نظر نہیں آتے، کسی حس ظاہری کو ذرا محسوس نہیں ہو پاتے، مگر پھر بھی عقل اُن کے آفاقی وجود کو اصولاً واجب جانتی ہے اور ان سے رشتہ قائم رکھنا اپنی کاروباری زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری سمجھتی ہے۔ یہ سارے مسلمات گویا ہماری مادّی عقل کے اَن دیکھے واجب الوجود ہیں جن سے روابط پیدا کرنا ہمارے اکثر مشکلات کا واحد حل مانا جا چکا ہے۔ بر سبیلِ تمثیل یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سارے موبائل تمام ٹیلی ویژن سٹ، کمپیوٹر تکنیک، انٹرنیٹ سسٹم اور مصنوعی سیاروں یا ماہواروں سے زمین کی بہت سی اشیا اور بہت سے امور کو کنٹرول کرنے کے اصول، زندہ ثبوت ہیں کہ ہمارا یہ پورا مادّی نظام چند معین کردہ علاماتی اشاروں سے ہماری حسبِ ضرورت و ارادۂ انسانی مربوط ہو کر ہماری مشکلات کا حل بن جاتا ہے، اس ارتباط کا دائرۂ عمل کتنا وسیع اور پھیلا ہوا ہے اس کی.... وسعت مادّی پیمانوں کے حدود سے باہر روشنی کی رفتار کے سہارے نوری سالوں اور برسوں کے پیمانوں سے ناپی جاتی ہے۔ ہماری اِس نو دریافت ریڈیائی دینا کے اِن اندیکھے مسلمات کا وجود بلاشبہ ایک روحانی نظام کی حیرت ناک پیچیدگیوں کی بھرپور تائید کرتا ہے، چنانچہ دعا اس روحانی نظام کا ایک موبائل سسٹم ہے جو ہمارے انسانی مشکلات کا واحد حل ہے۔

دعا کے فلسفہ کی پُر پیچ وادیوں میں الجھ کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھانے کے

بجائے خود دعا سے ہاتھ اٹھا لینے والے حضرات ہماری نظر میں ان جھکّی قسم کے افراد سے کم نہیں ہیں جو موبائل پر بات شروع کرنے سے پہلے اس کا سسٹم سمجھنے کے چکر میں موبائل کا استعمال ہی ٹھکرا دیں یا اتفاقاً کسی تکنیکی خرابی کی وجہ سے سسٹم کو برا بھلا کہنے لگیں یا خود کارڈ رکھنا بھول جائیں یا غلط الٹے سیدھے نمبر ملانا شروع کر دیں اور موبائل سسٹم کو غلط دھوکا فریب جیسی لفظوں سے نوازنا شروع کر دیں، ایسے تنگ مزاج تحقیق پسند ہٹی طبیعت والے افراد کو ان کی شکایات، ان کے شکوک دور کرتے ہوئے اکثر دعاؤں کے نہ قبول ہونے یا تاخیر سے قبول ہونے کے اسباب بتاتے ہوئے دعاؤں سے مانوس کرنا اور دعا مانگنے پر راضی کر لینا آسان کام نہیں۔ دعا کا فلسفہ اس کی تنقیح کتنے علوم سے وابستہ ہے اس سطح پر کسی کم علم کے ہاتھوں دعا کی وضاحت ممکن نہیں، خود دعا کی چاشنی سے نابلد دعا کے لیے زبان ہی نہیں کھول سکتا۔

زیرِ نظر یہ بیش بہا بلکہ بے بہا کارنامہ بلکہ شاہکار خود اپنی جلالت وعظمت کی بلندیوں پر جس قدر روشنی ڈال رہا ہے خود بخود قہری ولازمی طور پر مصنف علاّم کی علوم مرتبت کا بھی عکاس ہے۔

میرا دعویٰ ہے کہ اگر کتاب سے جناب مصنف علاّم کا اسم گرامی حذف کر کے کتاب کسی باذوق اور قدرداں کو تھما دی جائے تو وہ جب تک جناب مصنف علاّم کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا چین سے بیٹھ نہیں سکتا، کیوں نہ ہو یہ موضوع ہی ایسا ہے کہ جس کے لیے آیت اللّٰہی فکر حجۃ الاسلامی طریق استدلال محققانہ اسلوب ادا کے بغیر ایک قدم آگے بڑھانا مشکل ہے، لائق مبارکباد ہیں

ہمارے تازہ دم مفکر بھرپور محقق، دریائے معرفت کے شناور، فکر و آگہی کے میدان کے شہسوار جواں سال عبقری حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ عقیل الغروی دام فضلہ جنہوں نے ان بگڑے مزاج ناقدینِ دعا کو اپنی حیرتناک فکر اور دلچسپ طریق استدلال سے یہ بات سمجھا دی کہ دعا کا فلسفہ ضرور سمجھیے لیکن جب تک سمجھ میں نہ آئے اس عرصہ میں دعاؤں کے فیوض سے محروم نہ رہیے، کیونکہ کنارہ کشی عقلمندی نہیں ہے، حقیقتۃً حضرت علامہ کا یہ کارنامہ معمولی نہیں ہے کیونکہ دعا کے موجیں مارتے اتھاہ سمندر کی غواصی کے تقاضے اور ہیں اور نامانوس ذہنوں کو دعا سے مانوس کر لینے کے تقاضے اور ہیں۔ بیک وقت دونوں کا حق ادا کر دینا بہت بڑی بات ہے، کیوں نہ ہو قابلیت پھر قابلیت ہے جو عصبیت کی گرم بازاری میں بھی اپنا لوہا منوا لیتی ہے۔ میری بارگاہِ احدیت میں دعا ہے کہ معبودِ حقیقی مصنف علّام کو بلندیوں کی ان حدود تک پہونچا دے جہاں طائرِ خیال کی رسائی بھی مشکل ہو۔ آمین!

سید محمد شاکر امرہوی
ممتاز الافاضل
مدرس جامعہ ناظمیہ لکھنؤ
۱۱ر جنوری ۲۰۰۴ء

تمہید

دعا ایک بیانیہ تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور ایک ناقابل بیان کیفیت بھی! بلکہ یہ پوری کائنات اسی ایک کیفیت پر قائم ہے۔ ابن سینا نے بود و بقائے کائنات کا سبب عشق کو قرار دیا ہے، عُرَفا نے بھی عشق کی جوہریت اور ''حرکتِ حُبّی'' کا انکشاف کیا ہے۔ عصر حاضر میں، طبیعیات کی عام زبان میں بھی، نظمِ کائنات کے جاری و ساری قوانین میں سب سے اہم اور اساسی قانون کو ایک طرح کی ''کشش'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دعا اسی عشق کا ترانہ، اسی حرکتِ حُبی کی حدی خوانی اور اسی کشش کا لفظی و معنوی آہنگ ہے!

عالمِ ممکنات کا ''فقر'' یا ''حقیقتِ امکان'' ہی حرفِ دعا کا اصلی سرچشمہ ہے۔ یہ دَقیق لیکن درخشاں نکتہ اپنی جگہ پر بے حد غور طلب ہے۔ لیکن اس کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اس وقت صرف اس قدر اشارہ مقصود ہے کہ پوری کائنات کی زبانِ حال دعا ہی ہے! یہ دعا کا ایک بڑا فلسفیانہ پہلو بھی ہے۔

ممکنات کی اسی فلسفیانہ حقیقت یا ''وجودی کیفیت'' کی بہترین ادبی تعبیریں، اہل اللہ کی دعاؤں اور مناجاتوں کی صورت میں، انسانی ادب کے نفیس ترین سرمایہ کی تشکیل کرتی ہیں۔

ہر ہر لمحۂ امکان اور ہر ہر ذرۂ ممکن کی صوت و صدا، فریاد و فغاں، یا تسبیح و دعا کو سُن سکنا اور سمجھ پانا تو ہمارے امکان میں نہیں ہے۔ لیکن انسان اور انسانی معاشرے کی ''عرضِ حال'' پر مشتمل بعض بہترین اور مستند ترین دعائیں ہماری دسترس میں ضرور ہیں۔ ''دعائے افتتاح'' اپنے طرزِ بیان، معانی اور مطالب کے لحاظ سے ایسی ہی ایک مہتم بالشان دعا ہے۔ جو آج ہمارے درس و بحث کا موضوع ہے۔

یہ دعا ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے مروی دوسری دعاؤں سے کئی حیثیتوں سے ممتاز ہے۔

اولاً: اس کا اسلوب دوسری تمام دعاؤں سے منفرد ہے۔ اس ضمن میں کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے یہ چار دعائیں ہر لحاظ سے دوسری تمام دعاؤں کے بالمقابل جداگانہ شان رکھتی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک دعا اپنی جگہ پر بھی انتہائی منفرد ادبی اور معنوی خصوصیات اور آثار کی حامل ہے۔

۱- دعائے صباح ، ۲- دعائے افتتاح ۳- دعائے کمیل اور ۴- دعائے سمات۔

دعائے عرفہ اور دعائے جوشن کبیر کی عظمتیں اور ان کے آثار کی دنیائیں الگ ہیں!

ثانیاً : اس دعا کا مضمون گویا ''دہر آشوب'' ہے! یہ محض ایک فرد کی دعا نہیں بلکہ پوری ملت یا پورے معاشرۂ انسانی کی فریاد اور ہر ایک کے ایک ایک درد کی ترجمان ہے!

ثالثاً: جس طرح ہمارے بعض اکابرین نے حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السلام سے مروی ''دعائے عرفہ'' اور حضرت امام علی نقی علیہ السلام سے مأثور ''زیارتِ جامعہ'' کے بارے میں فرمایا ہے کہ دعائے عرفہ ایک مکمل دَورۂ خداشناسی ہے اور زیارتِ جامعہ ایک مکمل دورۂ امام شناسی ہے میری ناچیز رائے میں ''دعائے افتتاح'' اپنے مثالی ایجاز واختصار کے باوجود توحید وخداشناسی سے لے کر آخرت ومعادشناسی تک ایک مکمل دورۂ دین شناسی ہے۔ وہ بھی فراز ہائے عرفانی کے ساتھ ساتھ وسعت وعمقِ حیاتِ انسانی تک اور زندگی کے روحانی اقدار کے ساتھ ساتھ معاشرتی اوضاع واحوال تک، اہم ترین پہلوؤں کی جامع ہے۔ اسی لیے اِس عاجز کا خیال ہے کہ اگر اِس دعائے مبارکہ کے تمام کلمات اور اُن میں سموئے ہوئے مضامین کی مفصل شرح لکھی جائے تو ایک مکمل دائرۃ المعارف تالیف کی جاسکتی ہے۔

''دورہ'' کا لفظ حوزۂ علمیہ نجف وقم کے روزمرہ میں شامل ہے۔ اردو میں کہنا چاہیے کہ دعائے عرفہ خداشناسی کا ایک پورا نصاب ہے___ اسی طرح زیارتِ جامعہ ایک پورا نصاب ہے امام شناسی کا۔

متن وترجمہ

اَللّٰهُمَّ

اِنِّي اَفْتَتِحُ الثَّناءَ بِحَمْدِكَ

وَأَنْتَ مُسَدِّدٌ لِلصَّوابِ بِمَنِّكَ

وَاَيْقَنْتُ اَنَّكَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِيْنَ فِي مَوْضِعِ العَفْوِ وَالرَّحْمَةِ

وَأَشَدُّ المُعاقِبِيْنَ فِي مَوْضِعِ النَّكالِ وَالنَّقِمَةِ

وَأَعْظَمُ المُتَجَبِّرِينَ فِي مَوْضِعِ الكِبْرِياءِ وَالعَظَمَةِ

اَللّٰهُمَّ

اَذِنْتَ لِي فِي دُعائِكَ وَمَسْأَلَتِكَ

فَاسْمَعْ يا سَمِيْعُ مِدْحَتِي

وَاَجِبْ يا رَحِيْمُ دَعْوَتِي

وَاَقِلْ يا غَفُوْرُ عَثْرَتِي

فَكَمْ يا اِلٰهِي مِنْ كُرْبَةٍ قَدْ فَرَّجْتَها

وَهُمُومٍ قَدْ كَشَفْتَها

وَعَثْرَةٍ قَدْ اَقَلْتَها

وَرَحْمَةٍ قَدْ نَشَرْتَها

وَحَلْقَةِ بَلاءٍ قَدْ فَكَكْتَها

اَلحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي

لَمْ يَتَّخِذْ صاحِبَةً وَلا وَلَدًا

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيْكٌ فِي المُلْكِ

اَے معبود!

میں آغاز کررہاہوں اس عرضِ نیاز کا تیری حمد سے

اورتُو ہی اپنے کرم سے کامیابی بخشنے والا ہے

جبکہ مجھے یقین ہے کہ بخشش اورمہربانی کے موقع پرتو ہی تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

اورسزا وسرزنش کے موقع پرتو ہی تمام سزادینے والوں سے زیادہ سخت ہے

اوربزرگی کے موقع پرتو ہی تمام بزرگواروں سے بزرگ تر ہے

اَے مَعبود!

تُو نے مجھے پکارنے اورمانگنے کی اجازت دی ہے

تو اَے سُننے والے میری حمد سَماعت فرما

اوراَے ہمیشہ رحم کرنے والے میری طلب پوری کر

اوراَے درگزرکرنے والے میری خطا سے درگزرفرما!

نہ جانے کتنے دکھوں کواَے معبود تجھی نے دورکیا

اورنہ جانے کتنے رنج تجھی نے مٹائے ہیں

اورنہ جانے کتنی خطائیں تجھی نے درگزرفرمائی ہیں

اورنہ جانے کتنی رحمتیں تجھی نے سایہ فگن کی ہیں

اورنہ جانے کتنی بلاؤں کے پھندے تجھی نے کھولے ہیں

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے

جس نے نہ کوئی بیوی اختیار کی نہ کوئی بیٹا

اورنہ کوئی اس کی پادشاہی میں شریک ہے

وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ

وَكَبِّرْهُ تَكْبِيراً

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بِجَمِيعِ مَحَامِدِهِ كُلِّهَا

عَلٰى جَمِيعِ نِعَمِهِ كُلِّهَا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي

لَا مُضَادَّ لَهُ فِي مُلْكِهِ

وَلَا مُنَازِعَ لَهُ فِي اَمْرِهِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَا شَرِيكَ لَهُ فِي خَلْقِهِ

وَلَا شَبِيهَ لَهُ فِي عَظَمَتِهِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْفَاشِي فِي الْخَلْقِ اَمْرُهُ وَحَمْدُهُ

الظَّاهِرِ بِالْكَرَمِ مَجْدُهُ

الْبَاسِطِ بِالْجُودِ يَدَهُ

الَّذِي لَا تَنْقُصُ خَزَائِنُهُ

وَلَا تَزِيدُهُ كَثْرَةُ الْعَطَاءِ

اِلَّا جُوداً وَكَرَماً

اِنَّهُ هُوَ الْعَزِيزُ الْوَهَّابُ

اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَسْأَلُكَ قَلِيلاً مِنْ كَثِيرٍ

مَعَ حَاجَةٍ بِي اِلَيْهِ عَظِيمَةٍ وَغِنَاكَ عَنْهُ قَدِيمٌ

وَهُوَ عِنْدِي كَثِيرٌ

وَهُوَ عَلَيْكَ سَهْلٌ يَسِيرٌ

اور نہ کوئی فرومایگی میں اس کا سرپرست

(اے بڑائی کرنے والو!) بڑائی کرو اسی کی جیسی اس کی بڑائی کرنی چاہیے

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے اس کے تمام کے تمام اوصاف حمیدہ کے ساتھ

اس کی تمام کی تمام نعمتوں پر!

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے

نہ جس کی بادشاہی میں کوئی اس کی مخالفت کرنے والا ہے

اور نہ اس کے نظام میں کوئی اس سے جھگڑنے والا ہے

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے، جس کی کارگاہِ خلقت میں کوئی شریک نہیں ہے

اور نہ اس کی عظمت میں کوئی اس کا مثل ونظیر ہے

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے، جس کا حکم اور جس کی حمد تمام خلقت میں آشکارا ہے

جس کی بزرگی اس کے کرم سے ہویدا ہے

اور جس نے فیاضی کے لیے اپنے ہاتھ کھول رکھے ہیں

جس کے خزانے میں کمی نہیں ہوتی

اور داد ودہش کی زیادتی سے اس کے یہاں کوئی اضافہ نہیں ہوتا

سوائے فیاضی اور کرم گستری کے

وہی ہے بس وہی قدرتمند اور داتا

اے معبود! میں سوال کررہا ہوں تجھ سے! بہت زیادہ میں سے بہت کم کا

جبکہ مجھے اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور تو اس سے ہمیشہ سے بے نیاز ہے

اور وہی ''کم'' میرے لیے بہت زیادہ ہے

جبکہ (اس کا عطا کرنا) تیرے لیے بہت آسان اور معمولی کام ہے!!

اَللّٰهُمَّ

اِنَّ عَفْوَکَ عَنْ ذَنْبِي

وَتَجَاوُزَکَ عَنْ خَطِيئَتِي

وَصَفْحَکَ عَنْ ظُلْمِي

وَسِتْرَکَ عَلٰى قَبِيحِ عَمَلِي

وَحِلْمَکَ عَنْ كَثِيرِ جُرْمِي

عِنْدَمَا كَانَ مِنْ خَطَاءِ ي وَعَمْدِي

اَطْمَعَنِي

فِي اَنْ اَسْاَلَکَ مَالَا اَسْتَوْجِبُهُ مِنْکَ

اَلَّذِي رَزَقْتَنِي مِنْ رَحْمَتِکَ وَاَرَيْتَنِي مِنْ قُدْرَتِکَ

وَعَرَّفْتَنِي مِنْ اِجَابَتِکَ

فَصِرْتُ اَدْعُوکَ آمِنًا

وَاَسْاَلُکَ مُسْتَاْنِساً لَاخَائِفاً وَلَاوَجِلاً

مُدِلًّا عَلَيْکَ فِيْمَا قَصَدْتُ فِيْهِ اِلَيْکَ

فَاِنْ اَبْطَاَ عَنِّي عَتِبْتُ بِجَهْلِي عَلَيْکَ

وَلَعَلَّ الَّذِي اَبْطَاَ عَنِّي هُوَ خَيْرٌ لِي

لِعِلْمِکَ بِعَاقِبَةِ الْاُمُورِ

فَلَمْ اَرَ مَوْلًى كَرِيماً

اَصْبَرَ عَلٰى عَبْدٍ لَئِيمٍ مِنْکَ عَلَيَّ

اے معبود!

تیرا میرے گناہ کو معاف کر دینا

تیرا میری خطا سے درگزر کر جانا

تیرا میری زیادتی سے چشم پوشی کر لینا

تیرا میرے کرتوت کو چھپا دینا

اور میرے بیشمار جرائم پر بردباری اختیار کرنا

جبکہ یہ جرائم میری صریح غلطی سے اور دیدہ و دانستہ سرزد ہوئے

مجھے لالچ دلا رہا ہے

کہ میں تجھ سے وہ سوال کروں جس کا میں تیری طرف سے مستحق نہیں ہوں

اور جو تو نے اپنی رحمت سے مجھے عطا فرمایا اور اپنی قدرت سے مجھے دکھایا

اور اپنی قبولیت سے مجھے آگاہ کیا

تو میں (اپنے اس قدر گناہوں کے باوجود، مستحق سزا ہونے کے باوجو) تجھے چین سے پکار رہا ہوں

اور تیرا آشنا بن کر تجھ سے سوال کر رہا ہوں! نہ ڈر رہا ہوں نہ جھجک رہا ہوں

بلکہ تیرے سامنے اپنی مقصد براری کے لیے ضد کر رہا ہوں

مراد ملنے میں دیر ہوتی ہے تو اپنی جہالت سے تجھ سے ناراض ہوتا ہوں

جبکہ جو مراد مجھے نہیں ملی ہے وہ میرے لیے بہتر ہے

کیونکہ تجھے تمام باتوں کے انجام کی آگہی ہے!

میں نے تو تیرے جیسا کرم فرما آقا کوئی نہیں دیکھا

جو میرے جیسے ذلیل بندے کو برداشت کرے!

يَارَبِّ

اِنَّکَ تَدْعُوْنِي فَاُوَلِّي عَنْکَ

وَتَتَحَبَّبُ اِلَيَّ فَاَتَبَغَّضُ اِلَيْکَ

وَتَتَوَدَّدُ اِلَيَّ فَلاَ اَقْبَلُ مِنْکَ

کَاَنَّ لِيَ التَّطَوُّلَ عَلَيْکَ

فَلَمْ يَمْنَعْکَ ذٰلِکَ مِنَ الرَّحْمَةِ لِي وَالْاِحْسَانِ اِلَيَّ وَالتَّفَضُّلِ عَلَيَّ

بِجُوْدِکَ وَکَرَمِکَ

فَارْحَمْ عَبْدَکَ الْجَاهِلَ

وَجُدْ عَلَيْهِ بِفَضْلِ اِحْسَانِکَ

اِنَّکَ جَوَادٌ کَرِيْمٌ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ مَالِکِ الْمُلْکِ

مُجْرِي الْفُلْکِ

مُسَخِّرِ الرِّيَاحِ

فَالِقِ الْاِصْبَاحِ

دَيَّانِ الدِّيْنِ

رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ

عَلٰى عِلْمِهٖ بَعْدَ حِلْمِهٖ

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ

عَلٰى عَفْوِهٖ بَعْدَ قُدْرَتِهٖ

اے پالنے والے!

تو مجھے بلاتا ہے اور میں تیری طرف سے روگردانی کرتا ہوں

تو مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں

تو مجھ پر مہربانیاں فرماتا ہے اور میں قبول نہیں کرتا

جیسے میرا تجھ پر کوئی احسان ہو

تب بھی تیری فیاضی اور کرم گستری تجھ کو مجھ پر رحمت کرنے، احسان فرمانے اور مہربانیوں سے روکتی نہیں

بس اپنے اس جاہل بندے پر احسان فرما

اور اپنے احسان سے اس پر فیاضی کر

یقیناً تو ہی فیاض اور کرم گستر ہے!

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے جو تمام مُلکِ ہستی کا بادشاہ ہے

(بے کراں، پُر تلاطم اور گہرے سمندروں میں) کشتیوں کا چلانے والا ہے

ہواؤں کو زنجیر پہنانے والا ہے

صبح کو نمودار کرنے والا ہے

روزِ جزا بھرپور جزائیں دینے والا ہے

تمام جہانوں کا پالنے والا ہے!

تمام حمد ہے اسی معبود کی

کہ وہ (اپنے بندوں کی نافرمانیاں) جانتے ہوئے بھی بردبار ہے

تمام حمد ہے اسی معبود کی

جو (انتقام و سرزنش کی) قدرت رکھتے ہوئے معاف کرتا ہے

ٱلْحَمْدُ لِلّٰهِ

عَلیٰ طُوْلِ أَنَاتِهِ فِي غَضَبِهِ

وَهُوَ قَادِرٌ عَلیٰ مَا يُرِيدُ!

ٱلْحَمْدُ لِلّٰهِ

خَالِقِ الْخَلْقِ بَاسِطِ الرِّزْقِ

فَالِقِ الْإِصْبَاحِ

ذِي الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

وَالْفَضْلِ وَالْإِنْعَامِ

اَلَّذِي بَعُدَ فَلَا يُرٰى

وَقَرُبَ فَشَهِدَ النَّجْوٰى

تَبَارَكَ وَ تَعَالٰى

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَيْسَ لَهُ مُنَازِعٌ يُعَادِلُهُ

وَلَا شَبِيْهٌ يُشَاكِلُهُ وَلَا ظَهِيْرٌ يُعَاضِدُهُ

قَهَرَ بِعِزَّتِهِ الْأَعِزَّاءَ

وَتَوَاضَعَ لِعَظَمَتِهِ الْعُظَمَاءُ

فَبَلَغَ بِقُدْرَتِهِ مَا يَشَاءُ

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يُجِيْبُنِي حِيْنَ أُنَادِيْهِ

وَيَسْتُرُ عَلَيَّ كُلَّ عَوْرَةٍ وَأَنَا أَعْصِيْهِ

وَيُعَظِّمُ النِّعْمَةَ عَلَيَّ فَلَا أُجَازِيْهِ

فَكَمْ مِنْ مَوْهِبَةٍ هَنِيْئَةٍ قَدْ أَعْطَانِي

تمام حمد ہے اسی معبود کے لیے

جو بہت دیر میں غضب فرماتا ہے

جبکہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے

تمام حمد ہے اسی معبود کے لیے

جو تمام خلقت کا پیدا کرنے والا ہے، روزی رساں ہے

سویرے کا نور کاڑھنے والا ہے

بزرگ ہے اور بزرگی عطا کرنے والا ہے

پرفیض ہے اور نعمتیں بانٹنے والا ہے

جس نے ایسی دوری اختیار کی ہے کہ نظر نہیں آتا

اور جو ایسا نزدیک ہے کہ سرگوشیاں بھی سنتا ہے

بابرکت ہے اور بلند ہے

تمام حمد ہے اسی معبود کی جس کے برابر کا اس سے کوئی جھگڑنے والا نہیں ہے

نہ کوئی اس کا جیسا اُس کا مثل و نظیر ہے نہ اس کو سہارا دینے والا کوئی پشت پناہ!

اس نے اپنی شان سے تمام عزیزانِ دہر کو زیر کیا

اور تمام بزرگانِ دہر نے اس کی بزرگی کے سامنے فروتنی اختیار کی

اور اس نے اپنی قدرت سے جو چاہا کیا!

حمد ہے اس معبود کی! جسے میں پکارتا ہوں تو وہ میرا جواب دیتا ہے

اور میری ہر برائی کو چھپاتا ہے جبکہ میں اس کی نافرمانی کرتا ہوں

اور مجھ پر نعمتوں کی فراوانی کرتا ہے جبکہ میں اس کا صلہ نہیں دیتا

نہ جانے کتنی خوشگوار نعمتیں اس نے مجھے عطا کیں ہیں

وَعَظِيمَةٍ مَخُوفَةٍ قَدْ كَفانِي

وَبَهْجَةٍ مُونِقَةٍ قَدْ أَرانِي

فَاُثْني عَلَيْهِ حامِداً

وَاَذْكُرُهُ مُسَبِّحاً

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ

لَايُهْتَکُ حِجابُهُ وَلَايُغْلَقُ بابُهُ

وَلَايُرَدُّ سائِلُهُ

وَلَايُخَيَّبُ آمِلُهُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يُؤْمِنُ الْخائِفِينَ

وَيُنَجِّي الصَّالِحِينَ

وَيَرْفَعُ الْمُسْتَضْعَفِينَ

وَيَضَعُ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ

وَيُهْلِکُ مُلُوکاًوَيَسْتَخْلِفُ آخَرِيْنَ

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ قاصِمِ الْجَبَّارِينَ

مُبِيرِ الظَّالِمِينَ

مُدْرِکِ الْهارِبِينَ

نَكالِ الظَّالِمِينَ

صَرِيْخِ الْمُسْتَصْرِخِينَ

مَوْضِعِ حاجاتِ الطَّالِبِينَ

مُعْتَمَدِ الْمُؤْمِنِينَ

اور نہ جانے کتنے خوفناک مہلکوں میں اس نے مجھے بچایا

اور مجھے نرالی خوشیاں دکھائیں

بس میں شکرگزاری کرتے ہوئے اس کی نیکیاں دہراتا ہوں

اور تسبیح پڑھ کر اس کو یاد کرتا ہوں!

تمام تعریف اس معبود کی

جس کا نہ پردہ چاک ہوتا ہے نہ اس کا دروازہ بند ہوتا ہے

نہ اس کا سوالی پھیرا جاتا ہے

نہ اس سے امید لگانے والا مایوس ہوتا ہے

تمام تعریف اس معبود کی جو ڈرنے والوں کو پناہ دیتا ہے

نیکوکاروں کو نجات دیتا ہے

کمزور بنائے گئے لوگوں کو اٹھاتا ہے

بڑا بننے والوں کو زیر کرتا ہے

بادشاہوں کو ہلاک کرتا ہے اور ان کی جگہ دوسروں کو عطا کرتا ہے

تمام تعریف ہے اس اللہ کی جو جباروں کو توڑنے والا ہے

ظالموں کو ہلاک کرنے والا ہے

بھاگنے والوں کو پکڑنے والا ہے

ظلم کرنے والوں کی سزا ہے

فریاد کرنے والوں کی فریاد ہے

چاہنے والوں کی حاجتوں کا مرکز ہے!

ایمان داروں کا بھروسہ ہے!!

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي

مِنْ خَشْيَتِهِ تَرْعَدُ السَّماءُ وَ سُكّانُها

وَتَرْجُفُ الْاَرْضُ وَعُمّارُها

وَتَمُوْجُ الْبِحارُ وَمَنْ يَسْبَحُ فِي غَمَراتِها

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدٰانا لِهٰذَا

وَما كُنّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلاٰ اَنْ هَدٰانا اللّٰهُ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي

يَخْلُقُ وَلَمْ يُخْلَقْ

وَيَرْزُقُ وَلاٰيُرْزَقُ

وَيُطْعِمُ وَلاٰيُطْعَمُ

وَيُمِيْتُ الْأَحْياءَ وَيُحْيِي الْمَوْتىٰ

وَهُوَ حَيٌّ لاٰيَمُوْتُ

بِيَدِهِ الْخَيْرُ

وَهُوَ عَلىٰ كُلِّ شَيٍْ قَدِيْرٌ

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَرَسُوْلِکَ وَ اَمِيْنِکَ وَ صَفِيِّکَ وَ حَبِيْبِکَ وَخِيَرَتِکَ مِنْ خَلْقِکَ وَحافِظِ سِرِّکَ وَمُبَلِّغِ رِسالاٰتِکَ

اَفْضَلَ وَاَحْسَنَ وَاَجْمَلَ وَاَكْمَلَ

وَاَزْكىٰ وَ اَنْمىٰ

اَطْيَبَ وَاَطْهَرَ وَاَسْنىٰ

تمام حمد ہے اس معبود کی

جس کی ہیبت سے آسمان اور آسمانوں میں بسنے والے کانپتے ہیں

زمین اور اس پر زندگی بسر کرنے والے لرزتے ہیں

سمندروں اور اس کی گہرائیوں میں پیرنے والے لرزہ بجاں ہیں

تمام تعریفیں اسی معبود کی ہیں جس نے ہماری اِس تک رہنمائی فرمائی

جبکہ اگر معبود برحق رہنمائی نہ فرماتا تو ہم ہدایت پانے والے نہ تھے

حمد ہے اس معبود کی!

جو پیدا کرتا ہے خود پیدا نہیں کیا گیا!

جو رزق دیتا ہے اسے رزق نہیں دیا جاتا

جو کھلاتا ہے کھاتا نہیں،

جو زندوں کو مارتا ہے، اور مردوں کو جلاتا ہے

اور وہ خود ایسا زندہ ہے جسے موت نہیں،

اسی کے ہاتھ میں نیکی ہے

اور وہی ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے

اے معبود! رحمت فرما اپنے بندۂ خاص، اپنے پیمبر، اپنے امانت دار، اپنے برگزیدہ، اپنے چہیتے، اپنی تمام خلقت میں سب سے بہتر، اپنے راز دار اور اپنے پیغامات کے پہنچانے والے محمدؐ پر

سب سے بہتر، سب سے برتر، سب سے حسین، سب سے کامل

سب سے زیادہ نفیس، سب سے زیادہ پرفروغ،

سب سے زیادہ پرنکہت، سب سے زیادہ پاکیزہ اور سب سے بلند رحمت!

وَاَکْثَرَ ماصَلَّیْتَ وَبارَکْتَ وَ تَرَحَّمْتَ وَ تَحَنَّنْتَ وَ سَلَّمْتَ
عَلیٰ اَحَدٍ مِنْ عِبادِکَ وَاَنْبِیائِکَ وَرُسُلِکَ
وَصَفْوَتِکَ
وَاَهْلِ الْکَرامَةِ عَلَیْکَ مِنْ خَلْقِکَ

اَللّٰهُمَّ وَصَلِّ عَلیٰ عَلِيٍّ اَمِیرِ الْمُؤْمِنِینَ
وَوَصِيِّ رَسُوْلِ رَبِّ الْعالَمِینَ عَبْدِکَ وَوَلِیِّکَ
وَأَخِي رَسُوْلِکَ وَحُجَّتِکَ عَلیٰ خَلْقِکَ
وَآیَتِکَ الْکُبْریٰ وَالنَّبَأِ الْعَظِیمِ
وَصَلِّ عَلیٰ الصِّدِّیقَةِ الطّاهِرَةِ فاطِمَةَ سَیِّدَةِ نِساءِ الْعالَمِینَ
وَصَلِّ عَلیٰ سِبْطَيِ الرَّحْمَةِ وَاِمامَيِ الْهُدیٰ
الْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ سَیِّدَي شَبابِ أَهْلِ الْجَنَّةِ
وَصَلِّ عَلیٰ اَئِمَّةِ الْمُسْلِمِینَ
عَلِيِّ بْنِ الْحُسَینِ
وَمُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ
وَجَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ
وَمُوسَیٰ بْنِ جَعْفَرٍ
وَعَلِيِّ بْنِ مُوسَیٰ
وَمُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ
وَعَلِيِّ بْنِ مُحَمَّدٍ

اوراس سے بھی زیادہ! جوبھی رحمت، برکت، ہمدردی، محبت اور سلامتی
تونے اپنے بندوں، نبیوں اور رسولوں،
اپنے چنے ہوئے لوگوں،
اوراپنی تمام خلقت میں اپنے نزدیک ذی مرتبہ، ذی شرف لوگوں پر کی ہے، اس سے
بھی زیادہ!
اے معبود! رحمت فرما امیر المومنین،
وصی رسول، اپنے بندۂ خاص، اپنے ولی
اپنے رسول کے بھائی اوراپنی تمام خلقت پر اپنی ''حجت''،
اپنی بزرگ نشانی اور اپنے ''عظیم ترین پیغام'' علیؑ پر!
اوررحمت فرما ''صدیقۂ طاہرہ'' فاطمہؑ پر جوتمام جہانوں کی خواتین کی سردار ہیں!
اور ''سبطین رحمت'' اور رہنمایان ہدایت،
جوانان اہل جنت کے سرداروں، حسنؑ اور حسینؑ پر!
اوررحمت فرما تمام مسلمانوں کے پیشواؤں،

علی بن الحسین	(امام زین العابدین)	
محمد بن علی	(امام باقر)	(علیہ السلام)
جعفر بن محمد	(امام صادق)	(علیہ السلام)
موسیٰ بن جعفر	(امام کاظم)	(علیہ السلام)
علی بن موسیٰ	(امام رضا)	(علیہ السلام)
محمد بن علی	(امام تقی)	(علیہ السلام)
علی بن محمد	(امام نقی)	(علیہ السلام)

وَالْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍ

وَالْخَلَفِ الْهادِي الْمَهْدِيِّ

حُجَجِکَ عَلیٰ عِبادِکَ

وَاُمَنائِکَ فِي بِلادِکَ

صَلاةً "کَثِيرَةً" دائِمَةً

اَللّٰهُمَّ

وَصَلِّ عَلیٰ وَلِيِّ اَمْرِکَ الْقائِمِ الْمُؤَمَّلِ

وَالْعَدْلِ الْمُنْتَظَرِ

وَحُفَّهُ بِمَلائِکَتِکَ الْمُقَرَّبِينَ

وَاَيِّدْهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ يا رَبَّ الْعالَمِينَ

اَللّٰهُمَّ

اجْعَلْهُ الدّاعِيَ اِلیٰ کِتابِکَ

وَالْقائِمَ بِدِيْنِکَ

اِسْتَخْلِفْهُ فِي الْاَرْضِ

کَما اسْتَخْلَفْتَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِ

مَکِّنْ لَهُ دِيْنَهُ

الَّذِي ارْتَضَيْتَهُ لَهُ

اَبْدِلْهُ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِ اَمْناً

يَعْبُدُکَ وَلايُشْرِکُ بِکَ شَيْئاً

حسن بن علی (امام عسکری) (علیہ السلام)

اور فرزند ہادیِ مہدی (امام زمانہ، امام مہدیِ منتظرؑ) پر

جو تیرے بندوں پر تیری ''حجتیں''

اور تیرے شہروں میں تیرے امانت دار ہیں!

بہت زیادہ اور مدام رحمت!

اے معبود!

رحمت فرما اپنے ''ذمہ دارِ نظام'' پر (جو اس وقت اپنے منصب پر) قائم (کارفرما، حاجت روا) اور امید گاہِ خلائق ہیں!

وہی عادلِ زمانہ جن کا انتظار ہو رہا ہے!!

اور انہیں مقرب فرشتوں کی جھرمٹ میں رکھ

اور ''روح القدس'' کے ذریعہ ان کی تائید فرما! اے تمام جہانوں کے پروردگار!

اے معبود!

انہیں اپنی کتاب کی طرف بلانے والا،

اور اپنے دین کے ساتھ ''قیام'' کرنے والا قرار دے!

اور انہیں زمین پر اسی طرح خلافت عطا فرما!

جس طرح ان سے پہلے والوں کو عطا فرمائی،

اور ان کے لیے اسی دین کو مقتدر بنا دے

جس کو تو نے ان کے لئے پسند فرمایا ہے!

تو ان کے خوف کو امن سے بدل دے

کہ وہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں! اور کسی شے کو وہ تیرا شریک نہیں بناتے!!

اَللّٰھُمَّ

أَعِزَّهُ وَأَعْزِزْ بِهِ

وَانْصُرْهُ وَانْتَصِرْ بِهِ

وَانْصُرْهُ نَصْراً عَزِيْزاً

وَافْتَحْ لَهُ فَتْحاً يَسِيراً

وَاجْعَلْ لَهُ مِنْ لَدُنْکَ سُلْطَاناً نَصِيراً

اَللّٰھُمَّ

اَظْهِرْ بِهِ دِيْنَکَ وَسُنَّةَ نَبِيِّکَ حَتّٰى لَا يَسْتَخْفِيَ

بِشَيْئٍ مِنَ الْحَقِّ مَخَافَةَ اَحَدٍ مِنَ الْخَلْقِ

اَللّٰھُمَّ

اِنَّا نَرْغَبُ اِلَيْکَ فِي دَوْلَةٍ کَرِيْمَةٍ

تُعِزُّ بِهَا الْاِسْلَامَ وَأَهْلَهُ

وَتُذِلُّ بِهَا النِّفَاقَ وَ اَهْلَهُ

وَتَجْعَلُنَا فِيْهَا مِنَ الدُّعَاةِ اِلٰى طَاعَتِکَ وَالْقَادَةِ اِلٰى سَبِيْلِک

وَتَرْزُقُنَا بِهَا کَرَامَةَ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ

اَللّٰھُمَّ

مَا عَرَّفْتَنَا مِنَ الْحَقِّ فَحَمِّلْنَاهُ

وَمَا قَصُرْنَا عَنْهُ فَبَلِّغْنَاهُ

اے معبود!

ان کی عزت رکھ لے اور انہیں کے ذریعہ عزتیں عطا کر!

انہیں نصرت عطا فرما اور انہیں کے ذریعہ نصرتیں عطا کر!

اور انہیں ایسی نصرت عطا کر جو پرشکوہ ترین نصرت ہو!

اور انہیں ایسی فتح عطا کر جو سہل ترین فتح ہو!

اور ان کو اپنی جانب سے کامیاب ترین اقتدار عطا فرما!

اے معبود!

اپنے دین اور اپنے نبی کی سنت کو ان کے ذریعہ سے اس طرح ظاہر فرما کہ پھر خلق میں سے کسی کے خوف سے کوئی بھی شیٔ چھپانی نہ پڑے

اے معبود!

ہم تجھ سے وہ باشرف حکومت چاہتے ہیں

جس کے ذریعہ تو اسلام اور اہل اسلام کو عزت عطا فرمائے

اور جس کے ذریعہ تو نفاق اور اہل نفاق کو ذلیل کرے

اور جس (حکومت) میں تو ہمیں اپنی اطاعت کی طرف بلانے والوں میں اور اپنے راستے کی طرف رہنمائی کرنے والوں میں قرار دے

اور جس کے ذریعہ تو ہم کو دنیا و آخرت کی بزرگی عطا فرمائے!!

اے معبود!

جتنا حق تو نے ہمیں پہچنوایا ہے، اتنی سکت دے

اور جو ہم جاننے سے قاصر رہ گئے ہیں اس تک رسائی فرما!

اَللّٰهُمَّ

اَلْمُمْ بِهِ شَعْثَنَا

وَاشْعَبْ بِهِ صَدْعَنَا

وَارْتُقْ بِهِ فَتْقَنَا

وَكَثِّرْ بِهِ قِلَّتَنَا

وَأَعْزِزْ بِهِ ذِلَّتَنَا

وَأَغْنِ بِهِ عَائِلَنَا

وَاقْضِ بِهِ عَنْ مُغْرَمِنَا

وَاجْبُرْ بِهِ فَقْرَنَا

وَسُدَّ بِهِ خَلَّتَنَا

وَيَسِّرْ بِهِ عُسْرَنَا

وَأَنْجِحْ بِهِ طَلِبَتَنَا

وَأَنْجِزْبِهِ مَوَاعِيدَنَا

وَاسْتَجِبْ بِهِ دَعْوَتَنَا

وَأَعْطِنَابِهِ سُؤْلَنَا

وَبَلِّغْنَا بِهِ مِنَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ آمَالَنَا

وَأَعْطِنَابِهِ فَوْقَ رَغْبَتِنَا

يَاخَيْرَ الْمَسْئُولِينَ

وَأَوْسَعَ الْمُعْطِينَ

اشْفِ بِهِ صُدُورَنَا

اے معبود!

ان کے ذریعہ سے ہمیں ایک لڑی میں پرو دے!

ہماری بکھری ٹکڑیوں کو جمع کر دے

ہماری فرقت کو قربت سے بدل دے

انہیں کے ذریعہ سے ہماری کمی کو کثرت میں بدل دے

انہیں کے ذریعہ سے ہماری ذلت کو عزت سے بدل دے

انہیں کے ذریعہ سے ہمارے مفلسوں کو تونگر بنا دے

انہیں کے ذریعہ سے ہمارے قرضداروں کی ادئیگی فرما دے

انہیں کے ذریعہ سے ہماری ناداری کی تلافی کر دے

انہیں کے ذریعہ سے ہماری حاجتوں کو پورا کر دے

انہیں کے ذریعہ سے ہماری دشواریوں کو سہل بنا دے

انہیں کے ذریعہ سے ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب فرما

انہیں کے ذریعہ سے ہمارے وعدوں کی ایفا فرما

انہیں کے وسیلے سے ہماری دعاؤں کو قبول فرما

انہیں کے وسیلے سے ہمارے سوال پورے کر دے

انہیں کے وسیلے سے ہماری تمام دنیا و آخرت کی آرزوئیں برلا

اور ان کے طفیل میں ہمیں ہماری امید سے سوا دے

اے بہترین سوال پورا کرنے والے

اے سب سے زیادہ عطا کرنے والے

ان کے ذریعہ ہمارے سینوں کو سکون عطا فرما

وَأَذْهِبْ بِهِ غَيْظَ قُلُوْبِنا

وَاهْدِنابِهِ لِمَااخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ

اِنَّكَ تَهْدِي مَنْ تَشاءُ اِلىٰ صِراطٍ مُسْتَقِيمٍ

وَانْصُرْنا بِهِ عَلىٰ عَدُوِّكَ وَعَدُوِّنا

اِلٰهَ الْحَقِّ آمِينَ!

اَللّٰهُمَّ اِنّانَشْكُواِلَيْكَ فَقْدَنَبِيِّنا صَلَوٰتُكَ عَلَيْهِ وَ آلِهِ

وَغَيْبَةَ وَلِيِّنا

وَكَثْرَةَ عَدُوِّنا وَقِلَّةَ عَدَدِنا

وَشِدَّةَ الْفِتَنِ بِنا

وَتَظاهُرَ الزَّمانِ عَلَيْنا

فَصَلِّ عَلىٰ مُحَمَّدٍ وَ آلِهِ

وَاَعِنّاعَلىٰ ذٰلِكَ

بِفَتْحٍ مِنْكَ تُعَجِّلُهُ

وَبِضُرٍّ تَكْشِفُهُ

وَنَصْرٍ تُعِزُّهُ

وَسُلْطانِ حَقٍّ تُظْهِرُهُ

وَرَحْمَةٍ مِنْكَ تُجَلِّلُناها

وَعافِيَةٍ مِنْكَ تُلْبِسُناها

بِرَحْمَتِكَ يا أَرْحَمَ الرّاحِمِينَ!!

ہمارے دلوں کا دکھ دور کردے

اور اپنے اذن سے انہیں کے ذریعہ سے ہماری اس حق کی طرف رہنمائی فرما جس میں اختلاف ڈال دیا گیا

بیشک تو ہی جس کو چاہے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرماتا ہے

اور انہیں کے ذریعہ ہمیں اپنے اور ہمارے دشمن پر نصرت عطا فرما

اے حق کے معبود ہماری دعا قبول فرما

اے معبود! ہمیں تجھ سے اپنے نبی کی جدائی کا گلہ ہے

اور اپنے ولی (اپنے سرپرست، اپنے امام) کی ''غیبت'' کا

اور اپنے دشمنوں کی زیادتی کا اور اپنے افراد کی کمی کا

اور اپنی آزمائشوں کی سختی کا

اور زمانے بھر کے ستم کا

بس رحمت فرما محمدؐ اور ان کی آل پر

اور ہماری مدد فرما

اپنی طرف سے جلد کامیابی دے کر،

نقصان سے بچا کر،

نصرت کا اعزاز دے کر،

حق کے اقتدار کو قائم کر کے

ہمیں اپنی رحمتوں کے سایہ میں لے کر،

ہمیں اپنی جانب سے لباس عافیت پہنا کر،

تجھے قسم ہے تری رحمت کی! اے تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے!!

شرح وبیان

حسنِ استناد یا صحتِ سند

دعائے افتتاح کی اہمیت -سند و متن اور مضمون و معنی ہر لحاظ سے ممتاز اور قابل غور ہے۔

اگر چہ اس کی وہی ایک سند اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ائمہ دین و اولیائے معصومین علیہم السلام سے ماثور و منقول ادعیہ واذکار کے سب سے بڑے محقق اور اس عظیم الشان روحانی اور معنوی ادب کے محبّ اور ماہر علامہ سید ابن طاؤسؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''الاقبال'' میں درج فرمائی ہے۔لیکن یہی ایک سند اتنی معتبر ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور سند کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

علامہ ابن طاؤسؒ نے اعمال و ادعیۂ ماہِ مبارکِ رمضان کے باب میں ایک مستقل ''فصل''، قائم کرکے'' دعائے افتتاح'' کا ذکر اس طرح فرمایا ہے:

فَصْلٌ فِيمَا نَذْكُرُ مِنَ دُعَاءِ الِافْتِتَاحِ وَغَيْرِهِ مِنَ الدَّعَوَاتِ الَّتِي تَتَكَرَّرُ كل ليلة الىٰ آخر شهر الفلاح، فمن ذلک الدعاء الذی ذَكَرَهُ محمد بن ابی قره باسناده فقال حدثنی ابو الغنائم محمد بن محمدبن محمد بن عبدالله الحسنی قال اخبرنا ابو عمر محمد بن محمدبن نصرالسكونی رضی الله عنه قال سألت ابا بكر احمد بن محمد بن عثمان البغدادی رحمه الله ان يخرج الیَّ ادعية شهر رمضان التی كان عمه ابوجعفر محمد بن

عثمان بن السعید العمری رضی الله عنه وارضاه یدعو بها، فاخرج الیّ دفتراً مجلداً باحمر فنسخت منه ادعیة کثیرة وکان من جملتها: تدعو بهذا الدعاء فی کل لیلة من شهرِ رمضان فان الدعاءَ فی هذاالشهر تسمعه الملائکة وتستغفر لصاحبه، وتقول...“

ترجمہ

”یہ فصل دعائے افتتاح اور ان دوسری دعاؤں کے بیان میں ہے جو اس ماہ نجات ورستگاری میں ہر شب مکرر پڑھی جاتی ہیں، انہیں میں ایک دعا یہ ہے جسے محمد ابن ابی قرۃ نے اپنے اسناد سے ذکر کیا ہے، انہوں نے کہا کہ مجھ سے بیان کیا ابوالغنائم محمد بن محمد بن عبداللہ الحسنی نے، انہوں نے کہا کہ ہمیں اطلاع دی ابوعمرو محمد بن محمد بن نصر السکونی رضی اللہ عنہ نے، انہوں نے کہا کہ میں نے ابوبکر احمد بن محمد بن عثمانِ بغدادی رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ وہ ماہِ رمضان کی وہ دعائیں میرے سامنے لائیں جو ان کے چچا (حضرت) ابوجعفر محمد بن عثمان بن السعید العمری (رضی اللہ عنہ و ارضاہ) پڑھا کرتے تھے، تو انہوں نے سرخ رنگ کی ایک جلد بندی کی ہوئی بیاض میرے سامنے پیش کی، میں نے اس میں سے بہت سی دعائیں نقل کیں [1]، اسی میں یہ بھی تھا کہ: اور

اس دعا (دعائے افتتاح) کے ذریعہ سے ماہ رمضان کی ہر رات دعا کرو، کیونکہ اس مہینے میں دعا ملائکہ سنتے ہیں اور صاحب دعا کے لیے استغفار کرتے ہیں،......“

اس سلسلۂ سند اور طریق اسناد میں بعض نزاکتیں ایسی ہیں، جن کی بنا پر ”اصل صاحب دعا“ یعنی اس متنِ متین کے خالق کے بارے میں قدرے ابہام پیدا ہوا ہے۔

سب سے پہلے تو یہ غور کرنے کی بات ہے کہ سید ابن طاؤس صاحبِ اقبال کی عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اسے ”بالوِجادۃ“ (ح) نقل کر رہے ہیں، یعنی وہ یہ دعا اور اس فصل کی دوسری دعائیں براہِ راست محمد بن ابی قرۃ کی دعاؤں کی ”کتاب“ سے نقل کر رہے ہیں، جیسے آج کل عموماً تعلیم یافتہ حضرات دستیاب کتابوں سے براہ راست مطالب نقل کرتے ہیں، سید ابن طاؤس کی ذات اور شخصیت ایسی ہی ہے کہ وہ جیسے بھی، جن سے بھی اور جہاں سے بھی نقل کریں، اگر وہ نقل کردہ روایت، مضمون یا مطلب کو بجائے خود اعتبار اور اہمیت دیتے ہیں تو پھر کوئی جائے سخن نہیں رہ جاتی۔

ع مستند ہے اُن کا فرمایا ہوا

[1] افسوس ہے کہ ایک معاصر بزرگ نے اس جملے کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ علامۂ سید ابن طاؤس نے اس دفتر سے بہت سی دعائیں نقل کیں (دیکھیے: ترجمہ وشرحِ دعائے افتتاح از آیۃ اللہ محمد رضا مہدوی کنی)۔

(ح) تحمّل حدیث یا طلب وتحصیل روایت اور نقل روایت کے کئی طریقے ہیں۔ بعض علمائے درایت ورجال نے ان طریقوں کو سات اور بعض نے نو میں منحصر فرمایا ہے، جو حسبِ ذیل ہیں:

۱- السماع من لفظِ الشیخ ۲- القراءۃ علی الشیخ ۳- الاجازۃ ۴- المناولۃ ۵- الکتابۃ ۶- الاعلام ۷- الوجادہ

ان کی علمی، رجالی، روحانی اور رہنمایانہ حیثیتوں پر گفتگو کی جائے تو پوری کتاب انہیں کے تذکرے سے پُر ہو جائے اور پھر بھی بات پوری نہ ہو!

''محمد بن اَبی قُرۃ'' کا نام اور کام بھی اہم ہے۔ ان کا تذکرہ ان کی ''توثیق'' کے ساتھ ہماری بیشتر حدیث ورجال کی کتابوں میں ملتا ہے۔ (وسائل الشیعہ ج ۲۰ ص ۳۳۷) میں ہے ''ابن ابی قرة القنانی الکاتب - کان ثقة ، وسمع كثيراً و كتب كثيراً قاله النجاشي و العلامه''۔ (کلمة الامام المهدی ص ۳۵۷) اس کے علاوہ جامع الرواۃ نجاشی، خلاصۂ علامہ، وظائف الشیعہ وغیرہ میں بھی ان کا تذکرہ موجود ہے۔

محمد بن ابی قرۃ نے جن سے نقل کیا ہے اور جس طرح اُن کا تذکرہ کیا ہے، اُسی سے ان کی اہمیت، عظمت اور وقعت کا اندازہ ہو جاتا ہے، مثلاً یہ کہ صرف نام ذکر نہیں کیا ہے بلکہ نام سے پہلے ان کی کنیت ''ابوالغنائم'' بھی ذکر کی ہے، پھر اب و جد کے ناموں اور امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام سے ان کے شرفِ نَسبی کے لفظی اظہار کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اب اگر کتبِ رجال میں ان کا تذکرہ نہ بھی پایا جائے تو بھی انہیں (یعنی ابو الغنائم کو) مجاہیل میں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جبکہ ان سے نقل کرنے والے (ابن ابی قرہ) اور جن سے وہ نقل کر رہے ہیں (ابوعمرو محمد بن نصر السکونی) اعلام ثقات، بلکہ اپنے حلقے کے فقہاء میں سے ہیں۔

ابوعمرو محمد بن نصر السکونی وہ بزرگ ہیں جن کے متعلق امامِ رجال آیۃ اللہ العظمیٰ خوئیؒ نے معجم رجالِ الحدیث (ج ۱۷ ص ۲۰۱ بشمارہ ۱۱۷۱۶) میں تحریر فرمایا ہے:

''قال النجاشی: محمد بن محمد بن منصور، اَبوعمرو

السكوني، المعروف به ''ابن خرقة'' رجل من اصحابنا من اهل البصره، شيخ الطائفة فى وقته ، فقيه ثقة له كتب......''

''نجاشی نے کہا: محمد بن محمد بن نصر ...... السکونی ...... اپنے وقت میں شیخ الطائفہ تھے گویا مرجع وقت، وہ فقیہ تھے، ثقہ تھے اور صاحب تالیفات تھے......''

ابوبکر احمد بن محمد بن عثمان بغدادی جیسا کہ سند ہی کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ (جناب ابوجعفر محمد بن عثمان بن سعید عَمری) حضرت امام عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے نائبِ خاص کے بھتیجے ہیں اور ان کی بیاضِ دعا کے امانت دار ہیں!

خود جناب ابوجعفر عَمری، امام علیہ السلام کے دوسرے نائب اور صاحب کرامات بزرگ ہیں، ان کا تفصیلی تذکرہ بھی ایک دفتر چاہتا ہے۔

سند کے اسی قدر کوائف پر نظر ڈال کر بہت ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ گمان گزرے کہ یہ دُعا خود جناب ابوجعفر عَمری کے مُنشآت سے ہو سکتی ہے اس لیے کہ اس میں آخری نام اُنہیں کا ہے اور ان کی زبان یا ان کے قلم سے صراحۃً امام علیہ السلام کی جانب دعا کا اسناد نہیں پایا جاتا۔ لیکن اسی سند کو علامہ مجلسی نے بحار الانوار میں ان الفاظ میں نقل کیا ہے: بحار الانوار (ج ۲۴ باب ص ۱۶۶ حدیث ۱۴)

''الاقبال نقلاً من كتاب محمد بن ابی قره باسناده عن محمد بن عثمان العمرى عن القائم عليه السلام من ادعية ليالى شهر رمضان......''

علامہ مجلسیؒ نے ''عن القائم علیہ السلام'' کا اضافہ خود ہی فرمایا ہے یا ان کے پاس اقبال کا جو نسخہ تھا اس میں موجود تھا یہ بجائے خود ایک تحقیق طلب مسئلہ ہے۔ چونکہ اقبال کے دستیاب مخطوطہ اور مطبوعہ نسخوں میں عموماً ''عن القائم علیہ

السلام" کے الفاظ نہیں پائے جاتے۔ اور اسی بنا پر بحار کے محشی نے اس مقام پر حاشیہ میں لکھا ہے: "......اقول: فاسناده الیٰ القائم علیه السلام وَهم" "میں کہتا ہوں کہ ان کا حضرت قائم علیہ السلام کی طرف اسناد وھم ہے"ـــــ لیکن جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا یہ قطعاً ممکن ہے کہ علامہ مجلسیؒ کے پاس جو نسخہ ہو اس میں اسناد میں یہ الفاظ موجود ہوں اور یہ علامہ کا محض وہم نہ ہو، بلکہ یہ وہم علامہ مجلسیؒ کے متعلق علامہ بہبودیؒ کو اقبال کے دستیاب نسخوں کی عبارت کی بنا پر ہوا ہو۔

اس کے علاوہ ایک نکتہ اور موجودہ اسناد کے الفاظ میں بھی قابل غور ہے کہ جناب ابو جعفر محمد عَمری کی بیاض دُعا کی عبارت "وتدعو" سے شروع ہوتی ہے، اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ کوئی حکم دے رہا ہے، کسی کا ارشاد ہے، کسی کی فرمائش ہے کہ "...... رمضان المبارک کی ہر رات ... یہ دعا پڑھا کرو! ..." اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب ابو جعفر عَمری جو کہ نائبِ امام علیہ السلام ہیں ظاہراً امام کے حکم سے اس دعا کو لکھ رہے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسی بنا پر علامہ مجلسیؒ نے "عن القائم علیہ السلام" کی صراحت فرمادی ہو کہ وہ اخبار و روایات اور احادیث و اسانید کے نکتہ داں اور نکہت آشنا تھے، ان ارشادات و عبارات کے معانی ان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا یا آج سمجھ سکتا ہے! اور اسی بنا پر نہ صرف بحار الانوار میں انہوں نے اسناد کی عبارت میں حضرت قائم علیہ السلام کا ذکر فرمایا ہے بلکہ اپنی مشہور و معروف کتابِ دعا "زاد المعاد" میں بھی نہایت یقین کے ساتھ دعائے افتتاح کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا:

"بسند معتبر از حضرت صاحب الامر (عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف) منقولست کہ بشیعیان نوشتند کہ در ہر شبِ ماہِ مبارک این دعا را بخوانند کہ دعائے ایں ماہ را ملائکہ میشنوند و برای صاحبش استغفار میکنند"

(مجلسیؒ: زاد المعاد؛ ط۔ کتابفروش اسلامیہ بوذر جمہری تہران، شوال ۱۳۹۴ھ ق ص ۱۱۰ و ۱۰۹۔)

ارباب نظر و اصحاب خبر پر پوشیدہ نہیں ہے کہ زاد المعاد علامہ مجلسی کی وفات (۱۱۱۱ھ ق) سے تقریباً ۴ رسال قبل ۱۱۰۷ھ.ق. کی اور بحار الانوار کے بعد کی تالیف ہے۔

سَنَد کے ان کوائف کے ساتھ اور علامہ مجلسیؒ کی تصریح کے بعد کسی "استظہار" کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔[1] غالباً اسی لیے علامہ محسن امینِ عاملی نے بھی مفتاح الجنّات میں اس دعا کا ذکر اس تمہید کے ساتھ فرمایا ہے:

"دعاء الافتتاح: كان يدعو به ابو جعفر محمد بن عثمان بن سعيد العَمري احد ابواب الصاحب (ع) وهو مروى عن صاحب الامر (ع)" (مفتاح الجنات ج ۳ ص ۲۰۰)

اور اسے کون خارج از امکان قرار دے سکتا ہے کہ علامہ عاملیؒ کے پیش نظر کوئی اور مآخذ و سند بھی ہو! بہرحال دعائے افتتاح کے اس حسنِ استناد کو پیش نظر رکھیں تو اس دعا کا سب سے بڑا امتیاز تو یہی قرار پائے گا کہ اس کے کلمات حضرت صاحب الزمان علیہ الصلاۃ والسلام کے انفاسِ قدسیہ کی نکہت سے معمور ہیں!

اِس کے جمالِ متن، مضامین عالیہ اور مطالب سامیہ کی بحث اپنی اپنی جگہ پر جداگانہ ہے!

[1] یہ دفعِ وہم ہے، چونکہ جنابِ علامہ حسن زادہ نے اس دعا کی سند و نسبت کے بارے میں اسی طرح استظہار فرمایا ہے۔

متنِ دعا

ہمارے پیشِ نظر جناب محدث قمیؒ کی مفاتیح الجنان ہی کا متن ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مجموعوں میں مندرج اس دعا کے متن میں کوئی بڑا قابل لحاظ اختلاف نظر نہیں آتا۔

علامہ مجلسیؒ کی زاد المعاد کا جو مطبوعہ نسخہ اس وقت پیش نظر ہے وہ حسنِ کتابت اور معیارِ طباعت کے لحاظ سے ایران میں چھپنے والی کتابوں کے بلند معیار سے نسبتہً کمزور ہے۔ اعراب، کی غلطیوں سے بھی پاک نہیں ہے۔ چنانچہ دعائے افتتاح میں بھی دو ایک جگہوں پر صراحتہً غلطی موجود ہے۔ اس لیے دو ایک جگہوں پر جو اعراب مشہور و متداول متن کے اعراب سے مختلف ہونے کے باوجود بجائے خود غلط نہیں ہے، اُسے اختلافِ قرأت میں شمار کیا جائے یا کاتب کا اشتباہ، یہ بجائے خود ایک مسئلہ ہے۔ تاہم ان جگہوں کو چونکہ وہ بجائے خود صحیح اور معنی خیز ہیں ''اختلافِ قرأت'' کے ضمن میں لیا جاسکتا ہے۔

علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں پوری دعائے افتتاح نقل نہیں فرمائی ہے۔ صرف اس کے تین فقرے نقل کیے ہیں۔ جو متداول اور مشہور متن کے بالکل مطابق ہیں۔

بحار الانوار ہی میں بعض دوسری دعاؤں کے متن میں دعائے افتتاح کے بعض پورے پورے بند یا فقرے بغیر کسی اختلاف یا تغیر کے پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بھی مشہور بین الناس متن سے حرف بحرف مطابقت رکھتے ہیں۔

متونِ حدیث و روایات اور عباراتِ دعا و زیارات کے محقق خبیر، محدث اخیر، علامہ شیخ عباس قمی صاحب مفاتیح الجنان نے خود دعا کے چوبیس کلمات میں

اختلافِ نسخ کی نشاندہی فرمائی ہے۔ ان میں وہ چند کلمات بھی شامل ہیں جو زاد المعاد کے نسخے میں آئے ہیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایک اختلاف بھی ایسا نہیں ہے، جس سے مضمونِ دعا یا منطوق و مفہوم کلام میں ذرا سا بھی فرق پیدا ہو رہا ہو۔ پھر بھی ان تمام اختلافات کی ترجمہ و شرح کے ذیل میں حسب موقع وضاحت کردی گئی ہے۔ اس لیے یہاں پر علیٰحدہ سے ان کی فہرست پیش کرنا ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

قلم را باز دارم از اطالہ
من و معنی تو و مدّ و اِمالہ

☆☆☆☆☆
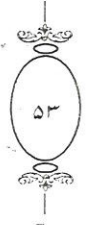
جمالِ متن و متانتِ مضمون

سند و متن کے تعلق سے طالب علمانہ تحقیق اور تفحّص کے بعد اب ذرا متن و مضمونِ دعا پر دوسرے جہات و جوانب سے غور کیجیے......

جیسا کہ تمہید میں عرض کیا گیا، یہ دعا صرف ایک ''فرد'' کی فریاد و فغاں نہیں بلکہ پورے معاشرے کی صدائے حال ہے۔ جس طرح نماز میں ''الحمد للہ رب العالمین'' کہنے والا مصلی جلد ہی ''ایاک نعبد و ایاک نستعین'' کی منزل پر پہنچ کر ''واحد متکلم'' نہیں رہ جاتا اور نتیجۃً چاہے وہ احکامِ ظاہریہ کے لحاظ سے مُفْرِد ہی کیوں نہ ہو، وہ روحانی اور معنوی اعتبار سے ''مُفْرِدْ''، مُنْفَرِد یا متفرد نہیں رہ جاتا، اسی طرح اس دعا کی تلاوت کرنے والا اپنے مطلعِ سخن میں ''اللھم انّی افتتح الثناء بحمدک'' کا زمزمہ خواں مقطعِ دعا تک پہنچتے پہنچتے ''اللھم انّا نرغب الیک'' کا ہمہمہ بلند کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ایک مرتبہ اس دُعا کی تلاوت کے بعد اس کے متن و مضامین پر غور کر رہا تھا تو ذہن میں یہ معانی مرتسم ہوئے کہ اکثر علمائے ظاہر پرست نے بھی اور عرفائے باطن شناس نے بھی، بلکہ تقریباً سبھی نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ ''صلاۃ'' یا نماز بلکہ جملہ عبادات کی حقیقت و ماہیت دراصل ثنائے الٰہی ہے! اور یہ دعا بھی ایک عمدہ ثنائے الٰہی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دعا گویا حقیقتِ صلاۃ کے عرفانی مصادیق میں شمار کی جاسکتی ہے! غالباً اسی لحاظ سے ایسی دعاؤں کی تلاوت بہت سی نافلہ نمازوں کے پڑھنے سے زیادہ اجر و ثواب رکھتی ہے! اور ممکن ہے کہ اسی لیے اس مکمل دُعا کو صاحب متن دعا علیہ التحیۃ والثناء نے ''الثنآء'' سے تعبیر کیا ہے۔ ''اللھم اِنی افتتح الثنآء بحمدک''! اس کے متن و مضامین کے عمق میں غور کیجیے تو اس میں ''تکبیر الٰہی'' بھی ہے اور ''حق تکبیر'' کے ساتھ! حمد الٰہی بھی ہے ''حق تحمید'' اور حسن تمجید کے ساتھ!!

پوری دعا میں کربلا میں شہدائے بنی ہاشم کے ہم عدد ۱۸ مرتبہ کلمہ ''الحمد للہ'' کی تکرار ہے۔ اور یہ لفظ تکرار تو میں نے حسب ظاہر استعمال کر دیا، ورنہ یہ اٹھارہ تجلیاتِ مدحت ہیں اور تجلّی میں تکرار کہاں؟

(۱)

مطلعِ دُعا
یا
براعتِ طلب

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۤ اَفْتَتِحُ الثَّنَآءَ بِحَمْدِکَ!

یعنی: اے معبود! میں آغاز کر رہا ہوں اس عرضِ حال کا تیری حمد سے!

یا دل چاہے تو یوں کہہ لیجیے کہ:

''اے معبود! میں اپنی عرضِ حال تیری حمد سے شروع کر رہا ہوں۔''

اس مطلعِ دعا کا ہر لفظ قابلِ غور ہے۔

''اللھم''، یعنی اے اللہ' اے معبودِ برحق! اے معبود! یا چاہیے تو اپنے پورے وجود اور پورے جذبہ سے صرف ایک ہی لفظ کہہ لیجیے: ''معبود!''

حضرت میر تقی میرؔ علیہ الرحمہ نے کیا اچھی بات کہی ہے ۔

دیتی ہے طول بلبل کیوں شورشِ فغاں کو
یک نالہ حوصلے سے بس ہے وداعِ جاں کو!

عربی قواعد کے لحاظ سے یہ ندا و منادیٰ ہے۔ اصل میں یا اللہ تھا۔ شروع میں حرفِ ندا ''یا'' حذف کر کے اس کے عوض میں آخیر میں تشدید کے ساتھ حرفِ میم کا اضافہ کر دیا گیا۔ اکثر اربابِ نحو عام طور پر یہی کہتے ہیں۔

یقیناً اِس کے ذیل میں کچھ اور نحوی بحثیں بھی آتی ہیں جن کے دہرانے کا یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ لیکن یہ ضرور قابلِ ذکر ہے کہ حرفِ 'یا' کی حرفِ 'م' سے تعویض عربی زبان میں صرف ایک اسی لفظ یعنی اسمِ مبارکِ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی اور اسم کے ساتھ یہ طریقہ اختیار نہیں کر سکتے کہ مثلاً ''یا محمدؐ'' کہنے کے بجائے ''محمّدُمّ'' کہہ کر پکارا جائے!

چونکہ یہ شرح دعا ہے اس لیے 'یا' کو 'م' سے بدلنے کی ایک عرفانی توجیہ کا ذکر بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ جسے مشہور فلسفی، فقیہ اور عارف مولانا ھادی سبزواریؒ نے شرح دعائے جوشنِ کبیر میں بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''والسر فی التعویض الاشارة الیٰ الاستخلافِ، فان ''المیم'' مفتاح اسم الخاتم وخاتم اسمِ آدم. فخلافة میم عن یاء ... حاکیة عن خلافة الانسانِ الکامل عن الله تعالیٰ ... والسر فی التشدید ان فی اسم محمد (ص) میمین: احدهما میم الملک ولآخر میم الملکوت، او دعهما الله تعالیٰ فی اسمِ حبیبهٖ ایماء الیٰ ان عنده سر الملک و الملکوت...''

(شرح جوشن کبیر ص ۴۷)

اس تعویض، یعنی یا کو میم سے بدلنے میں راز یہ ہے کہ یہ اشارہ ہے استخلاف کی طرف،.... اس لیے کہ ''میم'' نام نامی حضرت خاتم النبیین محمد مصطفےٰؐ کا حرف اول ہے اور اسم گرامی حضرت آدم کا حرف آخر....

....تو میم کا یا کی جگہ لینا،.... ترجمانی ہے انسانِ کامل کی خلافت الہیہ کی؛ اور میم کی تشدید میں راز یہ ہے کہ نام محمدؐ میں دو میم ہیں۔ ایک میمِ مُلک ہے اور دوسری میمِ ملکوت: معبود برحق نے یہ دونوں میم اپنے حبیب کے نام میں 'ودیعت' فرمائے ہیں، اس اشارے کے طور پر کہ ملک اور ملکوت دونوں عالموں کا راز انہیں (ص) کے پاس ہے:''

حقیقۃً ایسے اَسرارِ کلام پر اطلاع پانا اُسی معبود برحق کے لطفِ بے پایاں اور حسنِ توفیق کے بغیر ممکن نہیں ہے جو مولانا ہادی سبزواری ہی جیسے عُبّاد و زُہّاد کے حصے میں آ سکتا ہے۔

(اِنّــِـي) یہ حرفِ اِثبات دُعا ہے مقامِ ابتہال میں! یہ بندے کا حضور

معبود میں عاجزانہ قیام ہے، یہ اِنِّـــــی ،انانیت کا متکبرانہ اظہار نہیں ہے، بلکہ
معبود برحق کے حضور میں اپنی فقیرانہ حیثیت کا اعتراف ہے جس میں حسنِ التفات
اورحسنِ عنایت کی طلب بھی مضمر ہے۔

☆☆☆

''اَفْتَتِـحُ'': یہ فتح کے مادے سے باب افتعال سے مضارع واحد متکلم کا
صیغہ ہے۔جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ میں آغاز کرتا ہوں، کھولتا ہوں، شروع کرتا
ہوں- یا-''فتح کرتا ہوں''۔ ظاہر ہے کہ مقامِ دعا میں پہلے ہی معنی مراد ہو سکتے
ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اگر ''ثنا'' سے ستائش وسپاس وشکر ہی مراد ہو، محض عرض حال
مراد نہ ہو، تو پھر کسی سرمستِ بادۂ عشق وعرفان کے ذہن میں یہ معنی بھی خطور کر سکتے
ہیں کہ ''اے معبود! میں تری ستائش کی مہم، تیرے شکر کی منزل، تیری مخصوص حمد کے
ذریعہ سر کر رہا ہوں!'' اگرچہ اس معنی کو مقامِ دعا سے کچھ بھی مناسبت نہیں ہے۔ بلکہ
یہ بات سرمست اور مجذوب قسم کے عُرفا کے 'شطحیات' سے زیادہ قریب ہے۔

☆☆☆

حمد باری تعالیٰ سے آغازِ سخن یا افتتاحِ کلام میں بے انتہا اسرار ہیں۔
جناب امیر المؤمنین علیہ السلام کے ایک خطبہ کے ابتدائی فقرے ہیں:

''الحمد للہ الذی جعل الحمد مفتاحاً لذکرہ وسببا
للمزید من فضلہ ودلیلاً علیٰ آلائہ و عظمتہ''

(نہج البلاغہ نسخۂ صبحی صالح، خ۱۵۷)

''تمام حمد اسی اللہ کے لیے ہے جس نے حمد کو اپنے ذکر کی کلید، افزونیِ
لطف وکرم کا سبب اور اپنی نعمتوں، نشانیوں اور عظمتوں کی دلیل قرار دیا''

☆☆☆

''الثنآء'' : اس فقرے کے سیاق وسباق میں یہ لفظ ذرا زیادہ بحث طلب
ہے۔''ثنآء'' عربی میں الف ممدودہ اور ہمزہ کے ساتھ ہے۔اردو میں آ کر یہی لفظ''
ثنا'' بن گیا اور لفظ''حمد'' کا ردیفِ مستقل یا تابعِ موزوں، تابعِ احسن واجمل- اکثر
''حمد وثنا'' یا ''مدح وثنا'' کے الفاظ ساتھ ساتھ ہی آتے ہیں۔

انیسؔ کی مشہور بیت ہے:

آخر ہے رات حمد وثنائے خدا کرو
اٹھو! فریضۂ سحری کو ادا کرو

اردو میں ثنا کے معنی صرف ''مدح'' تعریف یا توصیف کے ہیں۔لیکن
عربی میں اس کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ اگرچہ وہاں بھی زیادہ تر اسی معنی
میں استعمال ہوتا ہے۔

اس فقرے میں اگر ثنا سے مدح وستائش ہی مراد لی جائے تو پھر ترجمہ یہ
ہوگا، جیسا کہ اکثر مترجمین نے کیا ہے کہ ''اے معبود! میں اس مدح وثنا کا آغاز تیری
حمد سے کر رہا ہوں''۔ اَب غور کیجیے کہ منطوق اور مفہوم کیا ہوئے؟ کیا یہ قصیدہ کسی اور
کا ہے جس کا آغاز ''حمد الٰہی'' سے ہو رہا ہے؟ یا یہ مدح اسی کی ہے لیکن صرف اسی
کے بتائے ہوئے مخصوص کلمات حمد کے ذریعہ سے اس کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ دونوں
ہی باتیں درست نہیں ہیں۔ نہ یہ کسی اور کا قصیدہ ہے اور نہ اس میں صرف قرآن مجید
میں وارد کلماتِ حمد پر انحصار واقتصار ہے۔اسی لیے یہاں پر لفظ ثنا کے معنی، اس کے
محلِ استعمال اور ''نحوۂ استعمال'' پر غور کرنا ضروری ہے۔

ابھی عرض کیا گیا کہ اگرچہ لفظِ ثنا کا زیادہ تر استعمال مدح وستائش کے معنی
میں ہوتا ہے۔لیکن لغوی حقیقت کے لحاظ سے یہ صرف ''بیان'' کے معنی رکھتا ہے۔
چاہے وہ بیانِ حسن ہو یا بیانِ ذم، ثنائے جمیل ہو یا ''سوء ثنا'' ـــــ یہاں پر چونکہ رب

کریم کے حضور میں دعا گزار اپنے اور اپنے معاشرے کے احوال و کوائف بیان کر رہا ہے اس لیے اسے بیان حسن یا بیان ذم سے نہیں بلکہ بیانِ احوال یا ''عرضِ حال'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

ہاں! چونکہ رب کریم کے حضور میں ''عرضِ حال'' کے ضروری آداب میں سے یہ ہے کہ آغاز ''حمد'' سے ہو جیسا کہ احادیثِ نبویہؐ اور ارشاداتِ ائمہ علیہم السلام میں تعلیم کیا گیا ہے، اس لیے داعی، دعا گزار یہ کہہ رہا ہے کہ ''اے معبود میں اپنی عرضِ حال تری حمد سے شروع کر رہا ہوں!'' یہ کہنا حسن التفات کا عاجزانہ مطالبہ ہے کہ معبود! میں اپنی بساط بھر تیرے محضرِ اقدس کے اداب بجالانے کی پوری کوشش کر رہا ہوں، میری دعا رد نہ فرمانا!!

''بحمدک''

میں جو ''ب'' ہے یہ وہی ہے جو بسم اللہ کے شروع میں ہے، جس سے کتاب اللہ قرآنِ مجید و فرقانِ حمید کا آغاز ہوا ہے۔ جسے عربی زبان کی گرامر میں ''حرفِ جر'' کہتے ہیں۔ معلوم ہے کہ عربی میں جَر کے معنی کھینچنے کے ہیں۔ حرفِ جر کسی نہ کسی فعل یا شبہ فعل کے معنی کو کھینچ کر اپنے بعد آنے والے اسم سے متعلق کر دیتے ہیں۔ یہ ساری تفصیل علمِ نحو کی ابتدائی کتابوں میں زیرِ بحث آجاتی ہے۔ یہاں پر صرف اتنی یاددہانی اور مناسب معلوم ہوتی ہے کہ حروفِ جارّہ میں حرفِ باء چودہ معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بائے بسم اللہ کی قسم! مجھے اِس حسنِ اتفاق پر ایمان افروز حیرت و مسرت ہے کہ ایک ہی حرف باء سے چودہ ابوابِ معنی کھلتے ہوئے نظر آتے ہیں!

ان چودہ معانیِ حرفی وظاہری میں سے بسم اللہ میں زیادہ تر استعانت کے معنی مُراد لیے گئے ہیں۔ بعض نے مُصاحبت کے معنی بھی مُراد لیے ہیں، لیکن کیا

مُضائقہ ہے اگر بہ یک ارادہ و بہ یک استعمال استعانت و مصاحبت و اِلصاق تینوں معانی شاملِ مُراد سمجھے جائیں! اور یہی صورت و ترکیبِ معنیٰ یہاں ''بحمدک'' میں مُراد و مقصود ٹھہرے!

حضرت نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم سے دو حدیثیں ایک ہی انداز پر وارد ہوئی ہیں۔ یہاں ''بحمدک'' میں اُن ارشادات کی تعمیل بھی ہو رہی ہے۔ یہ ارشاداتِ گرامی بہت مشہور ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

''کُلُّ اَمرٍ ذِیْ بَالٍ لَمْ یُبدأ بِبِسْمِ اللهِ الرحمٰنِ الرَّحِیمِ فَھُوَ اَبْتَرُ''

ہر قابلِ لحاظ اَمر جو بسم اللہ سے شروع نہ ہوگا وہ بے ثمر رہ جائے گا!

اور اسی طرح یہ فرمایا کہ:

''کُلُّ اَمرٍ لَمْ یُبدأ بِحَمدِ اللهِ فھوَ اَبْتَر''

ہر امر جو معبودِ برحق کی حمد سے شروع نہ ہوگا وہ بے نتیجہ رہے گا۔

کلامِ ائمہ سے اقتباس کرنے والے مصنفین میں سے کسی کا جملہ ہے کہ:

''یَجِبُ عَلیٰ کُلِّ ذِي مَقَالَةٍ أنْ یَبْدأ بِحَمْدِ اللهِ قَبْلَ اسْتِفْتَاحِهَا، کَمَابُدِئَ بِالنِّعْمَةِ قَبْلَ اسْتِحْقَاقِهَا''۔

[المبرد، الکامل، ج ۳ ص ۱۵۶]

''حمدک''

''تیری حمد'' یا ''تیری مخصوص حمد'' ''تیری حمد'' کے معنی واضح ہیں۔ لیکن اگر اضافت کا خیال کر کے مزید دقیقہ سنجی سے کام لیا جائے تو مراد یہ ہوگی کہ میں جو مضامینِ حمد تیرے لیے مخصوص ہیں، جو تو نے قرآن مجید میں یا اپنے نبی کریمؐ کی زبان مبارک سے اور اپنے اولیائے معصومینؑ کے توسط سے ہمیں بتائے ہیں اُنہیں

مخصوص مضامین حمد کے ذریعہ سے تیری ستایش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ورنہ میں اپنے طور پر تیری حمد کہاں کرسکتا ہوں۔

ماثور دعاؤں کے ذخیرے کا تتبع کیجیے تو اس فقرے سے مماثل فقرے بعض دوسری دعاؤں میں بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً بحارالانوار (ج ۹۱ ص ۲۰۰ باب ۲ روایت ۴) میں نمازِ حضرت جعفر طیارؑ کے بعد کی ایک دعا مفضل ابن عمر نے امام صادقؑ سے نقل کی ہے جو ان فقروں سے شروع ہوتی ہے:

"اللهم انی افتتح القول بحمدک وانطق بالثناء علیک...." یا بحارالانوار ہی میں (ج ۹۵ ص ۲۹۵ پر) ایک دعا اس طرح شروع ہوتی ہے:

"اللهم انا نستفتح الثنآء بحمدک ونستدعی الثواب بمنک فاسمع یا سمیع مدحتی...الخ"

یہ فقرے یاد آگئے تو صرف بطور مثال عرض کر دیے ورنہ اور بھی مثالیں مل جائیں گی۔ لیکن جیسا کہ تمہید میں عرض کیا گیا اس دعا کے متن کا نظم ونسق اور اس کے الفاظ ومعانی کا انسجام اور مضامین کا ارتکاز دوسری تمام مثالوں سے بہتر اور ممتاز ہے۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دوسری دعاوں کے کلمات راویوں کی زبانی روایت، زبانِ روایت اور حافظہ کی کمزوریوں سے کچھ کے کچھ ہو گئے۔ لیکن یہ دعا شروع سے بصورت تحریر نقل ہوتی آئی ہے اس لیے اس میں "سماع ونقل" کی کمزوریوں کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا۔

وَاَنْتَ مُسَدِّدٌ لِلصَّوَابِ بِمَنِّکَ!

اور تو ہی اپنے کرم سے صحیح راستہ دکھانے والا ہے!

تو ہی اپنے کرم سے کامیابی بخشنے والا ہے!

واو، (وَ) - یہاں پر عطف وتسلسل کلام کے لیے ہے۔ بیانِ حال کے لیے بھی ممکن ہے۔ "صواب" کا لفظ تو اردو اور فارسی میں بھی تقریباً انھیں معنوں میں مستعمل ہے، بلکہ جزوِ زبان بن چکا ہے، جن معانی میں یہ عربی زبان میں مستعمل ہے۔ بلکہ جواب باصواب، راہِ صواب، صواب اندیش، صوابدید وغیرہ تراکیب بھی ہماری زبان میں رائج ہیں۔ صواب یعنی درست، صحیح، سزاوار، حق، برحق، لائق۔ صواب ــــ خطا کی ضد ہے، اس لیے اس کے معنیِ موضوع لہ کو ایک لفظ "صحیح" یا درست میں منحصر سمجھا جاسکتا ہے۔

مُسَدِّدٌ - اس کا مادّہ س دد ہے۔ اس مادّے سے بھی اردو فارسی زبانوں میں ایک لفظ تو موجود ہی ہے۔ "سدّ" بمعنیٰ مانع، روکنے والا، رکاوٹ، سدِّ باب، سدِّ راہ ہونا، سدِّ رمق اور سدِّ سکندری وغیرہ ترکیبیں اور محاورے بھی مستعمل ہیں، لیکن اس مادّے کے سَدَّدَ، مُسَدِّد اور سدید جیسے پُر معنیٰ الفاظ عربی ہی تک محدود ہیں۔

دعائے جوشن کبیر میں ۷۸ ویں بند میں "یا ذُوالْقَوْلِ السَّدِیْدِ" آیا ہے۔ بعض فقرائے مجذوبین کی مناجاتوں میں "یاسَدِید" کا اطلاق بھی ہوا ہے مثلاً:

"یا وَحِیدُ یاحَمِیدُ یارَشِیدُ یا سَدِیدُ یاشَدِیدُ یا شَهِیدُ یا مَجِیدُ یا مُعِیدُ یا ذَاالْوَعْدِ وَالْوَعِیدِ یا مَنْ رُؤیَتُهُ لِلْعَاشِقِینَ عِیدٌ!"

خلاصہ یہ کہ مُسَدِّدٌ اسم فاعل ہے سَدَّدَ (باب فَعَّلَ) سے بمعنیٰ راہِ راست کی طرف ہدایت کرنے والا! صحیح یا سیدھا، سچا راستہ دکھانے والا!!

"مَنّ" یعنی احسان، کرم، لطف، عربی کا یہی مَنّ: اَلْمَنُّ وَالْمِنَّۃُ اردو میں مِنّت بن گیا، جو تنہا تو کم استعمال ہوتا ہے اور ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ احسان یا لطف و کرم ہی کے ہوتے ہیں۔ جیسے آپ کی مِنّت سے یا ان کی مِنّت وغیرہ... لیکن مِنّت

گزاری کے معنیٰ شکر گزاری کے ہوتے ہیں جس میں احسان کے معنی چھپے ہوئے ہیں۔ احسان نہ ہوگا تو شکر گزاری کس بات کی ہوگی؟ اور مِنّت وسماجت میں عاجزی اور خوشامد کے معنیٰ ہیں، اس کی تہہ میں بھی احسان طلبی، مِنّت کشی کے معنی موجود ہیں۔ اردو کے شاعر رندؔ کا عجیب سا شعر ہے۔

نازِ کافر نہ اٹھا مِنتِ دیدار نہ کھینچ

صدمۂ کش مکشِ سُبحہ و زُنّار نہ کھینچ

کوئی احسان کرے تو اس کی مِنّت ہے! اور کسی بزرگ کی خدمت میں اس کے احسان کے شکرانہ میں یا اس کے لطف وکرم کو شامل حال کرنے کے لیے کچھ اس کی خدمت میں پیش کیا جائے تو اردو میں ''مِنّت'' ہے! خدا کرے ہم سب پر معبودِ منّان کی مِنّت برقرار رہے، مِنّت کا چراغ جلتا رہے!

''ب'' حرفِ جر، اور چودہ مَعانی کے لیے استعمال ہوتا ہے! (یہ حقیقت اپنی جگہ پر مُسلّم ہے کہ ایک ہی ''ب'' میں چودہ ابوابِ معانی پوشیدہ ہیں!!)

یہاں پر بِـمَـنِّـکَ میں، ممکن ہے کہ بِ اُسی معنی میں ہو جس معنیٰ میں بحمدِک میں ہے، لیکن زیادہ قوی امکان یہ ہے کہ اس سے مختلف معنی میں ہے۔ وہاں مصاحبتِ معنوی اور ابتدائے غایتِ ماورائی کے معانی مضمر ہیں اور یہاں پر سَبَبِیّت یا علیّت کے!

مَنِّکَ: تیرا کرم یا تیرا مخصوص کرم!

☆☆☆

پہلے جملے (اللھم انی افتتِحُ الثناَ ءَ بحمدک) کے سیاق وسباق میں اس جملے کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں یہ عرضِ حال یا تیرا یہ سپاس نامہ تیری ہی حمد سے شروع کر رہا ہوں اور بیانِ حمد میں بھی ''صحیح راہ'' تک رہنمائی کرنے والا اور

کامیابی بخشنے والا تو ہی ہے!

ایک مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ:

''اور تو ہی تو اس راہِ راست تک رہنمائی کرنے والا ہے کہ میں تیری حمد کر رہا ہوں!'' یہ جو میں اپنی درخواست کو تیری درگاہ میں پیش کر رہا ہوں، اور اِس ادب دعا کے ساتھ کہ اپنی درخواست کو تیری حمد سے شروع کر رہا ہوں یہ سب تیری ہی رہنمائی کا ثمرہ ہے!''

ایک مفہوم ان مفاہیم سے زیادہ عمومیت کا حامل یہ ہوسکتا ہے کہ ''اور تو ہی زندگی کے تمام معاملات میں صحیح راستا دکھانے والا اور کامیابی بخشنے والا ہے!''

حقیقتِ نفس الامری کے لحاظ سے یہ سبھی مفاہیم درست ہیں۔ لیکن اس میں سب سے دقیق، لطیف اور نازک بات ''بِـمَـنِّـکَ'' سے وابستہ ہے۔ اس کا ترجمہ سادہ طور پر احسان یا کرم یا لطف کر کے آگے بڑھ جانا مناسب نہیں ہے۔

حقیقتِ لُطف

ربِّ کریم کے لطف و کرم کے مُعتَرِف تو اپنی اپنی جگہ پر حسبِ ظرف و حسبِ توفیق سبھی ہیں۔ کوئی سعادتمندانہ طور پر اس کے لطف وکرم پر ایمان رکھتا ہے تو کوئی قہری طور پر اس کے اقرار پر مجبور نظر آتا ہے۔ لیکن نظریاتی (Ideological) طور پر یا نظریاتی بنیاد اور اصول سازی کے لحاظ سے، ایک فلسفیانہ اساس کے طور پر ''لطفِ الٰہی'' کی حقیقت کو ہمارے علماء نے جس طرح پیش کیا ہے وہ بلا شبہ ایک بے نظیر علمی، عرفانی اور توحیدی صواب اندیشی کی منفرد مثال ہے!

اگر چہ ہمارے علماء نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اُس کی تشریح وتوضیح کا

حق بھی ابھی تک ادا نہیں ہو پایا ہے۔ اس لیے یہاں پر اس کی ذرا سی تفصیل پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہمارے علمائے مفکرین اور متکلمین نے اِرسالِ رُسل اور نصب و تعیینِ ائمہ کے باب میں یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ بندوں کی حیرانی و سرگردانی دور کرنا، انہیں راہِ راست کی رہنمائی کرنا، اچھے بُرے کی باطنی طور پر تمیز اور ظاہری طور پر ہدایت عطا کرنا، سرچشمۂ خیر و امورِ خیر سے نزدیک کرنا ربِّ کریم کی ذاتِ اقدس پر واجب ہے۔ اور یہ ''وجوب''، ''ازراہِ لطف'' ہے! اس نظریہ کو محقق طوسی خواجہ نصیر الدین علیہ الرحمۃ نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''تجرید الاعتقاد'' میں ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

''وَاللُّطفُ وَاجِبٌ لِتَحصِیلِ الغَرَضِ بِهِ''

''اور لطف واجب ہے کیونکہ اِسی سے گوہرِ مراد حاصل ہوتا ہے!''

تجرید کے عدل و نبوت اور اِمامت کے مباحث میں نظریۂ لُطف کو محقق طوسیؒ نے اپنے مخصوص اسلوب، اپنی موجز فلسفیانہ نثر میں چند جملوں میں پیش کیا ہے۔ اِس ناچیز نے اس نظریۂ لُطف کو گسترش دے کر تمام مسائلِ مبدأ و معاد کو اسی ایک اساس پر حل کرنے کی سعی کی ہے اور مولائے حقیقی ہی کے لطف و کرم سے غالبًا یہ پہلی ایسی کوشش ہے جسے میں نے اپنی ایک مستقل تالیف ''المَسلکُ الحَنِیف فِي بَیَانِ اللُّطفِ مِنَ اللّطیف''، میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اکثر و بیشتر اس طرح کے سوالات زبانوں پر آتے رہتے ہیں کہ خالقِ کائنات، واجب الوجود علی الاطلاق، مبدأ المبادی، مُسبّب الاسباب، علّتُ العلل، حضرتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کے جو صفات دینی اور عرفانی نقطۂ نظر سے پیش کیے جاتے ہیں کہ: وہ فاعل مختار ہے، مجبور نہیں ہے، حیّ و قیوم ہے، رؤوف و رحیم ہے، سمیع و بصیر ہے، عادل و علیم ہے، صادق و کریم ہے، اور بطورِ خاص

یہ کہ:

وہ صَمد و غنی ہے، وہ بے نیازِ مطلق ہے، اس کی ذات میں کسی بھی طرح کے اِنفعال کا گزر نہیں، اور اسی قبیل کے دوسرے اوصاف، تو اگر یہ سب درست ہے تو پھر اس کائنات کی تخلیق کا سبب کیا ہے؟

ع پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اور اب جبکہ تخلیق فرما دیا تو پھر انسانوں کے لیے یہ نظامِ شریعت اور عبادات و معاملات میں یہ احکام و ''تکالیف'' کس وجہ سے ہے؟

اور حشر و نشر و میزان و جزا کیوں ہے؟

یہ دوزخ و بہشت کیوں بنائے گئے؟

ع یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی!

اس سب کا آخر سبب کیا ہے؟

نظریۂ لطف کی بناء پر اِن سب کا تشفّی بخش جواب صرف اور صرف ایک ہی لفظ سے دیا جا سکتا ہے اور وہ ہے ''لطف''!

The Almighty Allah created the universe merely out of His grace!

اُس نے ہمیں وجود بخشا اور بن مانگے عطا کیا یہ اس کا محض لطف ہے نہ کہ اس کی کوئی احتیاج ہے جو ہم سے یا ہماری تخلیق سے وابستہ ہو، پھر اس نے ہماری ضرورت کی تمام چیزیں ہماری تخلیق سے پہلے مُہیا کر دیں جیسے کوئی میزبان مہمان کو دعوت دینے سے پہلے ہی میزبانی کے تمام لوازمات مہیا کرتا ہے، یہ بھی اس کا مزید لطف ہے اور محض لطف! جبکہ ہم اس کی مہیا کردہ اور مُسخّر کردہ چیزوں کی اک ذرا سی قدردانی نہیں کر پاتے! اور مہمان خانہ کو ویرانہ بنا ڈالتے ہیں، پھر لطف بالائے لطف

یہ ہے کہ اُس نے ہم میں سے جس نے اپنا جیسا بھی ذوق وشوق بنالیا اُسی لحاظ سے اس کا ابدی ٹھکانہ بھی بنا دیا، خوش مذاقوں، خوش معاشوں کے لیے بہشت بریں تخلیق کردی اور بد مذاقوں، بد معاشوں کے لیے دوزخ تیار کردی، یہ سب اس کا محض لطف ہے، اُس کا کرم بے کراں ہے کہ کوئی کتنا ہی اس کا نافرمان بن جائے، نافرجام بن جائے وہ اپنا عطا کردہ فیضِ وجود اس سے واپس لے کر اُسے ''نابود'' نہیں کرتا، بلکہ دوزخ ہی میں سہی اس کی بقا کا انتظام فرما دیتا ہے!

یہاں پر مجھے میر انیسؔ کا ایک شعر یاد آتا ہے میں اسے الہامی شعر مانتا ہوں۔

ساقیِ رحمتِ معبود ہے قیامت و حشر
ہم اس کو بھی کرمِ بے حساب سمجھے ہیں!

پھر اُس نے اِس دنیا میں ہمیں جو علم وحکمت، عقل و نبوت، منطق و امامت، تدبیر وفراست، تہذیب وسیاست، شعور اور ہنر، غرض زندگی کی جو کچھ بھی لطافتیں اور معنویتیں عطا فرمائیں، یہ سب اُس ربِّ کریم، رؤوف ورحیم، خالقِ حکیم اور معبودِ رقیب ولطیف ہی کا لطف ہے!

وہ غنی ہے اور مُغنی! ہم ہیں محتاج اور فقیرِ محض بلکہ عینِ فقر!

مسئلۂ جبر واختیار کو بھی کوئی سمجھنا چاہے تو اسی نظریۂ لطف کی روشنی میں بہ لطافتِ شعور، بہ احسنِ وجہ، درک کرسکتا ہے کہ انسان اس کائنات میں مجبورِ محض نہیں ہے بلکہ 'محتاجِ محض' ہے! اور یہ محتاجی ''مخلوق'' ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ اُس قادر وقیوم نے اِسے محتاج کیا ہے! یہ انسانِ ذلیل ہے کہ اپنی حقیقت وحیثیتِ ذاتی میں محتاج ہے اور وہ ربِّ کریم ہے کہ اپنے لطف سے اِسے ''مختار'' بننے کی راہیں دکھاتا جاتا ہے!!!

وَاَیْقَنْتُ اَنَّکَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّاحِمِینَ فِي مَوضِعِ العَفْوِ وَ الرَّحْمَةِ

وَأَشَدُّ الْمُعاقِبِينَ فِي مَوضِعِ النَّكالِ وَالنَّقِمَةِ

وَأَعْظَمُ الْمُتَجَبِّرِينَ فِي مَوضِعِ الْكِبْرِياءِ وَالْعَظَمَةِ

اور مجھے یقین ہے کہ بخشش اور مہربانی کے موقع پر تو ہی تمام رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔

اور سزا اور سرزنش کے موقع پر تو ہی تمام سزا دینے والوں سے زیادہ سخت ہے!

اور بڑائی اور بزرگی کے محل میں تو ہی تمام بزرگواروں سے بزرگ تر ہے!!

☆☆☆

سرآغاز دعا اور تمہیدِ التجا میں حمد وثنا کے بعد یہ دوسرا مقدمۂ عرض وطلب ہے۔ چونکہ آدابِ دعا میں یہ بھی تعلیم فرمایا گیا ہے کہ درخواست حمد سے شروع کی جائے اور یہ بھی کہ ربِّ کریم کی ذات، اس کے صفات خصوصاً اس کے جود وکرم، اجابتِ دعا، قدرتِ عطا اور اُس کی جانب سے حاجت برآری پر مکمل یقین بھی رکھا جائے۔ اُس سے فی الواقع حسنِ ظن بھی ہو اور اس کا حسنِ اقرار بھی۔ ارشادِ الٰہی ہے:

''اَنا عِندَ ظَنِّ عبدِي بي فلا يَظُنُّ عَبْدِي بِي الا خَيراً''

''میں تو اپنے بندے کا 'قرینِ خیال' ہوں! بس میرا بندہ میرے بارے میں اچھا ہی خیال رکھے!''

پیغمبر ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اُدعُوا اللّٰہَ وَ أَنْتُمْ مُوقِنُونَ بالاجابَةِ''

''تم اللہ سے دعا کرو اس حال میں کہ تم کو قبولیتِ دعا کا یقین ہو''

اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''اِذَادَعَوتَ فظُنَّ حا جَتکَ بِالْبابِ''

''تم نے اگر دعا کی ہے تو یہ سمجھو کہ تمہاری حاجت، تمہاری طلب، تمہارے دروازے پر ہے۔''

☆☆☆

قرآن مجید میں دُعا کے آداب وشرائط کی تعلیم یہ دی گئی ہے کہ:

﴿اُدْعُوہُ خَوْفاً وَطَمَعاً﴾ (سورۂ اعراف آیت ۵۶)

''اور اللہ کو پکارو، اُس سے دُعا کرو اُس سے ڈرتے ہوئے (بھی) اور اس سے پُر امید رہتے ہوئے (بھی)!''یعنی قلب پر بیک وقت امید وبیم کی کیفیت طاری ہو۔

دعائے افتتاح کے زیرِ غور فقرے اِسی تعلیم قرآنی کا نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ اُس کی رحمتِ واسعہ پر یقین، اُس کے اشدُّ المعاقبین ہونے کا تذکرہ اور اس کی عظمت وکبریائی، اس کے جلال وجبروت کی ثنا سے دعا گزار کی معرفت اور اُس کے حسنِ ظن اور حسنِ ادب کی ترجمانی بھی ہو رہی ہے اور حرفِ دُعا کی حریمِ قُدس تک رسائی بھی ہو رہی ہے۔

اِس مقام کی مزید وضاحت کے لیے وصیِ مصطفیٰ امام علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا کا یہ فرمان گرامی چشمِ معرفت کا نور بڑھانے کے لیے نقشِ اکسیر ہے:

''اِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ یَحْسُنَ ظَنُّکُمْ بِاللّٰہ وَیَشْتَدَّ خَوفُکُمْ منہ فَاجْمَعُوا بَیْنَھُما فَاِنَّما یَکُونُ حُسنُ ظَنِّ الْعَبْدِ بِرَبِّہٖ علیٰ قَدْرِ خَوفِہٖ منہ وَاِنَّ اَحْسَنَ النَّاسِ بِاللّٰہِ ظَنًّا لَاَشَدُّھُمْ خَوفاً مِنْہُ''

''اگر تم میں سکت ہو تو ان دونوں اوصاف (حسن ظن باللہ اور خوف و خشیّت) کو جمع کرو کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ بندے کا اپنے رب سے حسنِ ظن اس کے درجۂ خوف کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ اور یقیناً اللہ سے بہترین حسنِ ظن رکھنے والا وہی ہوتا ہے جو اُس سے سب سے زیادہ خوف رکھتا ہے!''

حضرت امام صادق علیہ السلام کا ارشاد گرامی بھی اس باب میں بڑا عقدہ کشا ہے:

''لَا یَکُونُ العَبْدُ مؤمناً حتیٰ یکونَ رَاجِیاً خَائفاً حتیٰ یکونَ عامِلاً لما یَخاف و یرجو''

''بندہ مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ پُر امید اور خائف نہ ہو اور پُر امید وخائف نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ جس سے خائف اور پُر امید ہے اسی کے لیے عمل نہ کرے''

مجھے جو کچھ کہنا تھا ائمۂ اطہار علیہم السلام کے ارشادات سُنا کر اپنی بات کہہ چکا، اب اِن فقروں کے مفردات پر غور کر لیجیے۔

واو - (وَ) یہاں پر عطف وتسلسلِ بیان کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور بیانِ حال واظہارِ کیفیتِ یقین کے لیے بھی، کہ اے معبود! میں صرف زبانی حمد وستائش ہی نہیں کر رہا ہوں بلکہ میں اس حال میں تیری بارگاہ میں عرضِ حال کر رہا ہوں کہ مجھے ''یقین'' ہے تیری شانِ رحمت پر بھی، تیری قدرت پاداش پر بھی اور تیری عظمت وکبریائی کا بھی!

اَیْقَنْتُ: یہ عربی مادے (ی ق ن) یَقِنَ یَیْقَنُ سے، جو کہ معتلُ الفاء یا مثال یائی ہے، ثلاثی مزید کے باب اَفْعَلَ (اَیْقَنَ) سے ماضی واحد متکلم کا صیغہ ہے، اِس کا مصدر ''ایقان'' اردو میں ایمان کے قافیہ اور تابعِ موزوں اور ردیفِ مستقل

کے طور پر خوب استعمال ہوتا ہے۔

اسی مادّے کے فعل ثلاثی مجرد کا مصدر اور اسمِ مصدر ''یقین'' فارسی اردو، ہندی، پنجابی، پشتو اور نہ جانے کتنی زبانوں میں جوں کا توں استعمال ہوتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کا اردو کا مشہور شعر ہے۔

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں!

عربی میں ''اَیْقَنْتُ'' جب عَلِمْتُ کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے تو اسے بھی ''افعالِ قلوب'' میں شمار کرتے ہیں ویسے یہ فعلِ قلب ہی نہیں یہی کل کا کل سرمایۂ قلب ہے! اور اسی لحاظ سے علمِ اخلاق، عرفانیات اور علمیات میں علم الیقین، عین الیقین، اور حق الیقین کی اصطلاحوں سے پیمانۂ ادراک و وجدان، مراتبِ علم و ایمان اور درجاتِ قلبِ انسان کا تعیُّن کیا گیا ہے۔

دوسرے افعالِ قلوب (علمتُ، ظَنَنْتُ، حَسِبْتُ، خِلْتُ، رَاَیْتُ، زَعَمْتُ اور وَجدتُ) کی طرح یہ بھی دو مفعولوں پر عمل کرتا ہے۔ جیسے یہاں اَیقنتُ کا پہلا مفعول اَنَّکَ اور دوسرا ارحم الراحمین ہے۔ أنَّکَ کے بعد انتَ، ضمیرِ فصل ہے جو بیک وقت حسنِ خطاب، بیان، تاکید، اور حصر کے معانی بھی اپنے اندر سموے ہوے ہے!

ان فقروں میں دوسرے کلمات عفو و رحمت، اشَد، مُعَاقبین، نکال و نقمت، اعظم، متجبرین، کبریاء، عظمت اردو کے عِلمی متون میں اور تصوف کے ادب میں خوب استعمال ہوے ہیں اور بالکل اجنبی کلمات نہیں ہیں۔

☆☆☆☆☆

(۲)

اذنِ دعا
یا
بابِ قبول

اللّٰھم اَذِنْتَ لِي فِي دُعَائِکَ وَمَسْئَلَتِکَ

فَاسْمَعْ یَاسَمِیعُ مِدْحَتِي وَأَجِبْ یَا رَحِیمُ دَعْوَتِي وَأَقِلْ یَا غَفُورُ عَثْرَتِي!

اَے معبود! تُو نے مجھے دُعا اور طَلَب کی اِجازت دی ہے

تو اَے سُننے والے میری حمد سَماعت فرما، اے ہمیشہ رحم کرنے والے

میری طلب پوری کر اور اے درگزر کرنے والے میری خطا سے درگزر فرما!

☆☆☆

''اذنِ دعا''

ربِّ کریم کی بے کراں مہربانیوں میں سے ایک بڑی مہربانی ''اذنِ دعا'' ہے! اذنِ دعا کے بجائے خود کئی پہلو ہیں۔

ایک تو یہ کہ اُس نے سب کچھ عطا کر دینے کے بعد بھی مزید طلب کرنے کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ یہ ''حکمتِ ربانی'' ہے، ایک خاص ''حصۂ وجود'' عنایت فرما کر اُس میں ہر طرح کی وسعت پیدا کرنے کی! اور وہ بھی خود بندوں میں آتشِ شوق کو بھڑکا کر!!

ایک ظاہری پہلو یہ ہے جسے بطورِ مثال و تقریبِ ذہنی، غالبؔ کے اس شعر کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے۔

اسد شکوہ کفر و دُعا نا سپاسی!

ہجومِ تمنا سے ناچار ہیں ہم!!

تخلیقی یا تکوینی سطح پر تو فطرتِ انسانی میں یا خاکسترِ طبیعت میں پروردگار نے ذوق و شوق کی چنگاریاں دبا کر رکھ دی تھیں، پھر اگر انسان کو اذنِ طلب نہ ملتا تو

کیا ہوتا؟ اسی لیے اذنِ دعا بھی عطا فرمایا گیا بلکہ اسے عینِ بندگی (عبادت) قرار دیا گیا اور دعا و طلب سے، احتراز، خودداری، روگردانی یا سرگردانی کرنے والے کو ''مُستکبر'' بھی قرار دیا گیا، ارشاد ہوا:

﴿وَقَالَ رَبُّکُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَکُمْ إِنَّ الَّذِینَ یَسْتَکْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَیَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِینَ﴾

(سورۂ غافر ۴۰/آیت ۶۰)

''اور تمہارے پروردگار نے کہا، مجھ سے دُعا کرو، میں تمہاری دُعا قبول کروں گا، بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے متکبرانہ روگردانی کرتے ہیں وہ بہت جلد ذلت کے ساتھ جہنم میں جائیں گے!''

یہ ﴿ادعونی استجب لکم﴾ دُعا کا اذنِ قرآنی ہے!

اور اب خطیبِ قرآن ترجمانِ رحمان پیغمبرِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک بھی ملاحظہ فرمائیے:-

''افضلُ العِبادَاتِ الدُّعاءُ؛ وَاِذا اَذِنَ اللّٰهُ لِعَبْدٍ فِي الدُّعاءِ فَتحَ لَهُ بابَ الرَّحْمَةِ اِنَّهُ لَن یَهلِکَ مَعَ الدُّعاءِ اَحَد''۔

''بہترین عبادات دعا ہے! اور جب اللہ اپنے بندے کو اذنِ دعا عطا فرماتا ہے تو اس کے لیے رحمت کا دروازہ کھول دیتا ہے، یقیناً دعا کے ساتھ (اذنِ دُعا کے ہوتے ہوئے یا ربِّ کریم سے رشتۂ دعا کے برقرار رہتے ہوئے) کوئی بھی ہلاک نہیں ہو سکتا!''

اِسی کے ذیل میں وصیِ رسول حضرت امیر المومنین مولیٰ علی مرتضیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد بھی نظر میں رکھیے:

"مَا کانَ اللّٰهُ لیفتح بَابَ الدُّعاءِ و یُغلق بابَ الاِجَابةِ"

"معبودِ برحق ایسا نہیں کرسکتا کہ بابِ دُعا تو کھولے اور بابِ اجابت، بابِ قبولیت بند رکھے"۔

اور آپؑ کا یہ ارشاد:

"مَنْ اُعْطِیَ الدُّعاء لَمْ یَحرُم الاجابة"

"جسے دعا عطا کی گئی وہ قبولیت سے محروم نہیں ہوا"

آپؑ ہی کا ایک اور ارشاد بھی ہے، جس میں آپ نے بطورِ خاص اذنِ دُعا کی حکمت وشانِ رحمت پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے فرزند امامِ حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے نام وصیت نامے میں تحریر فرماتے ہیں:

"وَاعْلَمْ اَنَّ الَّذِي بِيَدِهِ خزائِنُ السَّمٰوٰاتِ وَالْاَرْضِ قَدْ اَذِنَ لَکَ فِي الدُّعاءِ وتَکَفَّلَ لَکَ بالاِجَابةِ وَاَمَرَکَ اَنْ تَسْئَلَهُ لِيُعْطِيَکَهُ

(نہج البلاغہ نسخہ صبحی صالح ص ۳۹۸)

"اور یہ جان لو کہ جس کے ہاتھوں میں آسمانوں اور زمین کے خزانے ہیں اُس نے تمہیں اذنِ دُعا عطا فرمایا ہے اور تمہارے لیے قبولیت کا ذمّہ لیا ہے اور تمہیں حکم دیا ہے کہ اس سے مانگو تا کہ وہ تمہیں عطا کرے!"۔

وصیت نامے کے اِس کے بعد کے جملے بھی بے حد اہم ہیں اور اَسرار کشا ہیں، رَمزِ دُعا کے جویا نہج البلاغہ کا مطالعہ کر کے ان جملوں سے مزید استفادہ کر سکتے ہیں۔

ان تمام ارشادات کا خلاصہ یہی ہے کہ ربِّ کریم نے ہمیں اذنِ دُعا مرحمت فرمایا ہے اور نہ صرف یہ اذن مرحمت فرمایا ہے بلکہ اسی اذن میں وعدۂ قبولیت

بھی مضمر ہے! اَب یہ حسنِ دُعا یا انتہائی حسن طلب ہے کہ دعا گزار کچھ عرض کرنے، کچھ طلب کرنے سے پہلے انتہائی احسان مندی کا اظہار کرتے ہوئے پہلے اُس مولا جلَّ وعلیٰ کے اذنِ طلب ہی کا تذکرہ کرتا ہے کہ یہ حصولِ اذن کا شکرانہ بھی ہے۔

☆☆☆

اس فقرے میں کوئی لفظ یا ترکیب ایسی دشوار نہیں ہے جس کی لغوی یا نحوی تشریح کی ضرورت ہو۔ پھر بھی لفظِ اذن کی رعایت سے یہ تذکرہ مجلسِ درس کی زینت ضرور ہوگا کہ اذن، اجازت دینے کو کہتے ہیں اور اسی مادّے سے لفظِ اَذان ہے جس کے معنی اعلانِ عام یا دوسرے الفاظ میں "اذنِ عام" کے ہیں۔ "اذانِ نماز" ربِّ کریم کے دربارِ عام میں حضوری کے بہترین وقت کا اعلانِ عام اور اس کو چاہنے والے اُس کے بندوں کے لیے انعامِ خاص ہے!

قرآن مجید میں لفظ "اَذان" حضرت امیر المؤمنین کی ذاتِ گرامی کا استعارہ ہے کیونکہ آپؑ ہی نے خدا اور رسولِ خدا کی جانب سے سورہ برأت کی تبلیغ کا خصوصی امتیاز اور کفار ومشرکین سے بیزاری کے اعلانِ عام کا شرف حاصل کیا تھا۔ جسے آپؑ کے عظیم ترین خصائص اور آپ کی خلافتِ الٰہیہ کے دلائل میں شمار کیا جاتا ہے۔

☆☆☆

فَاسْمَعْ یَا سَمِیعُ مِدْحَتِي وَاَجِبْ یَا رَحِیمُ دَعْوَتِي...

تو اَے سُننے والے میری حمد سماعت فرما اور اے ہمیشہ رحم کرنے والے میری طلب پوری کر!

یہ الحاح ہے یعنی حسنِ التجا ہے۔ الحاح کے لفظی معنیٰ ہیں: گریہ وزاری،

عاجزانہ اصرار، گڑگڑانا وغیرہ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے: ''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ السَّائِلَ اللَّحُوح''

''اللہ الحاح یا عاجزانہ اصرار کے ساتھ مانگنے والے کو پسند فرماتا ہے''۔

اللہ کے معصوم بندوں نے آدابِ دُعا میں تعلیم فرمایا ہے کہ:

''رَحِمَ اللّٰہُ عَبْداً طَلَبَ مِنَ اللّٰہِ شیأً فَاَلَحَّ عَلَیہِ''

اللہ رحمتِ خاص فرمائے اس بندے پر جو اللہ سے طلب کرے تو الحاح و زاری، (عاجزانہ اصرار) بھی اختیار کرے''

بلکہ مشیتِ الٰہیہ کے اداشناسوں نے یہاں تک ارشاد فرمایا کہ:

''اِنَّ الْعَبْدَ لَیَدْعُوا اللّٰہَ وَھُوَ یُحِبُّہٗ فَیَقُولُ لِجبرئیلَ اِقْضِ لِعَبْدِي ھٰذا حَاجَتَہٗ وَاَخِّرْھَا فَاِنِّي اُحِبُّ اَنْ لَا اَزالَ اَسْمَعُ صَوتَہٗ''

یہ بھی ہوتا ہے کہ بندہ معبود سے دعا کرتا ہے اور معبود اسے پسند کرتا ہے تو جبرئیل سے فرماتا ہے کہ میرے اِس بندے کی حاجت پوری کردو لیکن اسے تاخیر سے دو اس لیے کہ میں چاہتا ہوں کہ ''اس کی آواز سنتا رہوں''

''وَاِنَّ الْعَبْدَ لَیَدْعُوا اللّٰہَ عَزَّ وَ جَلَّ وَھُوَ یُبْغِضُہٗ فَیَقُول: یَا جِبْرَئِیل اِقْضِ لِعَبْدِي ھٰذا وَعَجِّلْھَا فَاِنِّي اُکْرِہُ اَنْ اَسْمَعَ صَوتَہ''

''اور یہ بھی ہوتا ہے کہ بندہ معبود سے دعا کرتا ہے اور معبود اسے ناپسند کرتا ہے تو فرماتا ہے اے جبرئیل اس بندے کی دعا پوری کردو اور جلدی کردو اور اس لیے کہ میں اس کی آواز سننا نہیں چاہتا''۔

یہ حدیث نبویؐ ہے۔ اِس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ بندہ اپنی ذات میں

بھی، اپنی دعا میں بھی اور اندازِ دُعا، سلیقۂ عرضِ تمنا، طریقِ بیانِ آرزو، اپنی زبان، آواز، اور اَدا میں بھی ربِّ کریم کی پسندیدگیوں کا پورا پورا لحاظ رکھے! اور دعا جلد مستجاب ہوتی ہوئی نظر نہ آتی ہو تو ناامید نہ ہو، بلکہ الحاح وزاری میں اس لیے بھی، اس امید پر بھی، اضافہ کردے کہ ممکن ہے ربِّ کریم اُس کی فریاد وفغاں کو سننا پسند کررہا ہو!

اِس وقت مجھے سید احمد حسین امجدؔ حیدرآبادی کی یہ رباعی یاد آرہی ہے:

ہردم اس کی عنایت تازہ ہے
اس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہو کھٹکھٹائے جاؤ
یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے!

☆☆☆

اس فقرے میں الفاظ مشکل تو نہیں ہیں۔ تاہم کچھ غور کرلینے میں حرج بھی نہیں ہے۔ فَاَسْمَعُ میں ف، حروفِ عاطفہ میں سے ہے۔ تفریع بیان کا فائدہ بھی دیتا ہے۔

اِسْمَعْ، اَجِبْ اور اس کے بعد والے فقرے میں اَقِلْ، یہ سب حسبِ ظاہر صیغۂ امر ہیں لیکن حسبِ مقام اِسے صیغۂ دُعا کہنا چاہیے!

مِدْحَت کے معنی یہاں پر نری مداحی نہیں ہے بلکہ حقیقی حمد وثنا ہے۔

مدحت کا لفظ ہماری زبان میں خوب مستعمل ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی کے ایک نعتیہ قصیدے کا مطلع ہے۔

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دوجہاں کے لیے
سخن زباں کے لیے اور زبان دہاں کے لیے

یا مثنوی گلزار نسیم کے تمہیدی اشعار میں ہے:

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دوزباں سے یکسر حمدِ حق و مِدحتِ پیمبرؐ

☆☆☆

وَاَقِلْ یَا غَفُورُ عَثْرَتِي!!

اور اے درگزر کرنے والے میری خطا سے درگزر فرما!

اس فقرے میں ''اقِل'' اور ''عثر تی'' دو کلمات ایسے ہیں جو اردو زبانوں کے لیے بالکل اجنبی ہیں؛ (اگرچہ اِقالَہ۔ بعض علمی مقالات یا کتب میں استعمال ضرور ہوا ہے بمعنیٰ معافی چاہنا یا بیع کو مسترد کرنا)۔

اَقِلْ – اَقَالَ، یُقِیلُ، اِقَالَۃً (ثلاثی مزید، معتل العین یا اجوف یائی) سے صیغۂ امر ہے۔ یہاں حسب مقام اِسے صیغۂ التجا یا صیغۂ دعا کہنا زیادہ مناسب ہے۔

ترجمہ ہوگا: ''مجھے بخش دے''۔ فقہِ اسلامی یا مجموعۂ قوانین الٰہی و انسانی کے حصۂ معاملات میں ''اِقالہ'' طے شدہ معاملہ کو توڑ دینے کی نیاز مندانہ درخواست کو کہتے ہیں۔

امامِ صادق علیہ السلام کی حدیث ہے:

''اَیُّمَا عَبْدٍ مُسْلِمٍ اَقَالَ مُسلِماً فِي بَیعٍ اَقَالَهُ اللّٰهُ عِثْرتَه یَومَ القِیَامَةِ''

''جو بندۂ مسلم کسی مسلم کو کسی معاملۂ بیع میں بخشے گا پروردگار روزِ قیامت اُس کے گناہ کو بخشے گا!''

عَثْرہ، غلطی، گناہ یا لغزش کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ ''ع ث ر'' عَثَرَ کے مادّے میں معنویت کچھ اور ہے اور اس کے دوسرے مشتقات میں بڑا حسن بھی ہے۔

جملے کا مفہوم بہت واضح ہے۔ اس مفہوم کا تعلق ''توبہ'' کے موضوع سے ہے جس کا بیان دعا کے دوسرے کلمات کے ضمن میں آئے گا۔ گزشتہ فقروں کے ساتھ یہاں پر یہ جزوِ الحاح وزاری ہے! اور اس کے بعد کے فقرے بھی حسنِ التجا اور حسنِ ثنا کے مصداق ہیں۔

☆☆☆

فَکَمْ یَا اِلٰهِي مِنْ کُرْبَةٍ قَدْ فَرَّجْتَهَا وَهُمُومٍ قَدْ کَشَفْتَهَا وَعَثْرَةٍ قَدْ اَقَلْتَهَا و رَحمَةٍ قَدْ نَشَرْتَهَا وَحَلقَةِ بَلاءٍ قَدْ فَکَکْتَهَا۔

نہ جانے کتنے دکھوں کو اے معبود تجھی نے دور کیا اور نہ جانے کتنے رنج تجھی نے مٹائے ہیں اور نہ جانے کتنی خطائیں تجھی نے درگزر فرمائی ہیں اور نہ جانے کتنی رحمتیں تجھی نے سایہ فگن کی ہیں اور نہ جانے کتنی بلاؤں کے پھندے تجھی نے کھولے ہیں۔

ان فقروں کے مضامین ترجموں ہی سے واضح ہو جاتے ہیں۔ مفردات الفاظ سے بحث مقصود بالذات نہیں ہے۔ اِن فقروں کے اکثر بلکہ تمام تر الفاظ ہماری زبان میں مستعمل ہیں۔ بعض تو جوں کے توں استعمال میں آئے ہیں، بعض تلفظ یا معنی میں تھوڑے سے تصرف کے ساتھ۔ جنہیں تحقیقِ الفاظ کا شغف ہو اُن کے لیے لغات اور قوامیس کے دفتر کھلے ہوئے ہیں۔

میں بطورِ مثال اتنا عرض کر دیتا ہوں کہ ''کم'' ''یا الٰہی'' کُربَۃ (جس

سے کرب ہے کربِ زندگی، کربِ آگہی، کرب و بلا) فَرَّجْتَهَا (جس کے ثلاثی مجرد سے فَرَجٌ بمعنیٰ کشایش ہے اردو کے عام ادب میں نہ سہی مذہبی ادب میں فَرَجِ حاں، فَرَجِ عاجل وغیرہ ترکیبیں مستعمل اور اہلِ علم طبقہ کے زبانوں پر جاری ہیں۔

اسی طرح هُمُوم، هَم (هَم وغَم) جمع، کشف، رحمت، نشر، حلقہ، بلاء (بلَا) یہ سب الفاظ کسی نہ کسی طرح اردو میں مستعمل ہیں اور اہلِ اردو ان سے مانوس ہیں۔ آخری لفظ ''فلکَکُتها''۔ میں لفظ ''فک'' اردو ادب اور قواعد کی زبان میں جاری و ساری ہے۔ فکُ یعنی ایک سابقہ چھوٹنا، ''فکُ الرہن'' رہن کی ہوئی چیز کو چھڑانا، فک اضافت یعنی اضافت کی علامت کو نہ پڑھنا جیسے صاحبِ دل کے بجائے صاحب دل پڑھنا یا کہنا۔

ہم کہ ہماری اضافت گناہ کے ساتھ ناقابلِ تفکیک ہے، ہم نفوس کو نافرمانیوں اور نافرجامیوں کا ''رہین'' بنا چکے ہیں، ہم کہ سراپا، سراسر معاصی ہیں، بس وہی معبودِ برحق ہے جو اپنی رأفت و رحمت سے ہمارے لیے فک 'رہن' فکِ اضافت اور فکِ حلقۂ بلا کرنے والا ہے!

(۳)

نمودِ توحید

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَمْ يَتَّخِذْ صَاحِبَةً وَلاَ وَلَدًا وَلَمْ يَكُنْ لَهُ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ وَلِيٌّ مِنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيراً۔

''تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے جس نے نہ کوئی بیوی اختیار کی نہ کوئی بیٹا اور نہ کوئی اس کی پادشاہی میں شریک ہے اور نہ کوئی فرومایگی میں اس کا سرپرست (اے بڑائی کرنے والو!) بڑائی کرو اسی کی جیسی اس کی بڑائی کرنی چاہیے۔''

شروع میں اجمالاً آدابِ دعا بجالائے گئے۔ایک ایک دو دو کلمات میں حمد وثنا ہوئی اور مغفرت کی درخواست کی گئی۔اب اس فقرے سے آئندہ مسلسل ۱۸ فقروں تک، مختلف الفاظ وعبارات، مختلف انداز واسالیب میں، حمد وثنا، سپاس وستائش اور شکر ومدحت کے مراتب ادا کیے گئے ہیں۔جن میں ''توحید شناسی'' کے اسباق بھی مضمر ہیں۔اور جن سے دعا کی شان میں، متن کے شکوہ میں اور اس عرضِ حال کے حسن وجمال میں بھی بے انتہا اضافہ ہوتا ہے۔

یہ فقرہ بطورِ خاص ''توحیدِ ذات'' یا ''توحیدِ صمدی'' کے اقرار و بیان پر مشتمل ہے۔

''علمِ توحید'' قرآنِ مجید سے حاصل ہونے والے علوم میں سب سے اَہم ،سب سے مُہم ،سب سے خاص ،سب سے اشرف اور ساتھ ہی سب سے اَدَق اور مشکل علم ہے بلکہ ''توحید'' ہی قرآنِ مجید کا اساسی اور بنیادی موضوع ہے۔اس لیے اس موضوع سے سرسری طور پر نہیں گزرا جاسکتا۔

ظاہر ہے کہ توحید کے حقیقی مراتب تو اپنی جگہ پر ہیں ،اقرارِ توحید کے مراتب بھی گوناگوں ہیں! ایک مرتبہ وہ ہے جو ہمارے 'عوام کالأنعام' کا مرتبۂ اقرار

ہے ،اور ایک مرتبہ وہ ہے جو متوسط درجے کے بافہم مومنین کا ہے جبکہ ایک مرتبۂ اقرار وہ ہے جو خاصانِ خدا کا ہے کہ خود اس مرتبۂ اقرار کا سمجھنا عوام الناس وعامۃ الناس بلکہ اکثر علمائے ظاہر پرست تک کے لیے سخت دشوار ہے!

''حقیقتِ توحید''

''حقیقتِ توحید'' ایک شے ہے ،اس کا فہم وادراک ،اس کی معرفت ،اس کا یقین ،اس کا شہود اور کشف دوسری شے ہے اور پھر اس کا اقرار و بیان تیسری شے ہے۔اور ان تمام حقائق ومراتب کے بے شمار مراتب ہیں۔ بلکہ مشہور قول ہے کہ ''الطرق الی اللہ بعدد انفاس الخلائق'' [۱] ''اللہ تک پہنچنے کے راستے اس کے مخلوقات کی تعداد کے برابر ہیں''۔ یہ حدیث نہیں ہے، کسی خدا پرست فلسفی کا قول ہے، لیکن ہے بہت معنی خیز۔ میں نے یہاں پر اس کا بہت سطحی سا ترجمہ کردیا ہے۔ اس قول کے پیش کرنے کا مقصد یہ عرض کرنا ہے کہ حقیقتِ توحید کے باب میں اتنی مختلف تعبیریں ہیں جن کا احاطہ اس وقت ممکن نہیں ہے۔ پھر میرے پیشِ نظر حضرت امیر المومنین علیہ السلام کا ایک ارشاد ہے، فرماتے ہیں:

''اِنَّ كَلاَمَ الْحُكَمَاءِ اِذَا كَانَ صَوَاباً كَانَ دَوَاءً وَ اِذَا كَانَ خَطَاً كَانَ دَآءً'' حکماء یا فلاسفہ کی بات اگر فی الواقع وفی نفس الامر درست ہوتی ہے تو دوا ہے۔اور اگر غلط ہوتی ہے وہ مرض بن جاتی ہے!

[۱] ملک الشعرا خاقانیِ ہند استاذ شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے اس جملے سے استفادہ کرتے ہوئے کیا اچھا مضمون پیدا کیا ہے۔ان کا شعر ہے:

نفس کی آمد و شد ہے نمازِ اہلِ حیات
جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو دیوانِ ذوقؔ ۲۹۲

اس ارشادِ علوی کا مفہوم ظاہر ہے کہ فلسفی کو انتہائی تحقیق اور حصولِ یقین کے بعد لب کشائی کرنی چاہیے اور فلاسفہ کے اقوال پڑھنے اور سننے والوں کو بھی بیحد غور و تامل کے بعد اسے قبول کرنا چاہیے۔ بہر حال میرا مُبنیٰ، میری بنیادِ فکر یہ ہے کہ اس باب میں قرآن مجید، احادیث نبویؐ اور ارشاداتِ ائمہ دینؑ ہی پر دار و مدارِ بحث رکھنا چاہیے۔ کہ ''قرآن'' اور یہ ترجمانانِ وحی و فرقان بطورِ خاص ''بیانِ توحید'' کے ذمہ دار، عہدیدار اور متکفّل ہیں۔ یہی علمِ توحید کے حقیقی سَرچشمے ہیں۔ اِن کے علاوہ کسی اور چشمے سے جُرعہ کشی، کسی دوسرے ماخذ سے کچھ حاصل کرنا، کسی بھی طرح خطا سے مامون اور خطرے سے خالی نہیں ہے۔

قرآنِ مجید کے اکثر آیات سے معارفِ توحید مستفاد ہوتے ہیں۔ لیکن بعض مقامات زیادہ اَہم اور ''کلیدی'' حَیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً

(ا) سورۂ مبارکۂ کہف کی آخری آیت، جس کے متعلق تفسیر درِّ منثور میں طبرانی اور ابنِ مردویہ کی تخریج کردہ یہ حدیث نقل ہوئی ہے کہ ابو حکیم نے کہا: حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **لَولَم یَنزِل علیٰ اُمّتی اِلّا خاتِمَۃَ سورۃِ الکھفِ لکَفَتھُم۔**

''اگر میری اُمّت پر کچھ بھی نازل نہ ہوتا سوائے خاتمۂ سورۂ کہف کے تو یہی آیت اُن کے لیے کافی ہوتی!''

اَب آیت کی تلاوت فرمائیں:

''قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُوحَیٰ اِلَیَّ اَنَّمَا اِلٰھُکُمْ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ کَانَ یَرْجُوا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلاً صَالِحاً وَّلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖ

اَحداً۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت ''توحیدِ ذاتی وصمدی'' اور ''توحیدِ عبادی'' کے مضامین کے علاوہ بھی اپنے ایک ایک حَرف میں ایک ایک جہانِ معنی چھپائے ہوئے ہے۔

(۲-۳) توحید کے باب میں قرآن مجید کے دو اور مقامات ایسے ہیں کہ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا ارشاد ہے: ''چونکہ خداوند عالم کو علم تھا کہ آخری زمانہ کے لوگ دقیق اور عمیق فکر و نظر کے حامل ہوں گے اسی لیے پروردگار نے سورۂ'' قل ھو اللہ احد ''اور سورۂ حدید کی ابتدائی آیتیں،'' وھو علیم بذات الصدور '' تک نازل فرمائیں۔ اور جو بھی اِس کے آگے فکر کرے گا وہ ہلاک ہوگا''۔

اس روایت سے چند نکات کا استفادہ ہوتا ہے۔ اولاً یہ کہ وہ حقیقت توحید جو فطرتِ انسانی میں خمیر کی گئی ہے اس کا ادراک، اس کا اکتشاف یا انکشاف اور اس کے اقرار و بیان کی جو سطح نزول قرآن تک تھی، نزول قرآن (سورۂ توحید اور بعد کے دوسرے آیات مثلاً مطلعِ سورۂ حدید وغیرہ کے نزول) کے بعد وہ سطح بقدرِ آسمان بلند ہوگئی ہے۔ (اسی لیے میں نے علم ''توحید'' کو ان علوم میں شمار کیا ہے جو عالم بشریت کو بہ فیضِ قرآن نصیب ہوئے ہیں۔ ورنہ سبھی انبیاء اقرارِ توحید ہی کا پیام لے کر آئے تھے!)

ثانیاً: اس روایت سے حقیقتِ توحید کے باب میں فکر و تعمق کی فی الجملہ

اجازت بھی مستفاد ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ حکمائے اسلام نے قرآن مجید کے آیات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیز ائمۂ دین علیہم السلام کے ارشادات کی روشنی میں حکیمانہ تفکر کا حق ادا کرنے کی کوششیں بھی کی ہیں۔ اور یقیناً ایسے ہی حکماء کے اقوال مریضانہ ذہن و فکر رکھنے والوں کے لیے دوا کی حیثیت اور شفا کی تاثیر رکھتے ہیں۔

اور ایسے ہی حکماء کے بارے میں امام زین العابدین علیہ السلام کا ارشاد ہے: ''هلک من ليس له حکيم يرشده '' (جسے کوئی مستحکم دانائی رکھنے والا (حکیم) راہنما میسر نہ ہوگا وہ ہلاک ہوگا!)۔

(کشف الغمہ ط۱۲۹۴ص۲۰۹)

یہ ظاہر ہے کہ ہر کس و ناکس اس موضوع کی تاب نہیں لاسکتا، حکیم سنائی غزنوی ؒ کی بیت ہے۔

بارِ توحید ہر کسی نکشد
طَعمِ توحید ہر خسی نہ چشد

یا مشہور صوفی شاعر عطار کا شعر ہے۔

اُو بہ سر ناید زخود آنجا کہ اوست
کے رسد عقلِ وجود آنجا کہ اوست

اسی طرح حکیم مشرق شیخ الرئیس ابن سینا نے ''الاشارات والتنبیهات'' میں اشارہ کیا ہے اور کیا خوب افادہ کیا ہے:

[اشارة : جَلَّ جنـاب الحق عن أنْ يَكونَ شريعةً لِكُلِّ

وارِدٍ أو يطَّلِعَ عليه الَّا وَاحِدٌ بَعْدَ وَاحِدٍ]

حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ اس سے بہت بلند ہے کہ وہ ہر راہ رو کے لیے چشمۂ سرِ رہ گزار یا تماشا گہ راز بن جائے، مگر یہ کہ ہمیشہ ''ایک'' کے بعد ''ایک'' بلند سے بلند تر چشمِ اخلاص رکھنے والے اس کی جناب میں ضرور بار پاتے رہے ہیں...''

معصومین کی تو بات ہی اور ہے۔ وہ تو ہر حال میں ''اسی کے ہیں'' اور اپنی ہر ہر سانس اس کے لیے وقف کر چکے ہیں۔

اُن کا پیکر ہے پیکر قرآن
اُن کی ہر سانس ایک آیت ہے!

ان کے ارشادات سے فائدہ اٹھا کر اٹھنے والوں میں بھی ایسے مل جاتے ہیں کہ صدیوں تک کے انسانوں کی ذہنی اور فکری، عملی اور نفسی تربیت اور ہدایت کا سامان کر جاتے ہیں، ایسے ہی افراد میں ایک جناب خواجہ نصیرالدین محمد بن حسنِ طوسی بھی گزرے ہیں، جنہیں دنیا ''محقق طوسی'' کے نام سے جانتی ہے۔ اور ایک جناب صدرالدین محمد بن ابراہیم شیرازی جنہیں لوگ ملا صدرا کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

جناب محقق طوسی نے علمِ کلام میں اور جناب ملا صدرا نے حکمت و عرفان میں وہ آثار و نظریات اور کتابیں یادگار چھوڑی ہیں جو کسی بھی سنجیدہ طالب علم کو قرآن و حدیث کے سرمائے کے بعد تمام دنیا کے فلسفے اور علوم سے بے نیاز کر دینے کے لیے کافی ہیں۔

جن کے لیے توحید ایک ''مسئلہ'' ہو ان کے لیے علم کلام کا سہارا لینا ضروری ہو جاتا ہے، اور جن کے لیے حقیقتِ توحید ایک طلب، ایک چاہت، ایک عشق اور ایک وجدانی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہے ان کے لیے حکیمانہ اور عرفانی مطالب خنکیِ چشم و دل بن جاتے ہیں۔

علم کلام میں اثباتِ باری تعالیٰ کے لیے ''وجود'' کی تقسیمِ سہ گانہ (وجودِ واجب، وجودِ ممکن اور وجودِ ممتنع) بطلانِ دَور و تسلسل اور اثباتِ حدوثِ عالم وغیرہ کے مقدمات طے کیے جاتے ہیں، جناب خواجہ کی مؤجز اور متین فلسفیانہ نثر نے اپنے مثالی اسلوب میں ان تمام دلائل و مقدمات کو اس طرح پیش کیا ہے:

''الوجود ان كان واجباً فهو المطلوب و اِلا اِستلزمهُ لاستحالة الدور والتسلسل''

''وجود اگر واجب ہے تو وہی مطلوب ہے ورنہ (کوئی بھی وجودِ ممکن و موجودِ ممکن) وجودِ واجب کو مستلزم ہے کیونکہ دور و تسلسل تو محال ہی ہیں!''

ہم صرف حوالے کے طور پر یہ جملے یہاں ذکر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے ہیں ورنہ اِن کی تفصیل حدِّ کتاب سے مُتجاوز ہو جائے گی۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ رب الارباب، خالق کائنات، معبود برحق عز اسمہ وجل شانہ کے وجود اور اس کی وحدانیت پر دلائل کی کمی نہیں فطرتِ پاک اور ذہن چالاک یا طبع سلیم کے لیے:

ہر گیاہی کہ از زمین روید
وحدہ لاشریک لہ گوید

تقریباً اسی مفہوم میں عربی کا یہ شعر بھی بہت مشہور ہے۔

وفی کل شئٍ لہ آیۃ تدل علی انہ الواحد

حیف ہے کہ اس شعر کو تو نقل کیا جائے لیکن عربی کا وہ مصرع نہ دہرایا جائے جسے نبی کریمؐ نے یہ کہہ کر داد دی تھی کہ **''اصدق كلمة قالها شاعر قول لبيد''** ''سب سے سچا قول جو کسی شاعر نے کہا ہے وہ لبید کا قول ہے'' (۱)

''آلا كُلُّ شيءٍ ما خلا الله باطل''

''آگاہ ہو ہر شئ ہے بجز حق، باطل''

جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر اپنی ایک رباعی بھی سُناتا چلوں:

ہے خیر سے معمورۂ ہستی آباد
معدوم ہے امکان میں شر کی بنیاد
لبریز ہے توحید کے مضمون سے علم
ہے جہل فقط دلیلِ شرک و الحاد!

☆☆☆

(۱) لبید بن ربیعہ عربی کے ان سات بڑے شاعروں میں سے ہیں جنہیں اصحاب معلقات کہتے ہیں۔ یعنی جن کے قصیدے مشہور ہے کہ خانۂ کعبہ کی دیوار پر آویزاں کیے گئے تھے۔ (امرؤالقیس، طرفہ بن عبید بکری، زہیر بن ابی سلمٰی، لبید، عمرو بن مکتوم، عنترہ بن شداد، حارث بن حلزہ)۔ ان میں سے سب سے زیادہ عمر لبید ہی نے پائی اور زمانۂ اسلام کو بھی درک کیا، مشرف بہ اسلام ہوئے، اور بہترین مسلمانوں میں ثابت ہوئے، کہتے ہیں کہ زمانۂ اسلام میں انہوں نے قرآن مجید کی شانِ فصاحت و بلاغت کے پیش نظر شعر گوئی ترک کردی تھی اور اس

الحمد لله اِذْ لم يأتِنى أجلى حتىٰ كسانى من الاسلام سربالا

''اس معبود کا شکر جس نے مجھے اُس وقت تک موت نہیں دی جب تک کہ مجھے لباس اسلام عطا نہیں فرمایا''۔

...جو مصرع اوپر درج کیا گیا وہ غالباً اسلام قبول کرنے سے قبل ہی اپنی فطرت سلیمہ کی ترجمانی میں کہا، اس کا پہلا مصرع یہ ہے

ع وكل نعيم لامحالة زائلُ

اور اس کے بعد کا شعر یہ ہے۔

سوىٰ جنة الفردوس اِن نعيمها ☆ يدوم و ان الموت لا بد نازل

اردو کے مردِ قاموس، عظیم دانشور ادیب، نقاد، مبصر، مستبصر، اور کلاسیکی طرز کے شاعر مولانا امداد امام اثر کا بھی ایک شعر یاد آ گیا ہے سنتے جایئے:

محتاجِ دلائل نہیں اثباتِ الٰہی
اے فلسفی رکھ چھوڑ براہینِ حِکَم کو!

علم کلام کے بعض مقدمات اور دلائل کی طرف اشارہ ہو چکا، دلائلِ حکمت اور براہینِ عرفان میں سب سے اہم ''برہانِ صدّیقین'' ہے جسے جناب ''ملا صدرا'' (صدرالدین شیرازی) نے اپنے متعدد مصنفات میں بار بار پیش کیا ہے، منجملہ ان مقامات کے ان کی ایک عبارت یہ ہے:

''لَولَم تَکُن حقیقةُ الوجودِ موجودة لم یکن شیٌ من الاشیاء موجوداً، لکِنَّ اللازم باطلٌ بدیهةً فکذا الملزوم''

''اگر حقیقت وجود موجود نہ ہوتی تو کوئی بھی شئی موجود نہ ہوتی، لیکن یہ لازم بدیہی طور پر باطل ہے (کہ عالم اشیاء ہمارے سامنے موجود و معمور ہے) ناچار ملزوم بھی باطل ہے''۔

یہ بھی میں نے صرف حوالے کے طور پر ذکر کر دیا اس کی بھی شرح کا موقع نہیں ہے۔ اب باب ''توحیدِ صمدی'' کے باب میں ایک روایت حضرت امام حسینؑ سے نقل کر کے اس بحث کو ذرا اور آگے بڑھاتے ہیں۔ حقیقتِ توحید کے سمجھنے اور سمجھانے کے لیے سورۂ اخلاص (سورۂ قل ھو اللہ احد) کی اہمیت کی طرف زبان معصوم سے اشارہ گزر چکا۔ اس سورۂ مبارکہ میں لفظ ''صمد'' کے معنی پر علماء نے بہت بحثیں کی ہیں۔ علامہ صدوقؒ نے اپنی کتاب ''التوحید'' میں وہب ابن وہب

چراغِ راہ

قرشی سے بہ روایت حضرت امام صادق علیہ السلام یہ واقعہ اور یہ خط نقل فرمایا ہے کہ اہل بصرہ نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں لفظِ ''صمد'' کے معنی دریافت کرنے کے لیے لکھا تو آپ نے اُن کے جواب میں لکھا:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اَمّا بعد! فلا تخوضو فی القرآن و لا تجادلوا فیه، و لا تتکلموا فیه بغیر علم! فقد سمعت جدی رسول الله صلی الله علیه وآله یقول: من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوّأ مقعده من النار. واَن الله سبحانه فسر الصمد فقال: الله احد. الله الصمد، ثم فسر لم یلد ولم یولد و لم یکن له کفواً احد.

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امّا بعد! تم لوگ قرآن میں غوطہ زنی نہ کرو اور نہ اس میں جھگڑو، اور ''علم'' کے بغیر کلام نہ کرو، کہ میں نے اپنے نانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سُنا: جو قرآن کے بارے میں بغیر علم کے کلام کرے وہ دوزخ میں اپنی جگہ بنا لے۔ اللہ سبحانہ نے لفظِ صمد کی (خود ہی) تفسیر کر دی ہے، اُس نے فرمایا: اللہ احد (یگانہ) ہے، اللہ صمد (بے نیاز مطلق) ہے۔ پھر اس کی تفسیر کی کہ نہ وہ جنم دیتا ہے نہ اس نے جنم پایا، اور اس کا کوئی ہمسر نہیں۔

توحید کے مراتب میں توحیدِ ذات، توحیدِ صفات، توحیدِ افعال اور توحیدِ عبادت کے عناوین پر بار بار اشارے آتے رہیں گے لیکن تبرکاً اس مقام پر توحید عبادی کے باب میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد مبارک نقل کرنا

شرح دعائے افتتاح

چاہتے ہیں۔

''درِّ منثور میں بہ سندِ متصل شداد بن اَوس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

'' مَنْ صَلّٰى يُرَآئِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَآئِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَآئِيْ فَقَدْ اَشْرَكَ ثُمَّ قَرَأَ : فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلاً صٰلِحاً وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَداً''

جس نے دِکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا اور جس نے روزے میں ریا کو دخل دیا اس نے شرک کیا اور جس نے زکاۃ دینے میں ریا سے کام لیا اس نے شرک کیا، یہ فرمانے کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ''جو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھتا ہو اسے چاہیے کہ وہ نیک اعمال انجام دے اور اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرے۔''

☆☆☆☆☆

(۴)

جمالِ توحید

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بِجَمِيعِ مَحَامِدِهٖ كُلِّهَا عَلٰى جَمِيعِ نِعَمِهٖ كُلِّهَا

یعنی ''تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے اس کے تمام اوصاف حمیدہ کے ساتھ، اس کی تمام نعمتوں پر'' یا چاہیے تو یوں کہہ لیجیے:

''تمام شکر اسی معبود کا اس کی تمام اچھائیوں کے ساتھ اس کی تمام نوازشوں پر!''

☆☆☆

اس جملے میں کوئی مشکل، غریب یا نامانوس لفظ نہیں ہے۔ بلکہ صرف اردو زبان جاننے والوں کے لیے بھی کوئی اجنبی لفظ نہیں ہے۔ ترکیب اور اضافتوں کا سحرِ حلال ہے جو کسی بھی عربی یا عجمی کو مسحور کر سکتا ہے۔

''الحمد'' تمام تعریفیں، ساری ستائش، سارا شکر!

''لله'' معبود برحق کے لیے یا معبود کی!

''جمیع'' سب، تمام، کل،

''بجمیع'' سب کے ساتھ یا سب کے ذریعہ،

''محامِد'' یہ ''محمدة'' کی جمع ہے، یہ واحد (محمدة) تو اردو میں مستعمل نہیں ہے لیکن اس کی جمع محامد ہماری ادبی اور شعری زبان کا حصہ ہے۔ محامد یعنی خوبیاں، نیک خصلتیں، اوصاف حمیدہ، اور فیلسوف نامی، عارف گرامی مولانا ھادی سبزواری کا یہ شعر بھی حرز جان رہے تو بہت اچھا ہے:

يَا وَاهِبَ الْعَقْلِ لَكَ الْمَحَامِدُ

اِلٰى جَنَابِكَ انْتَهَى الْمَقَاصِدُ

''محامدہٖ'' میں ''ہ'' ضمیرِ متصل، مضاف الیہ ہے۔ اُس کی خوبیاں، اُس کے صفات۔

''نِعَمِهٖ'' میں بھی یہی ''ہ'' ہے، اور لفظ نِعَم نعمت کی جمع ہے۔ یہ واحد اور جمع دونوں اردو میں خوب مستعمل ہیں، 'ناز و نِعَم' کی ترکیب ہمارے محاورات اور روزمرہ کا جز ہے۔

☆☆☆

اس فقرے میں توحیدِ صفات اور توحیدِ افعال کا اعتراف اور بیان ہے۔ بابِ توحید میں صفات ہی کی بحث ''جانِ سخن'' کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ ایک علّۃ العلل اور واجبُ الوجود کا مان لینا دہریین یا ملحدین کے لیے کوئی مشکل مسئلہ نہیں ہے۔ ساری بحث ان صفات کے ساتھ متصف ذاتِ واجب کو تسلیم کرنے میں ہے، جن صفات کو صفاتِ ثبوتیہ اور صفاتِ سلبیہ کے عناوین کے ذیل میں بیان کیا جاتا ہے ـــــ برسبیلِ تذکرہ ـــــ اسی مقام پر یہ بھی عرض کر دوں کہ یہی صورتِ حال عقیدۂ آخرت و معاد کی ہے۔ محض اختتامِ دنیا کا قائل ہونا الگ بات ہے۔ بہت سے اہلِ دانش، سائنس داں اس بات کے قائل ہیں، بلکہ داعی ہیں کہ ایک وہ انتہا بھی ہونے والی ہے جب یہ سلسلۂ زمان ختم ہو جائے گا اور یہ بساطِ مکان الٹ جائے گی، یہ خاک زار غبار ہو کر نابود ہو جائے گا۔ لیکن دین ''نابودیِ محض'' کے تصور کے برخلاف مخصوص حکمتوں، مصلحتوں اور مختلف اوصاف و خصوصیات کے حامل سرو سامان بقا و دوام کے ساتھ آخرت و معاد کا جو عقیدہ پیش کرتا ہے لوگوں کو

اس کے ماننے میں تامل ہے۔ بہر حال یہ بحث دعا کے آئندہ فقروں میں آئے گی۔

صفات باری تعالیٰ کے بیان میں کلامی اور عرفانی تعبیرات مختلف ہیں۔ اور دونوں ہی نقاطِ نظر سے توحیدِ صفات اور توحیدِ افعال دونوں ہی بحثیں بہت وسیع الذیل ہیں۔

توحیدِ صفات یا صفاتِ حضرت اَحدیّت کے بارے میں بیشتر کلامی مباحث کا بہترین اور مختصر ترین بیان خواجہ نصر الدین محقق طوسیؒ کی تجرید کی عبارتیں ہیں۔

''وجود العالم بعد عدمه ينفى الايجاب''

''عدم کے بعد عالم کا وجود پروردگار کے قادر و مختار ہونے کی دلیل ہے''

''وعمومية العلة تسلزم عمومية الصفة''

''علت کا عام اور تمام ممکنات کو شامل و محیط ہونا اس کی صفتِ قدرت کی عمومیت و شمولیت کی دلیل ہے۔''

''والاحكام والتجرد واستناد كل شئ اليه دلائل العلم''

''اور اِس کائنات کا استحکام اور ذات باری تعالیٰ کا زمان و زمانیات، مکان و مکانیات سے منزہ ہونا اور ہر شئے کی علت ہونا اس کے علم کی دلیلیں ہیں۔''

''وكل قادر وعالم حيٌّ بالضرورة''

''اور ہر قادر و عالم کا ذی حیات ہونا بدیہی ہے۔''

ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں نہایت محکم اور مفصل استدلال چھپے

ہوئے ہیں۔ جن کو مشروحاً بیان کرنے کی نہ یہاں ضرورت ہے نہ گنجائش۔ صرف حوالے کے لیے چند جملے نقل کیے گئے۔ تفاصیل کے طلب گار متعلقہ کتابوں سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ بہت سادہ طور پر معلوم ہے کہ ''صفاتِ ثبوتیہ'' یعنی وہ صفتیں جو ذات باری میں پائی جاتی ہیں اور عین ذات ہیں اور زائد بر ذات نہیں ہیں وہ عبارت ہیں قدرت، علم، حیات، ارادہ، تکلم، صِدق اور اس کے قدیم و سرمدی ہونے کے صفات سے!

اور اسی طرح صفات سلبیہ یعنی وہ صفتیں جو ذات باری میں نہیں پائی جاتیں، وہ یہ ہیں کہ پروردگار زمان و مکان کا محتاج نہیں ہے کہ وہ خود زمان و مکان کا خالق ہے۔ وہ مرکب نہیں ہے، وہ جسم نہیں رکھتا، وہ شریک نہیں رکھتا، وہ مثل و نظیر نہیں رکھتا، وہ حلول اور اتحاد سے بری، بلند اور منزہ ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں، اس کی ذات پاک محلِّ حوادث و قابلِ تغیرات نہیں ہے۔ دعا کے آئندہ فقروں میں بعض صفاتِ ثبوتیہ اور بعض صفاتِ سلبیہ پر بطور خاص روشنی ڈالی گئی ہے، اُن فقروں کے ذیل میں بھی کچھ تشریح آئے گی۔

انسانی ادراکات اور معلومات کی اپنی محدودیتیں ہیں۔ انسان کتنی ہی آفاقی، ہمہ گیر و ہمہ جہت نگاہ کیوں نہ پیدا کر لے اُس کے بنائے ہوئے مرقعے ناقص اور ناتمام ہی رہیں گے اور اس کی تعبیریں نارسا ہی رہیں گی۔ وہ بھی خصوصاً جب بات ذات و صفات خداوندی سے متعلق ہو۔ یہی سبب ہے کہ صفات باری تعالیٰ کے بیان میں علمِ کلام کی روش سے علمِ عرفان کی راہ مختلف اور ممتاز ہے۔ عرفاء

کی زبان میں صفاتِ ثبوتیہ کو صفاتِ جمالیہ اور صفات سلبیہ کو صفات جلالیہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور عرفانی شاعری کی زبان تو اللہ کی پناہ!

غالبؔ کے اسی شعر سے اندازہ کر لیجیے۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ہاتفؔ کے یہ اشعار بھی آپ کے کانوں میں پڑے ہوں گے:

ہاتفؔ اربابِ معرفت کہ گہی
مست خوانندشان و گہہ ہشیار
از دف و چنگ و مطرب و ساقی
ازمی و جام و ساقی و زُنّار
قصد ایشاں نہفتہ اسراریست
گہ بہ ایما کنند گاہ اظہار

مشہور شاعرِ حکمت وعرفان شیخ محمود شبستری نے ''گلشن راز'' میں بصورت سوال وجواب عرفا کے تعبیرات کی وضاحت ان ابیات میں فرمائی ہے:

چہ خواہد مردِ معنی زاں عبارت
کہ دارد سوے چشم و لب اشارت
چہ جوید از رُخ و زلف و خط و خال
کسی کاندر مقامات است واحوال

ہرآن چیزی کہ در عالم نہان است
چو عکسی زآفتاب آن جہان است
جہاں چوں خط و خال و زلف و ابروست
کہ ہر چیزی بہ جائے خویش نیکوست
تجلی گہ جمال و گہ جلال است
رخ و زلف آں معانی را مثال است
صفاتِ حق تعالیٰ لطف و قہراست
رخ و زلفِ بتاں را زان دو بہر است
چو محسوس آمد ایں الفاظ مسموع
نخست از بہر مسموع است موضوع
ندارد عالمِ معنی نہایت
کجا بیند مر اورا چشمِ غایت
معانی ہرگز اندر حرف ناید
کہ بحر بی کراں در ظرف ناید
ہرآن معنی کہ شد از ذوق پیدا
کجا تعبیر لفظی باید اورا
چوں اہلِ دل کند تفسیر معنی
بہ مانندی کند تعبیرِ معنی

☆☆☆

عرفاء کی زبانِ اظہار و بیان کے بارے میں شیخِ شبستری کا بیان اپنی جگہ پر، اردو کے سعدی ہمارے مولانا الطاف حسین حاؔلی نے بھی اپنے انداز میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ آخر عرفاء کو ایسی تعبیریں اختیار کرنے کی کہ مثلاً ''وحدتِ ذات مطلقہ'' کو ''خال'' - اجسام سے تعلقِ ارواح کے ظہور کو ''خط'' - فیاضِ مطلق کو ''ساقی'' اولیا اور عرفاء کو ''رند'' عالمِ صفات کو ''زلف'' وغیرہ کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ حاؔلی نے کہا ہے

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی
بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی!

بہر حال انسانی فہم و ادراک کی نارسائی اور پھر اقرار و بیان کی عاجزی اور فی الجملہ تعبیرات کی کوتاہیاں بہت سوں کے لیے ذات و صفات کے بارے میں گوناں گوں تشکیکات کا سبب بھی بن جاتی ہیں۔ سوچنے والے طرح طرح کے مشکلات سے دوچار ہوتے ہیں اور مہلکوں میں مبتلا۔ اردو کے ایک فکر مند شاعر جمیل مظہری کے یہ شعر مجھے اکثر یاد آتے ہیں۔

صفات بخشے مکان بخشے جگہ جگہ اک حرم بنایا
ہماری صورت گری نے آخر خدا کو بھی اک صنم بنایا
حرم کو بھی بتکدہ سمجھنا ہے دوسری منزل ارتقا کی
وہ پہلا زینہ شعور کا تھا کہ بت کدے کو حرم بنایا

یہی وہ شاعر ہے جس نے ایک موقع پر یہ بھی کہا ہے کہ:

پرکھ چکا ہے تجھے بارہا شعور مرا
مذاق اڑانہ بہت اے حجابِ نور مرا

تاہم یہ ذات و صفات کی بحث ہے، بہت نازک، بے حد لطیف ساتھ ہی بے حد شیریں:

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

معرفتِ ذات و صفات کے باب میں انسانی تعبیروں کی نارسائی مسلم ہے۔ اسی لیے سب سے بہتر صورت یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ آیات قرآنی پر، خطیب قرآں حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات پر اور ائمہ دین ، اولیائے معصومین علیہم السلام کے فرمودات پر تکیہ کیا جائے۔ اسی کا اہم حصہ یہ دعائیں بھی ہیں۔ معصومین علیہم السلام سے منقول دعاؤں کے کلمات ذات و صفات کے بارے میں بہترین اور کامل ترین تعبیریں مہیا کرتے ہیں۔ جن کی لفظی و معنوی تلاوت سے ہر طالب کو جلوۂ شاہدِ مطلوب میسر آسکتا ہے۔ اس باب میں ایک اور موثر ترین اور موثق ترین وسیلہ خود اسمائے باری تعالیٰ عز اسمہ وجل شانہ کے معانی میں غور و خوض بھی ہے۔ کہ یہ اسماء بہترین وسیلۂ معرفت بھی ہیں اور ذریعۂ تقریب بھی! بہت ممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد اس معنی کی طرف بھی ناظر ہو کہ:

''ان للہ تبارک و تعالیٰ تسعۃ و تسعین اسما....من

احصاها دخل الجنة"

"اللہ تبارک وتعالیٰ کے ننانوے نام ہیں جس نے ان کا احصا کرلیا وہ جنت میں داخل ہوگیا"۔

کیا بعید ہے کہ یہاں "جنت" (الجنۃ) کا اطلاق بر سبیل استعارہ "جنتِ ذات و بہشتِ صفات" ہی پر کیا گیا ہو۔

"جنتِ ذات"! کہ ﴿فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی﴾ جس کا دعوت نامۂ ربانی قرآن مجید کے اہم ترین پیغامات اور مقاصد میں شامل ہے!

☆☆☆☆☆

(۵)

جلالِ توحید (۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَا مُضَادَّ لَهُ فِي مَلْكِهِ وَ لَا مُنَازِعَ لَهُ فِي أَمْرِهِ!

ساری تعریف اسی معبود کے لیے ہے نہ جس کی پادشاہی میں کوئی اس کی مخالفت کرنے والا ہے اور نہ اس کے نظام میں کوئی اس سے جھگڑنے والا ہے!

اس جملے میں آنے والے ''مُضادّ'' اور ''مُنازِع'' کے الفاظ اگرچہ اردو میں استعمال نہیں ہوتے پھر بھی ان کے مادّوں سے مشتق الفاظ کثرت سے استعمال ہوتے ہیں۔ ضِد، تضاد، نزاع اور مُنازعت (بمعنی جھگڑا، تکرار، قضیہ، مقدمہ وغیرہ) ہماری زبان میں موجود ہیں۔ اِن مثالوں کے بعد آپ کو مُضاد اور منازع بہت اجنبی نہیں لگیں گے۔ مضادّ، ضد (مضاعف) سے ثلاثی مزید کے باب مفاعلہ (فاعل یُفاعل، ضادّ یضادُّ) سے اسم فاعل ہے۔ جو ظاہری شکل میں فاعل اور مفعول دونوں معلوم ہوتا ہے، مضادّ (مضادِد) فاعل ہے۔ مضادّ (مضادَد) مفعول ہے۔

مُنازِع - بھی اسی باب مفاعلہ سے ہے، البتہ اس کا مادّہ (ن ز ع) صحیح و سالم ہے (مضاعف نہیں ہے)۔

اِس لفظی ادھیڑ بن سے نکل کر منطوق اور مفہوم پر غور کیجیے۔

یہ فقرہ ''توحیدِ تنزیہی'' کے اعتراف و بیان میں ہے۔ توحید تنزیہی کے بھی مختلف جہات ور مراتب ہیں۔ ذات میں تنزیہہ، صفات میں تنزیہہ، افعال میں تنزیہہ۔

زیادہ سلیس اور سادہ زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ توحید تنزیہی کے مباحث ''صفاتِ سلبیہ'' کے بیان سے تعلق رکھتے ہیں۔ صفاتِ سلبیہ جنہیں علمِ عرفانِ نظری یا علمِ تصوفِ اسلامی میں صفاتِ جلالیہ کہتے ہیں۔ میری نظر میں تو اِن تمام مَباحث کا بہترین اور مختصر ترین عرفانی بیان مَولیٰ الموحدین امیر المؤمنین علیہ السلام سے منقول دعائے صباح کا یہ چھوٹا سا فقرہ ہے:

''یَامَنْ تَنَزَّہَ عَنْ مُجانَسَةِ مَخْلُوْقَاتِهٖ''

غالب نے اپنے فارسی منظوم ترجمے میں اس فقرے کا ترجمہ ایک مصرع میں کیا ہے

ع گشت از ہم جنسیِ عالم بَری

پورا شعر یہ ہے۔

ای کہ ذاتش را بذاتش رہبری
گشت از ہم جنسیِ عالم بَری

جو دعائے صباح کے اس پورے فقرے کا ترجمہ ہے:

''یَامَنْ دَلَّ عَلٰی ذَاتِهٖ بِذَاتِهٖ وَتَنَزَّہَ عَنْ مُجَانَسَةِ مَخْلُوْقَاتِهٖ''

جو لوگ عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا مذاق رکھتے ہیں انہیں شعرِ غالب کی مغلوبیت پر انگشت بدنداں ہونے کا پورا حق ہے۔ کہاں وہ عربی کی عبارت اور اس کا ظاہری اور باطنی، لفظی اور معنوی جمال وجلال اور کہاں یہ فارسی ترجمہ تاہم، ترجمانی کی کوشش کا ثواب اپنی جگہ ضرور محفوظ ہے اور وہی سب کا گوہرِ مقصود ہے۔ ہم کون سا بڑا حق ادا کردیں گے اس کے ترجمے کا۔ مولا کے ارشادات کا مفہوم اپنی سادہ زبان میں یہ ہے کہ وہ اپنے مخلوقات میں پائی جانے والی کسی بھی خصوصیت سے متصف نہیں۔ اور مولا کے ارشادات ہی کی روشنی میں اس عاجز نے بارہا منبروں سے بابِ توحید میں عرض کیا ہے اور لکھا بھی ہے کہ ''وہ اپنے مخلوقات کی کسی بھی خصوصیت کا محتاج نہیں ہے جبکہ اس کے مخلوقات اس کی ایک ایک صفت کے محتاج ہیں''، اور نہ صرف یہ کہ وہ اپنے مخلوقات کی صفتوں یا خصوصیتوں کا محتاج نہیں ہے بلکہ اُن سے ''مُنَزَّہ'' پاک اور بلند ہے اور اپنی ایک ایک صفت اپنے مخلوقات کو حسبِ ظرف وحسبِ طلب عطا فرماتا رہتا ہے، وہ اُس کی عظمت ہے اور یہ اُس کا علو!

دعائے افتتاح کا زیرِ غور فقرہ ''تنزیہہ ذات'' کے بیانات میں سے ہے۔

اس بیان کی اہمیت اور حقیقت اس وقت تک اچھی طرح سامنے نہیں آسکتی جب تک کہ اس پر غور کرنے والے کی نظر میں صفاتِ سلبیہ سے متعلق کلامی مباحث کے ساتھ ساتھ عالمی ادب کے وہ شاہکارِ فن پارے نہ ہوں جن پر ملحدوں اور مشرکوں کے اربابِ نقد ونظر کو بڑا ناز ہے۔ جیسے بطورِ خاص ''یونانی رزمیے''۔

ان رزمیوں کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان میں جو رزم و پیکار ہے وہ نہ

(۲)

جلالِ توحید (۲)

زمینی حقائق پر مبنی ہے، نہ فی الواقع و فی نفس الامر ایسی کوئی جنگ و پیکار ہوئی ہے، جسے ان لوگوں نے نظم کیا ہو، بلکہ یہ سب کے سب یا ان میں سے اکثر جنگیں محض شعراء کے ''عرصۂ خیال'' میں برپا ہوئیں اور وہ بھی ''خداؤں کی چھلیں'' (Moral pranks of divine spirits) ہیں جنہوں نے رزم و پیکار اور باقاعدہ جھگڑوں کی شکل اختیار کی ہے۔

جو کچھ ان رزمیوں میں لکھا گیا ہے اور جو باتیں اِن رزمیوں کی بُنیاد بنی ہیں، وہ سب کچھ اخلاقی نقطۂ نظر سے اتنا رکیک اور پست ہے کہ اسے بطورِ مثال بھی یہاں پیش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ آپ اگر یہ غور کریں کہ ادب وشعر میں یہ ''خداؤں کی چھلیں'' یا ''ملکوتیوں کے جھگڑوں'' کا مضمون آیا کہاں سے؟ تو ظاہر ہے کہ آپ دُنیا کے قدیم ترین مُشرکانہ عقائد سے لے کر جدید ترین مُلحدانہ نظریات یا صنمیات (وثنیات) اور وَہمیات کے بہت بڑے انبار کا جائزہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے۔ جس میں یونانی، رومی، مصری بابلی اور ہندی سبھی دیومالائی مذاہب شامل ہوں گے۔ اور اس کے اسباب میں کچھ فکری مشکلیں سامنے آئیں گی تو کچھ یا بیشتر علمی مشکلیں! اور یہ عبرت انگیز حقیقت بھی سامنے آئے گی کہ کبھی کسی فرد یا معاشرے یا تہذیب کے۔ لیے ''حقیقتِ توحید'' کا مُنکشف نہ ہو پانا شرک والحاد کی بنیاد بنا ہے، تو بیشتر افراد، معاشروں اور تہذیبوں کے لیے ''حقیقتِ توحید'' کے تقاضوں پر عمل کی ''بے حوصلگی''۔

حضرت ربُّ الارباب کا ہم جتنا بھی شکر ادا کریں، ادائے شکر نا ممکن ہوگا کہ اُس نے قرآن مجید کے نزول اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت نیز توحید کی سانچے میں ڈھلی ہوئی خود آپ کی اور آپؐ کے اہلِ بیت کی پاکیزہ سیرتوں کے ذریعہ عالمِ بشریت پر اپنی حجتیں تمام فرما دیں۔ اب ''حقیقتِ توحید'' کی فکری اور عملی کوئی مشکل عالمِ بشریت خصوصاً امتِ مسلمہ کے لیے باقی نہیں رہ گئی ہے۔

☆☆☆☆☆

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لا شَرِيْكَ لَهُ فِي خَلْقِهِ وَلا شَبِيْهَ لَهُ فِي عَظَمَتِهِ!

تمام حمد، ساری تعریف اُسی معبود کے لیے ہے جس کی کارگاہِ خلقت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور نہ اس کی عظمت میں کوئی اس کی نظیر ہے!

☆☆☆

لفظ وعبارت کے لحاظ سے اِس جملے میں کوئی لفظ قابلِ تحقیق وتفتیش نہیں ہے۔ تمام لفظیں سامنے کی ہیں۔ اس لیے اس کے مفہوم میں غور کرتے ہیں۔

اس فقرے میں بھی توحید تنزیہی کا بیان ہے۔ یعنی صفاتِ سلبیہ میں سے خصوصیت کے ساتھ اُس کے کسی کے شریک نہ ہونے کی صفت کو پھر ایک خاص پہلو سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سے پہلے ''لم یکن لہٗ شریک فی الملک'' گزر چکا ہے۔ یہاں ''لاشریک لہٗ فی خلقہ'' ہے۔ وہاں مُلک یعنی اقتدار میں شریک کی نفی تھی، یہاں تخلیق کے عمل میں شریک کی نفی ہے۔ یہ صراحتیں دراصل ہر ہر جہت سے، ہر ہر سطح پر، تمام مراتبِ وجود اور تمام شئونِ حیات میں شرک کی مکمل نفی اور وحدتِ مطلقہ یا توحیدِ حقہ کے اثبات اور بیان کا حکیمانہ اور مربیانہ اہتمام ہے!

معلوم ہے کہ بعض مذاہب ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو ''خالقِ کائنات'' کو فی الاصل تو ایک ہی مانتے ہیں لیکن زندگی کے مختلف شعبوں یا وجود کے مختلف مراتب کے لیے علیحدہ علیحدہ خداؤں کے قائل ہیں جس کی مثال ہندو مذہب میں بھی ملتی ہے۔

قدیم مذاہب کو تو جانے دیجیے۔ اُن کے انحرافات کی رد میں علمِ کلام اور

مُناظرے کی کتابوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اِس عہدِ ترقی میں، علمِ جراحی اور عملِ جراحی (Surgery) کی پیش رفت، عملِ تلقیح اور اس کے بھی مختلف طریقوں کی دریافت اور ظاہری کامیابیوں نے نئے شکوک وشبہات پیدا کر دیے ہیں، ہماری نظر ان پر بھی ہے۔

قرآن مجید میں سورۂ مبارکہ لقمان کی ۳۴ ویں آیت میں چند امور خاص پروردگار کی ذات سے متعلق قرار دیے گئے ہیں۔ اس مقام میں دراصل علمِ الٰہی کی تفصیل جزئیات پر اس کے احاطہ اور اس کی بے کرانی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے چند مصادیق بیان کیے گئے ہیں:

''اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الغَيثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الاَرْحامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَداً وَمَا تَدْرِيْ نَفْسٌ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْر''

''یقیناً قیامت کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہی مینہ برساتا ہے، اور وہی جانتا ہے جو ماؤں کے رحموں میں ہے، اور کوئی نہیں جانتا کہ وہ کل کیا حاصل کرے گا اور کوئی نہیں جانتا کہ اسے کہاں موت آئے گی بے شک اللہ پورا پورا علم اور مکمل خبر رکھنے والا ہے''۔

اب جدید سائنس وایجادات کی مدد سے عموماً لوگ موسموں کا حال، ماؤں کے رحموں میں جنین کی صورتِ حال، اپنے آئندہ کے اقتصادی، سیاسی، طبی مستقبل کے بہت سے امور، بعض حالات میں کسی مریض کی زندگی اور موت کے مسائل وغیرہ کے بارے میں تقریباً صد فی صد علم واطلاع حاصل کر لیتے ہیں۔ اور اس آیت

کی معنویت پر سوال کرتے ہیں کہ اب تو علمِ الٰہی پر انسانی تصرف یا قدرت سامنے آ گئی؟! پھر اس قرآنی بیان کی صداقت اور معنویت کیا ہے؟

مجھے اس طرح کے سوالات پر تعجب ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ایسے سوالات تبھی پیدا ہوتے ہیں جب ''عقل سادہ کار'' _ ''فتنہ کار'' بن جاتی ہے! ارے کہاں ربُّ الارباب کا علم جو قطعاً بلا واسطۂ آلات و وسائل ہے اور پھر بھی قطعاً وحتماً بلا شائبۂ خطا ہے۔ اور کہاں یہ انسانی معلومات کہ جو اُسی کے عطا کردہ عقل وشعور کے ذریعہ، آلات ووسائل کے واسطہ سے حاصل ہوتے ہیں اور ان میں بھی خطا اور نقص کے کتنے ہی شائبے رہتے ہیں!

کچھ ایسی ہی صورت تلقیح جیسے تجربات کی کامیابی سے لوگوں میں مشرکانہ یا ملحدانہ خیالات کی ہے۔

حالانکہ اگر قانونِ علت ومعلول کو اس کی پوری تفصیل کے ساتھ اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ علّت کے اقسام اور اس کی علّیت (Causation) کے اطوار کو نظر میں رکھا جائے تو اس طرح کا کوئی وہم وگمان قلبِ مؤمن یا ذہن حکیم میں کوئی جگہ نہیں بنا سکتا!

علّت کے اقسام میں علّت مُعِدّہ، علّت فاعلی، علّت غائی، علّت ناقصہ اور علّت تامہ وغیرہ کے فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

سائنس داں، سائنسی تجربات، آلات اور وسائل، یہ سب وسائل ہی وسائل ہیں، ان میں سے کوئی بھی شئی ''تخلیقِ جنین'' یا تخلیق ثمار کے لیے ''علت تامہ'' کی حیثیت نہیں رکھتی ___ علت تامہ اسی معبود برحق کی مشیت کارساز ہے اور

بس!

انسان چاہے کچھ بھی کر ڈالے آخری نتیجہ اور وہ وجودی اور حَیَوی شکل و صورت جو بجائے خود اِس دنیا میں، عالم کون ومکان میں مشاءِ آثار ہوتی ہے وہ اسی 'احسن الخالقین' اور اسی 'باری ومصور' کے ''اذن فعلی'' اور لبِ کن فکاں، کی جنبش پر منحصر ہے۔ فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

یوں تو قرآن مجید میں 'ش رک' کے مادّے سے بہت سے کلمات آئے ہیں۔ لیکن لفظِ 'شریک' غالباً صرف تین ہی مقامات پر آیا ہے۔

سورۂ مبارکہ انعام میں لاشریک لہ مطلقاً آیا ہے (آیت ۱۶۲) سورۂ مبارکہ بنی اسرائیل (سورۂ اسراء) میں وَ قُلِ الحَمْدُ لِلّٰهِ الذی لَمْ یَتَّخِذْ وَلَداً وَلَمْ یَکُنْ لَهُ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ (آیت ۱۱۱) اور سورۂ فرقان (آیت ۲) میں بھی تقریباً یہی الفاظ آئے ہیں۔ قرآن میں تینوں جگہوں پر فی الجملہ ''ملک'' و نظام وتدبیر میں شریک کی نفی کی گئی ہے، یہاں پر معصوم نے اِجمال قرآنی کو تفصیل سے بدل کر ملک میں نفی شریک کی صراحت فرمائی، کہ مبادا کوئی اپنی چھوٹی چھوٹی ایجاد وصنعت، تخلیق و تجربہ کی بنیاد پر خود کو خالق تصور نہ کر بیٹھے۔ ہاں ہم سب کو خود اسی نے تخلیقی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں، اور اس عالم اسباب کو اسی نے ہمارے قبضہ واختیار میں دے دیا ہے۔ اس عالم اسباب میں اسباب بہم ہوتے ہیں، لیکن ان اسباب سے کوئی تازہ ثمر وجود اُسی کے آخری اِشارے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ چاہے وہ حقیقی و خارجی وجودات ہوں، چاہے اعتباری امتیازات ہوں، یعنی یہ ارباب دین واہل مذہب کی شاعری نہیں حقیقت ہے۔ جس کی ترجمانی شاعرِ حق

ترجمان مرزا اسلامت علی دبیرؔ نے اِن رباعیوں میں فرمائی ہے:

قطرے کو گہر کی آبرو دیتا ہے
قد سرو کو گل کو رنگ و بو دیتا ہے
بیکار تشخص ہے، تصنع بے سود
عزت وہی عزت ہے جو تو دیتا ہے

یارب خلاق ماہ و ماہی تو ہے
بخشندہ تاج و تختِ شاہی تو ہے
بے منت و بے سوال و بے استحقاق
دیتا ہے جو سب کو یا الٰہی تو ہے

☆☆☆☆☆

(۷)

کمالِ توحید

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْفَاشِي فِي الْخَلْقِ اَمْرُهُ وَحَمْدُهُ الظَّاهِرِ بِالْكَرَمِ مَجْدُهُ

الْبَاسِطِ بِالْجُوْدِ يَدَهُ

اَلَّذِي لَا تَنْقُصُ خَزَائِنُهُ

وَلَا تَزِيْدُهُ كَثْرَةُ الْعَطَاءِ اِلَّا جُوْدًا وَكَرَمًا

اِنَّهُ هُوَ الْعَزِيْزُ الْوَهَّابُ

تمام حمد اُسی معبود کے لیے ہے جس کا حکم اور جس کی حمد تمام خلق میں آشکار ہے!

جس کی بزرگی اس کے کرم سے ہویدا ہے

جس نے فیاضی کے لیے اپنے ہاتھ کھول رکھے ہیں۔

جس کے خزانوں میں کمی نہیں ہوتی۔

اور داد و دہش کی زیادتی سے اس کے یہاں کوئی اضافہ نہیں ہوتا سوائے فیاضی اور کرم گستری کے۔

وہی ہے بس وہی ہے قدرت مند داتا!

مضمون اور معنی کے لحاظ سے یہ فقرہ بیحد حیرت انگیز، بے انتہا غور طلب اور چشم باطن کشا ہے! اربابِ ذوق کے لیے ایک کیفیت بخش اور اہلِ تحقیق اربابِ توحید کے لیے ایک حال عطا کرنے والا اور ایک ''مقام'' پر متمکن کر دینے والا فقرہ ہے۔ نہج البلاغہ میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا ایک خطبہ بھی ایسے ہی فقرے سے شروع ہوتا ہے۔

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الْفَاشِي فِي الْخَلْقِ حَمْدُهُ وَالْغَالِبِ جُنْدُهُ... ''

(نہج البلاغہ نسخہ صبحی صالح خ ۱۹۱ ص ۲۸۳)

اصحابِ معرفت عالمِ خلق اور عالمِ اَمر کی اصطلاحوں سے عالمِ مُلک اور

عالمِ مَلَکُوت مراد لیتے ہیں۔ عالمِ مُلک یہی زمان و مکان کا عالم ہے اور عالمِ ملکوت زمان و مکان کے حدود، خصائص یا قیود سے آزاد! ایک سطحی فکر و نظر رکھنے والا ان عالَموں میں ایک بعد اور فصل کا تصور کرتا ہے۔ جبکہ یہی بعد یا فصل کا تصور 'لامکان' کو 'مکان' بنا دیتا ہے۔ دُعا کے اس فقرے میں واشگاف انداز میں کہا جا رہا ہے کہ تمام حمد، تمام تعریف، تمام خوبی، تمام شکر و سپاس اور کل مدحت و ثنا اُسی معبودِ برحق کے لیے ہے جس کا 'امر' خَلق ہی میں ظاہر ہے! یعنی اسی عالمِ ملک میں اُس کا ملکوت جھلک رہا ہے، کوئی دیکھنے والا ہو تو دیکھے کہ اسی مکان کے پردے میں لامکاں اور اسی زمان کے پردے میں لازماں چمک دمک رہا ہے، بلکہ اِس مکان کو اُسی لامکاں سے رونق حاصل ہے، مسلسل نور بارانی ہو رہی ہے! ''بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ'' کا اعلان کرنے والا جب جہاں اور جس طرح چاہے اپنے نورِ ملکوت کو مشعلِ طور بنا دے! اس کی قدرت کے اظہار میں کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں!

خلق و امر کی ''وحدت'' کا حسین ترین اور کامل ترین اظہار تو خود ''انسان'' کی ذات میں ''جسم و روح'' کی وحدت اور یکجائی کی شکل میں ہو رہا ہے۔ لیکن یہ اتنا مانوس مظہر ہے کہ اس کی قُدرت پر نظر ٹھہرتی نہیں، اسی لیے معبود برحق، انبیاء اور اَولیائے معصومین علیہم السلام کے ذریعہ سے اپنے آیات و معجزات کا اظہار فرماتا ہے، کبھی ابراہیمؑ کے لیے دہکتے ہوئے انگارے اور بھڑکتے ہوئے شعلے گل و گلزار بن جاتے ہیں تو کبھی موسیٰؑ کے لیے کسی درخت سے آواز آنے لگتی ہے تو کبھی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے درخت حرکت کرنے لگتا ہے، ہاتھوں پر سنگریزے کلمہ پڑھنے لگتے ہیں، آسمان پر چاند دو ٹکڑے ہو جاتا ہے، کبھی کسی علیؑ ولی کی خاطر سورج کو پلٹا دیا جاتا ہے تو کبھی کسی زین العابدین وسید الساجدین کے لیے حَجَرِ اسود گویا ہو کر ''امرِ الٰہی'' کی گواہی دینے لگتا ہے، یہ سارے معجزات عالمِ مُلک میں شانِ ملکوت کا اظہار اور ''توحیدِ عرفانی'' کے دلائل و آثار ہیں!

ہاں! ''توحیدِ عرفانی'' مراتبِ توحیدِ حق وصمد کا ایک انتہائی اَرفَع مرتبہ ہے اس میں شک کرنے کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے، جبکہ اس حقیقت کی تصدیق کرنے والے، اُس تک پہنچنے والی طریقت کی نشاندہی کرنے والے، اُسے دیکھنے والے، اُس کی رؤیت کے لطف اوراس کے دیدار کی لذت اٹھانے والے برملا اس کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ وہ روایت کس قدر مستحکم ہے کہ پوچھنے والے نے حضرتِ امیر المؤمنین، مولیٰ الموحدین، ولیِ مطلق اور وصیِ برحق امام علی مرتضیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا آپ نے اپنے رب کو دیکھا ہے؟ اورآپ نے جواب میں فرمایا میں ایسے کسی رب کی پرستش نہیں کرتا جسے دیکھا نہ ہو! یہ روایت کتاب التوحید مؤلفہ علامہ صدوق میں موجود ہے۔

ظاہر ہے کہ جس کا ''امر'' اس قدر ہویدا ہے اُس کی حمد کیوں کر نہ آشکار ہوگی! اِس عالمِ خلق کی ایک ایک شے سے اُس کی خوبی، اُس کی حمد کا اظہار وبیان بھی ہورہا ہے، یعنی۔

کچھ گُل فقط نہ کرتے ہیں رَبِّ عُلا کی حمد
ہر خارکو بھی نوکِ زباں ہے خدا کی حمد [1]

''توحیدِ عرفانی'' کا اگر احادیث نبویہؐ میں سرچشمہ تلاش کرنا ہوتو منجملہ اوراحادیث کے یہ حدیث نبویؐ بھی نہایت تابناک اسرار کی حامل نظر آئے گی:

علامہ صدوقؒ نے معانی الاخبار میں نقل فرمایا ہے:

''...قال رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم:

''التوحید ظاهِرُهُ فی باطِنِهِ و باطِنُهُ في ظاهِرِهِ،

[1] اصل بیت میر انیس علیہ الرحمہ کی ہے:

کچھ گُل فقط نہ کرتے تھے ربِّ علا کی حمد
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی حمد

ظاهِرُهُ مَوصُوفٌ لا یُریٰ،
وباطِنُهُ مَوجُودٌ لا یَخفیٰ،
یُطلَبُ بِکُلِّ مَکانٍ، وَلَم یَخلُ مِنهُ مَکانٌ طَرفَةَ عَینٍ،
حاضِرٌ غیرُ مَحدُودٍ،
وغائِبٌ غیرُ مَفقُودٍ!''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''توحید کی شان یہ ہے کہ اس کا ظاہر اس کے باطن میں!
اس کا ظاہر وصف کیا جاتا ہے دیکھا نہیں جاتا!
اس کا باطن موجود ہے، مخفی نہیں
اُسے ہر جگہ پایا جاتا ہے، کوئی جگہ چشمِ زدن کے لیے بھی اس سے خالی نہیں،
وہ حاضر ہے محدود نہیں'' [1]

یہی وہ زاویۂ نگاہ، مقامِ مشاہدہ، شانِ حمد اوراندازِ تشہد ہے جہاں پر عوام کی بات تو الگ رہی، خواص علماء بلکہ خود اس گروہ کے افراد واعلام کے درمیان بھی جو خاصۂ اہل اللہ، اوراہلِ توحید ہی کہلاتا ہے، اختلافِ بیان وتعبیر بس دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے!

ایک طرف محی الدین اکبر ابنِ عربی ہیں کہ نظریۂ ''وحدت الوجود'' کے سرخیل ہیں تو ایک طرف علاء الدین سمنانی ہیں جو نظریۂ وحدتِ شہود کے سرگزار ہیں، یہ مقام ان تمام نظریات پر مفصل بحث کا مقتضی نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارے لیے قرآن وارشادِ پیغمبرؐ ہی اس باب میں کافی ومکتفی ہے۔

[1] گویا انیس ودبیر کی وہ رباعیاں اسی حدیثِ نبوی کو شاعرانہ دلاویزی کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ جن کے آخری مصرعے یہ ہیں:

ع جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

انیس

الظَّاهِرِ بِالْکَرَمِ مَجْدُهُ

جس کی بزرگی اس کے کرم سے ہویدا ہے

الباسِطِ بالجُودِ یَدَهُ

جس نے فیاضی کے لیے اپنے ہاتھ کھول رکھے ہیں۔

الّذی لا تَنْقُصُ خزَائِنُهُ

جس کے خزانوں میں کمی نہیں ہوتی۔

وَلا تزِیْدُهُ کَثْرَةَ العَطَاءِ اِلّا جُوْداً وَکَرَماً

اور داد و دہش کی زیادتی سے اس کے یہاں کوئی اضافہ نہیں ہوتا سوائے فیاضی اور کرم گستری کے۔

اِنَّهُ هُوَ الْعَزِیْزُ الوَهَّابُ !

وہی ہے بس وہی ہے قدرت مند داتا!

☆☆☆

اِن تمام فقروں میں ربِّ کریم کی قدرتِ بے پایاں اور عطائے بے کراں کی ثنا خوانی ہے۔ جو دُعا یہ نقطۂ نظر سے حُسنِ طلب کی بہترین صورت ہے۔ بقول شاعرِ عرب۔

اِذَا أثنیٰ عَلَیْکَ المَرأُ یَوْماً

کَفَاهُ مِنْ تَعَرُّضِهِ الثناءُ

مفہوم یہ ہے کہ اگر انسان کبھی تیری ثنا کرے تو وہی ثنا اس کی طرف سے عرضِ مدعا کے لیے کافی ہے! یہ شعر علامہ بہائی نے کشکول میں اپنے والد فقیہِ عصر و مرجعِ وقت شیخ حسین عاملی کے حوالے سے انہیں کے ایک قلمی نوشتے سے ایک لطیف تقریب و تعبیر کے ساتھ نقل کیا ہے، ان کی پوری عبارت اس طرح سے ہے:

"قالَ جامعه: من خط والدي طاب ثراه؛ سُئِلَ عطاء عن معنیٰ قول النبی صلی الله علیه و آله وسلم : خیرُ الدعاء

دعائی و دعاء الانبیاء من قبلی وهو: لا اِلهَ الّا الله وحده لاشریک له له الملک وله الحمد یُحیي و یمیت وهو حي لایموت، بیده الخیر وهو علی کل شیئ قدیر"

ولیس هٰذا دعاء اِنما هو تقدیس و تحمید، فقال هٰذا کما قال امیه بن الصلت فی ابن جدعان:

اِذَا أثنیٰ عَلَیْکَ المَرأُ یَوْماً

کَفَاهُ مِنْ تَعَرُّضِهِ الثناءُ

افیعلم ابن جدعان مایراد منه بالثناء علیه، ولا یعلم الله ما یراد منه بالثناء علیه.

(بہائی، کشکول، نسخۂ خراسان ج ا ص ۲۲۹)

"اس کشکول کا مولف کہتا ہے: میرے والد طاب ثراہ کی تحریر میں ہے کہ عطاء سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِس قول کے معنی پوچھے گئے کہ "بہترین دعا میری اور مجھ سے پہلے انبیاء کی یہ دعا ہے: لا الٰہ الّا ...الخ۔

جبکہ یہ دعا نہیں ہے، یہ تو تقدیس و تمجید ہے تو عطا نے کہا یہ اسی طرح ہے جیسے:

"امیہ بن ابی الصلت (عربی کے مشہور کلاسیکی شاعر) نے ابن جدعان کے بارے میں کہا کہ اگر انسان تیری ثنا کرے تو اُس کی ثنا اس کی طرف سے عرضِ مدعا کے لیے کافی ہے، تو کیا ابن جدعان جانتا ہے کہ اُس کی تعریف کے ذریعہ اُس سے کیا مُراد و مدعا وابستہ ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نہیں جانتا کہ اُس کی ثنا کے ذریعہ اُس سے کیا امید لگائی گئی ہے؟"

اس نکتہ سے قطعِ نظر، "الظاہر بالکرم مجدہ" کے فقرے میں رب کریم کی جس بات کی، جس طرح سے، جس نقطۂ نگاہ سے بزرگی بیان کی گئی ہے اس میں اور بھی حکیمانہ نکات مضمر ہیں۔ اور اسی طرح "الباسط بالجود یدہ" کے فقرے میں بے

انتہا بلاغت کے ساتھ ربّ کریم کی قدرتِ مُستَمِرّہ، قدرتِ جاریہ، فیضان جاری و ساری کا بیان ہے، وہ قرآن مجید کی ان آیات کی طرف ذہن کو ملتفت کر دیتا ہے جس میں یہود کے تعطیل وتفویض کے مُلحدانہ شُبہہ کا کریمانہ جواب دیا گیا ہے:

﴿وَ قَالَتِ الیَھُودُ یَدُ اللّٰہِ مَغلُولَۃٌ غُلَّتُ اَیدِیھِم وَ لُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَل یَدَاہُ مَبسُوطَتَانِ یُنفِقُ کَیفَ یَشَاءُ وَلَیَزِیدَنَّ کَثِیراً مِنھُم مَّا اُنزِلَ طُغیَاناً و کُفراً﴾

''اور یہود نے کہا کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے، جو انہوں نے کہا اُس سے انہیں کے ہاتھ بندھے، اور ان پر لعنت برسی، اللہ کے ہاتھ تو کھلے ہوئے ہیں وہ جس طرح چاہتا ہے عطا کرتا ہے، اور جو آپ کے پروردگار کی طرف سے آپ پر نازل ہوا ہے وہ اُن میں سے بہتوں کے لیے سرکشی اور کفر میں اضافہ ہی کرے گا!''

اس آیتِ مجیدہ میں اور دعائے افتتاح کے زیرِغور فقرے میں بڑا گہرا معنوی ربط ہے جو بہت حد تک الفاظ سے بھی ظاہر ہے۔ لیکن اس کے تمام مضمرات سے بحث کرنے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ آیت قرآنی اور ارشاداتِ نبوی و وَلوی، احادیث و ادعیہ کے اسرار و رموز جاننے کے لیے بھی اُسی رب کریم سے استمداد ضروری ہے۔ اُسی سے فہمِ اسرار و معانی چاہیے۔ وہی ہے بس وہی قدرت مند اور داتا!

☆☆☆☆☆

(۸)

حُسنِ سوال

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ قَلِیْلاً مِنْ کَثِیْرٍ مَعَ حَاجَةٍ بِیْ اِلَیْهِ عَظِیْمَةٍ وَ غِنَاکَ عَنْهُ قَدِیْمٌ وَ هُوَ عِنْدِیْ کَثِیْرٌ وَ هُوَ عَلَیْکَ سَهْلٌ یَسِیْرٌ.

اے معبود! میں سوال کر رہا ہوں تجھ سے! بہت زیادہ میں سے بہت کم کا، جبکہ مجھے اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے اور تو اس سے ہمیشہ سے بے نیاز ہے اور وہی کم میرے لیے بہت زیادہ ہے جبکہ (اس کا عطا کرنا) تیرے لیے بہت آسان اور معمولی کام ہے!!

اس فقرے میں کوئی لفظ غریب یا مشکل نہیں ہے۔ ترجمے کی روشنی میں اردو کے عام قاری بھی دعا کے اصل الفاظ کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔

حسن ترکیب کے لحاظ سے دوسرے فقروں کی طرح اس فقرہ میں بھی انفرادیت اور دل آویزی، بلاغت اور دلنشینی بحدّ کمال پائی جاتی ہے۔ الفاظ تو الفاظ ہیں اس فقرے میں خصوصیت کے ساتھ ''تنوین'' نے جو صوتی اور معنوی دونوں سطحوں پر سحر کاری یا اعجاز نمائی کی ہے اُسے کچھ اہلِ ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ مضمون کے لحاظ سے یہ فقرہ ___ فقرِ مخلوقات اور استغنائے ذاتِ احدی و صمدی کو جس تفصیل بداماں ایجاز کے ساتھ پیش کر رہا ہے اس کی ستائش کے لیے ہمارے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں۔

خالقِ متعال کی ذات غنی ہے اور ہمیشہ سے غنی ہے، نہ کبھی کسی بھی طرح کی احتیاج اُسے لاحق تھی نہ ہو سکتی ہے۔ اس کی ذات، اس کی صفتِ استغنا اور اس کے خزانوں کے مقابلے میں تمام مخلوقات کی احتیاج بشمول انسان کچھ بھی نہیں ہے۔ اُس کی ایک ذرا سی بارشِ کرم سے تمام عالم جل تھل ہو جاتا ہے اور دامنِ طلب میں اس کی عطا کو سنبھال کر رکھنے کی گنجائش نہیں رہتی! اُس پر بھی یہ انسان اپنی ضرورتوں

کو اہم گردانتا ہے اور حضرت رَبُّ الارباب کی عطاؤں کو کم تر شمار کرتا ہے۔ اور وہ رب الارباب جس کے لیے بڑی سے بڑے عطا بھی انتہائی سہل اور معمولی ہے، اپنے بندوں کے ظرف و استعداد کو دیکھ کر ہی عطا فرماتا ہے، جب کہ عموماً انسان اپنی ضرورت نہیں بلکہ اپنی حرص و ہوس کے پیمانے سے طلب کرتا ہے اور جب کبھی اس کی طلب حسبِ ہوائے نفس پوری نہیں ہوتی تو اپنے رب سے گلہ کرتا ہے، بلکہ اپنے جیسے دوسرے بندوں سے اُس کا گلہ کرنے لگتا ہے، اس دعا کے بعض دوسرے فقروں میں دعا سے متعلق اِن مسائل پر اور بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

لیکن اس سے قبل کہ دوسرے فقروں پر نظر ڈالی جائے، سوال و عطا کے تعلق سے، برسبیلِ ثنا، یہ ذکر انتہائی برمحل معلوم ہوتا ہے کہ وہ معبودِ برحق اور خالقِ جواد و کریم تو وہ ہے جس کے فیضانِ عطا میں کوئی کمی ہے ہی نہیں، اس کے بحرِ کرم میں مد ہی مد ہے جزر کا نام و نشان ہی نہیں، دامنِ طلب میں گنجائش ہوتی ہے تو اُس کی بارشِ کرم یوں بھی ہوتی ہے کہ خود فرماتا ہے:

﴿وَلَسَوْفَ یُعْطِیْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰی﴾ (سورۂ ضحیٰ ۹۳ آیت ۵)

''اور جلد ہی پروردگار تمہیں اتنا عطا کرے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے''

بلکہ رب اکبر کا تو اعلان ہے کہ ہماری عطا سب کے لیے عام ہے کسی پر بند نہیں ہے!

﴿کُلًّا نُمِدُّ هٰؤُلَاءِ وَ هٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّکَ وَ مَا کَانَ عَطَاءُ رَبِّکَ مَحْظُوْرًا﴾ (سورۂ اسراء ۱۷/۲۰)

اور جہاں تک اس کے احبّا، اولیاء، عشّاق، مُطیعین اور مخصوص بندوں کا تعلق ہے وہاں تو ﴿اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ﴾ کا سرچشمۂ عطا جوش زن ہے ہی!

سورۂ ھــــود میں صلحائے امت کے حق میں عطائے اخروی کی شان بھی قابلِ غور ہے:

"وَاَمَّا الَّـذِيْنَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَادَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالاَرْضُ اِلَّا مَاشَاءَ رَبُّكَ عَطَاءً ا غَيْرَ مَجْذُوْذ"

"اور جو لوگ نیک ہیں وہ تو جنت میں ہیں جب تک کہ یہ آسمان و زمین قائم ہیں، مگر یہ کہ پروردگار جو چاہے یہ عطائے رب ہے جو ختم ہونے والی نہیں!"

اسی طرح سورۂ مبارکہ صٓ کی ایک آیت بھی بے انتہا فکر انگیز، حوصلہ ساز اور ہمت نواز مضمون اور مژدۂ عطا کی حامل ہے:

﴿هٰذَا عَطَآءُ نَا فَامْنُنْ اَوْ أَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾

"یہ ہے ہماری عطا اب چاہے تم لوگوں کو بے دریغ فیضیاب کرو یا بے حساب اپنے پاس رکھو!"

☆☆☆☆☆

(۹)

قصیدۂ کرم و حلم و حُسنِ استغفار

اَللّٰهُمَّ اِنَّ عَفْوَكَ عَنْ ذَنْبِي وَتَجَاوُزَكَ عَنْ خَطِيئَتِي وَصَفْحَكَ عَنْ ظُلْمِي وَسِتْرَكَ عَلٰى قَبِيحِ عَمَلِي وَحِلْمَكَ عَنْ كَثِيرِ جُرْمِي عِنْدَمَا كَانَ مِنْ خَطَاءِي وَعَمْدِي اَطْمَعَنِي فِي اَنْ اَسْأَلَكَ مَالَا اَسْتَوْجِبُهُ مِنْكَ الَّذِي رَزَقْتَنِي مِنْ رَحْمَتِكَ وَاَرَيْتَنِي مِنْ قُدْرَتِكَ وَعَرَّفْتَنِي مِنْ اِجَابَتِكَ فَصِرْتُ اَدْعُوكَ آمِنًا وَاَسْأَلُكَ مُسْتَأْنِساً لَاخَائِفاً وَلَاوَجِلاً مُدِلّاً عَلَيْكَ فِيمَا قَصَدْتُ فِيهِ اِلَيْكَ فَاِنْ اَبْطَأَ عَنِّي عَتَبْتُ بِجَهْلِي عَلَيْكَ وَلَعَلَّ الَّذِي اَبْطَأَ عَنِّي هُوَ خَيْرٌ لِي لِعِلْمِكَ بِعَاقِبَةِ الْاُمُورِ فَلَمْ اَرَ مَوْلًى كَرِيماً اَصْبَرَ عَلٰى عَبْدٍ لَئِيمٍ مِنْكَ عَلَيَّ يَا رَبِّ اِنَّكَ تَدْعُونِي فَاُوَلِّي عَنْكَ وَتَتَحَبَّبُ اِلَيَّ فَاَتَبَغَّضُ اِلَيْكَ وَتَتَوَدَّدُ اِلَيَّ فَلَا اَقْبَلُ مِنْكَ كَاَنَّ لِيَ التَّطَوُّلَ عَلَيْكَ فَلَمْ يَمْنَعْكَ ذٰلِكَ مِنَ الرَّحْمَةِ لِي وَالْاِحْسَانِ اِلَيَّ وَالتَّفَضُّلِ عَلَيَّ بِجُودِكَ وَكَرَمِكَ فَارْحَمْ عَبْدَكَ الْجَاهِلَ وَجُدْ عَلَيْهِ بِفَضْلِ اِحْسَانِكَ اِنَّكَ جَوَادٌ كَرِيمٌ.

اے معبود! تیرا میرے گناہ کو معاف کر دینا، تیرا میری خطا سے درگزر کر جانا، تیرا میری زیادتی سے چشم پوشی کر لینا، تیرا میرے کرتوت کو چھپا دینا، اور میرے بیشمار جرائم پر بردباری اختیار کرنا جبکہ یہ جرائم میری صریح غلطی سے اور دیدہ و دانستہ سرزد ہوئے، مجھے لالچ دلا رہا ہے کہ میں تجھ سے وہ سوال کروں جس میں تیری طرف سے مستحق نہیں ہوں اور جو تو نے اپنی رحمت سے مجھے عطا فرمایا اور اپنی قدرت سے مجھے دکھایا اور اپنی قبولیت سے مجھے آگاہ کیا۔ تو میں (اپنے اس قدر

گناہوں کے باوجود، مستحق سزا ہونے کے باوجو) تجھے چین سے پکار رہا ہوں اور تیرا آشنا بن کر تجھ سے سوال کر رہا ہوں! نہ ڈر رہا ہوں نہ جھجک رہا ہوں، بلکہ تیرے سامنے اپنے مقصد براری کے لیے ضد کر رہا ہوں مراد ملنے میں دیر ہوتی ہے تو اپنی جہالت سے تجھ سے ناراض ہوتا ہوں، جبکہ جو مراد مجھے نہیں ملی ہے وہ میرے لیے بہتر ہے کیونکہ تجھے تمام باتوں کے انجام کی آگہی ہے! میں نے تو تیرے جیسا کرم فرما آقا کوئی نہیں دیکھا۔ اے پالنے والے! تو مجھے بلاتا ہے اور میں تیری طرف سے روگردانی کرتا ہوں، تو مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں، تو مجھ پر مہربانیاں فرماتا ہے اور میں قبول نہیں کرتا، جیسے میرا تجھ پر کوئی احسان ہو، تب بھی تیری فیاضی اور کرم گستری تجھ کو مجھ پر رحمت کرنے، احسان فرمانے اور مہربانیوں سے روکتی نہیں بس اپنے اس جاہل بندے پر احسان فرما اور اپنے احسان سے اس پر فیاضی کر یقیناً تو ہی فیاض اور کرم گستر ہے! جو میرے جیسے ذلیل بندے کو برداشت کرے!

(اگرچہ اس فقرے میں کئی الفاظ تشریح طلب ہیں لیکن ہم ان لفظی ادھیڑ بن سے بچتے ہوئے مضمون سے بحث کرتے ہیں۔)

اِس دعا کا نسبتہً یہ طویل فقرہ ہے۔ جو اُس کے عفو و کرم اور حسنِ عطا کی ثنا وصفت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ گزشتہ فقروں کے ذیل میں کہیں پر عرض کیا گیا ہے کہ ثنا خود ہی طلب سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ پھر جب حسنِ ثنا اور حسنِ طلب دونوں بحدِ کمال پائے جائیں تو اس عرضِ حال کی تاثیر کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے! دُنیا بھر کا ادب، تمام عارفوں، عابدوں، زاہدوں اور صوفیوں کی دعائیں، مناجاتیں

پڑھ ڈالیے ربِّ کریم کی رحمتِ بے پایاں کی ایسی سچی تصویر کہیں نہیں مِل سکے گی۔ خود ساختہ عرفا و صوفیا اور بے معرفت عُبّا دوزہّا دکی باتیں تو ظرف کی ''سطحیت'' کی بنا پر ذرا ذرا سی شانِ کرم دیکھ کر ''شطحیات'' میں بدل جاتی ہیں۔ اور ربِّ کریم کی حمد وثنا کے بجائے اپنی شانِ گدائی کی پُرتعلّی قصیدہ خوانی شروع ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ معبود برحق کے معصوم بندے ہی اگر اُس کے صفات کا بیان نہ فرمائیں تو کسی بھی انسان میں طاقت نہیں کہ اپنے لفظوں میں اُس کی رحمت و رافتِ بے کراں اور لطفِ بے پایاں کا بیان کر سکے اور بیان تو کجا اس کی شانِ ربوبیت کا ذرہ بھر ادراک بھی کہاں ممکن ہے؟!

یہی سبب ہے کہ انسان اُس کی پیہم نوازشوں اور لگا تار چشم پوشیوں کا احساس نہ کر کے، اپنی دیدہ و دانستہ، بے تحاشا اور بے لگام غلطیوں، گناہوں اور ناشکریوں کا بھی کچھ لحاظ نہ کرتے ہوئے، اپنی مقصد براریوں کے لیے اس کے سامنے ضد کرتا ہے اور صرف ضد ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی طرف سے منہ مانگی مُراد نہ پا کر اُس سے ناراض بھی ہوتا ہے!

اِس فقرہ دُعا کے جملے جہالت مین ڈوبے ہوئے اَدَبِ الٰہی سے بے خبر اور ''تہذیبِ توحید و بندگی'' سے نا آشنا نفوس کے لیے زبردست تنبیہ کا مضمون اور تادیب وتزکیہ وتہذیبِ نفس کا بڑا سروسامان رکھتے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ یہ جملے:

اِنَّکَ تَدْعُوْنِي فَاُوَلِّي عَنْکَ

وَ تَتَحَبَّبُ اِلَیَّ فَاَتَبَغَّضُ اِلَیْکَ

وَ تَتَوَدَّدُ اِلَیَّ فَلَا اَقْبَلُ مِنْکَ

کَاَنَّ لِي التَّطَوُّلَ عَلَیْکَ

''تو مجھے بلاتا ہے اور میں تجھ سے روگردانی کرتا ہوں

تو مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں تجھ سے نفرت کا برتاؤ کرتا ہوں

تو مجھ پر مہربانیاں فرماتا ہے اور میں اسے قبول نہیں کرتا

جیسے میرا ہی تجھ پر کوئی احسان ہو''

کفرانِ نعمت کی بُری سرشت رکھنے والے کے لیے تنبیہ وسرزنش کے تیرو نشتر جیسے موثر جملے ہیں۔ ایک سلیم الطبع انسان جو اِس طرح کے معاملات اور کوائف کا اپنی ذاتی زندگی میں کوئی عملی اور نفسیاتی تجربہ نہیں رکھتا وہ ایسے جملوں کو سُن کر یا پڑھ کر یا زبان سے ادا کرتے ہوئے لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔ لیکن اکثریت تو اِس دارِغفلت میں غفلت شعاروں ہی کی ہے!

اِن جملوں کی تھوڑی سی معنویت کو انسان اُس لطفِ خداوندی کے حوالے سے سمجھ سکتا ہے جو ربِّ کریم نے ماں باپ بھائیوں اور اولوالارحام یا قرابت داروں کی آپس کی محبت ومودت (تَحَبُّب اور تَوَدُّد) اور باہمی تعاون، حسنِ سلوک صلۂ رحم اور تطوّل کی شکل میں انسان کے شاملِ حال فرمایا ہے۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ، اَولاد سے محض بر بنائے محبتِ مادری وشفقتِ پدری کوئی محبت کا سلوک کرتے ہیں اور اولاد اپنی جہالت یا غفلت کی بنا پر اس کی صحیح قدر دانی نہیں کرتی، بلکہ ماں باپ سے ردوگردانی اختیار کر لیتی ہے یا ماں باپ کے سراسر مخلصانہ عمل کو ''غرض مندانہ'' سمجھ لیتی ہے۔ یا ایک بھائی محض

بر بنائے اخلاصِ برادرانہ تحبّب وتودُّدِ صادقانہ، کوئی حسن سلوک کرتا ہے اور دوسرا
بھائی اس سے بجائے اقبالِ خاطر کے بغض یا نفرت کا برتاؤ اختیار کرتا ہے۔
بسااوقات یوں ہی خانوادوں اور خاندانوں کے شیرازے بکھر کر رہ جاتے ہیں۔اسی
لیے قرآنِ مجید نے فرمایا ہے:

﴿هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانِ﴾

احسان کی جزا احسان ہی ہے!!

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ عرفانی، وجدانی اور سُلوکی نقطۂ نظر کا حامل
تھا۔اس فقرۂ دعا کا پہلا ہی جملہ اور غور کیجیے تو ایک اور زاویۂ فکر بھی سامنے لاتا ہے

اللّٰھُمَّ اِنَّ عَفْوَکَ عَنْ ذَنْبِي

اے معبود تیرا میرے گناہوں کو معاف کر دینا!''

کلامی ذوق رکھنے والے ذہن اسی جملے سے حقیقتِ توبہ، اور امکانِ
مغفرت وشفاعت کے مباحث کی طرف متوجہ ہو سکتے ہیں۔مغفرتِ ذنوب اور توبہ کا
موضوع دو جانبہ ہے۔ایک طرف بندے کے لیے امکان وآدابِ توبہ کے مسائل
ہیں اور دوسرے طرف ربِّ کریم اور حاکم وسلطانِ عادل کی جانب سے مراتبِ عفوو
درگزر کے مباحث۔

بعض علماء نے اِس موضوع پر مستقل رسالے تصنیف کیے ہیں۔مختلف
کلامی فرقوں کے نظریات اس باب میں بھی بہت زیادہ متصادم ہیں کہ پروردگارِ عالم
کا اپنے بندوں کے گناہوں کو معاف کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ اسی طرح کے بعض
مسائل کی موجودگی کبھی کبھی ''علم کلام'' کی دینی ارزش یا بے ارزشی کو بھی زیرِ سوال

لے آتی ہے۔جبکہ قرآنِ مجید، ارشاداتِ نبویؐ، کلامِ ائمۂ دینؑ اور ادعیہ ماثورہ کے
علاوہ عقل و وجدانِ بشری بطورِ مستقل بھی اِس عقدے کا بہت ہی روشن حل سامنے
رکھتی ہے۔

میں اس مقام پر عفوومغفرت، شفاعت اور توبہ کے باب میں تمام کلامی
فرقوں کے آراء ونظریات بیان کرنے کے بجائے وہ خُلاصۂ بحث جو قرینِ تحقیق ہے
کچھ اپنی اور کچھ حضرت محققِ طوسیؒ کی زبانی عرض کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

بلاشبہ حضرت محققِ طوسیؒ کے یہ جملے اِس بحث میں ہر مُنحرف کج فکر و کج مج
بیان کے قطعِ کلام کے لیے کافی ہیں:

''دَوَامُ الْعِقَابِ مُخْتَصٌّ بِالْكَافِرِ وَ الْعَفْوُ وَاقِعٌ لِأَنَّهُ حَقُّهُ تَعَالَىٰ
فَجَازَ اِسْقَاطُهُ وَلَا ضَرَرَ فِي تَرْكِهِ مَعَ ضَرَرِ النَّازِلِ بِهِ فَحَسُنَ اِسْقَاطُهُ
وَلِأَنَّهُ اِحْسَانٌ وَ لِلسَّمْعِ''۔

''عذابِ دائم صرف کافر کے لیے ہے، اس کے علاوہ (معبودِ برحق پر
ایمان رکھنے والوں کی خطاؤں کی) ربِّ کریم کی جانب سے معافی ثابت ہے۔اُس
لیے کہ عذاب وعقاب اس کا حق ہے اور اپنے اس حق سے درگزر کرنا قطعاً جائز ہے۔
جبکہ ترکِ عقاب میں کوئی ضرر بھی نہیں ہے بلکہ عقاب وعذاب نازل کرنے میں
ضرور مخلوقات کو ضرر لاحق ہوتا ہے۔اس بنا پر مولیٰ سبحانہ وتعالیٰ کا اپنے حقِ عتاب و
عقاب سے درگزر کرنا حُسن ہی کا پہلو رکھتا ہے اور اس لیے بھی کہ یہ بندوں کے
ساتھ نیکی ہے۔اس کے علاوہ دلیلِ سَمْعی یعنی مژدۂ قرآن وحدیث سے بھی عفو
ثابت ہے۔''

حضرت محققؒ کا یہ جملہ کہ ''والعفو واقعٌ''، ممکن ہے ثبوتِ امکانِ عفو ہی کے معنی میں ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ ربِّ کریم کی جانب سے تو بندوں کے حق میں عفوو درگزر کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری ہے۔ اور جب عملاً عفو و درگزر کا سلسلہ اس دنیا میں جاری ہے تو پھر روزِ جزاء اس کے اِمکان میں کیوں کر شبہ وارِد ہو سکتا ہے؟!

انسان ذرا اپنی سیرت پر غور کرے! اس سے ربِّ کریم کے حقوق کی ادائیگی تو دُور کی بات ہے، جبکہ کھلی ہوئی نافرمانیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ انسان کتنے گناہ کرتا ہے؟ اس سے کتنی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں؟ کتنی بھول چوک ہوتی ہے اور کتنی کوتاہیاں جان بوجھ کر ہوتی ہیں، لیکن وہ ربِّ کریم ہے کہ سب کچھ نظر انداز فرماتا جاتا ہے، نہ رزق بند کرتا ہے، نہ مسخ کرتا ہے نہ وقت سے پہلے موت دیتا ہے، نہ اپنی طرف اسبابِ زندگی کو سلب کرتا ہے، نہ اپنے بندوں کو اُن کے رازوں کو فاش کر کے رسوا کرتا ہے، یہ اُس کی کتاب رحمت قرآن اِس حقیقت پر سب سے بڑی گواہی پیش کرنے کے لیے موجود ہے کہ انسانوں کے لاکھوں، کروڑوں گناہوں میں سے پروردگار نے صرف اور صرف ''چھ'' گناہوں پر اپنی طرف سے حدود یعنی مخصوص اور معین سزاؤں کا اعلان کیا ہے اور وہ بھی بربنائے تقاضائے لُطف و رحمت ہی ہے۔ اسی ضمن میں ربِّ اکبر کا یہ اعلان بھی گوشِ سماعت میں پڑا رہے کہ:

﴿عَذَابِیْٓ اُصِیْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ﴾

''میرا عذاب جسے میں چاہوں گا اُسی پر ہوگا اور میری رحمت کا دروازہ ہر شے پر کشادہ ہے۔''

(چونکہ موضوع پر مفصل بحث راقم اپنی کتاب ''قرآن یا کتابِ رحمت''

۱۳۴

میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر چکا ہے اس لیے یہاں اسی قدر اشارے پر اکتفا کی جاتی ہے۔)

اس بیان سے حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ کی جانب سے بندوں کے لیے امکانِ عفو یا امکانِ توبہ کا ثبوت تو سامنے آ ہی گیا ہے۔ اَب جہاں تک آدابِ توبہ اور مراتبِ عفو کا سوال ہے تو یہ بجائے خود بے حد تفصیل طلب ہے۔

قرآنِ مجید میں کہیں ''تَوْبَة'' کا لفظ آیا ہے، کہیں ''اِنَابَة'' کا تو کہیں ''اَوْبَة'' کا۔ بعض اربابِ لغت انہیں توبہ کے تین اقسام قرار دیتے ہیں اور تفسیر یہ بیان کی ہے کہ جو خوفِ عقاب کی بنا پر توبہ کرے وہ صاحبِ توبہ ہے، جو طمعِ ثواب میں توبہ کرے وہ صاحبِ انابت ہے اور جو نہ خوفِ عقاب میں توبہ کرے نہ طمعِ ثواب میں بلکہ محض طاعتِ پروردگار میں توبہ کرے وہ صاحبِ اَوبہ ہے۔

اسی ضمن میں عفو اور مغفرت (یا غفران) کے الفاظ میں جو فرق ہے اُس کی بھی تھوڑی سی وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے اسی لیے میں بعض مراتبِ عفو بھی سمجھ میں آ جاتے ہیں۔

زبانِ الہام و قرآن عربی کے دقیقہ سنجوں نے وضاحت کی ہے کہ ''عفو'' کے معنی یہ ہے کہ جسے معاف کر دیا جائے پھر اُس کی مَلامت و مذمت نہ کی جائے! لیکن مغفرت یا ''غفران'' یہ ہے کہ عقاب بھی ساقط ہو جائے اور ثواب بھی عطا کیا جائے۔ اور مغفرت و غفران کی نسبت سوائے پروردگار کے اور کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ بعض حضرات نے یہ بھی صراحت فرمائی کہ ''عفو'' فقط دارِ دنیا سے مخصوص ہے جبکہ غفران دارِ آخرت سے!

۱۳۵

اَب قرآن مجید کی وہ آیت بھی تلاوت کرلی جائے جو اِس موضوع پر اہم ترین اور عظیم ترین آیت ہے یوں قرآن مجید میں عفو وغفران کے موضوع پر اغلباً کوئی صفحہ خالی نہ ہوگا جس پر کوئی نہ کوئی آیت یا اشارت موجود نہ ہو۔ یہ سورۂ مبارکۂ انفال کی ۳۳ویں آیت ہے:

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ﴾

"اور اللہ ان پر عذاب نازل نہیں کرے گا جب تک (اے پیغمبر) آپ ان کے درمیان ہیں اور اللہ ان پر (اس وقت بھی) عذاب کرنے والا نہیں ہے جب تک یہ اُس سے مغفرت کے طلبگار رہوں!"

خدا نہ کرے کسی فرد یا کسی مِلّت سے ربّ کریم سے مغفرت طلبی اور پناہ جوئی کی توفیق ہی سلب ہوجائے!!

☆☆☆☆☆

(۱۰)

سپاسِ مالک و مُنعم ثنائے قدرت بخش!

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ مَالِكِ الْمُلْكِ مُجْرِي الْفُلْكِ مُسَخِّرِ الرِّيَاحِ
فَالِقِ الْاِصْبَاحِ دَيَّانِ الدِّيْنِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ"

تمام حمد اسی معبود کے لیے ہے

جو تمام ملکِ ہستی کا بادشاہ ہے

(بے کراں اور پُر طلاطم گہرے سمندروں میں) کشتیوں کا چلانے والا ہے۔

ہواؤں کو زنجیر پہنانے والا

صبح کو نمودار کرنے والا

روزِ جزا بھرپور جزائیں دینے والا

تمام جہانوں کا پالنے والا ہے

☆☆☆

حمد و ثنائے الٰہی کے اس فقرے میں قرآن مجید کی کم از کم پانچ آیتوں کا مضمون سمویا ہوا ہے۔ جس سے پانچ علیحدہ علیحدہ ابوابِ علم و معرفت کھلتے ہیں۔

پہلے ان آیات کی تلاوت کر لیجیے جن کے مضامین اور جن میں استعمال کیے گئے الفاظ و تراکیب دعا کے اس فقرے میں اخذ کیے گئے ہیں۔

(۱) سورۂ مبارکہ آل عمران کی ۲۶ ویں آیت ہے:

﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ

اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾

"کہو کہ خدایا تو ہی مُلکِ ہستی کا بادشاہ ہے جسے چاہتا ہے اِقتدار عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اقتدار لے لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت۔ تیرے ہاتھ میں ساری بھلائی ہے۔ یقیناً تو ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والا ہے"

خیال رہے کہ یہ آیت لفظ "قُل" سے شروع ہو رہی ہے اس لیے اس دعا میں "مالک الملک" کہہ کر اس کی حمد و ثنا بجا لا کر اِس امرِ الٰہی کی تعمیل بھی ہو جاتی ہے۔

اس آیت کے سیاقِ الفاظ سے ایک بڑا نکتہ یہ بھی مُستفاد ہوتا ہے کہ بے شک اصل صاحبِ اقتدار تو وہی پروردگار ہے لیکن وہ جسے چاہے اقتدار عطا بھی کر سکتا ہے! اس عطائے اقتدار میں اقتدارِ ظاہری، اقتدارِ باطنی، اقتدارِ معنوی، اقتدارِ مادّی ہر طرح کا اقتدار شامل ہے۔ چنانچہ اولیاء اللہ کے اقتدارِ روحانی اور تصرفاتِ معنوی کے لیے بھی یہ آیت مستحکم اساسِ فکر فراہم کرتی ہے۔

اس آیت میں اقتدار و عزت دیے جانے کے ساتھ ساتھ اقتدار کے واپس لینے اور ذلت دینے کی بات بھی کہی گئی ہے۔ لیکن اسی سیاقِ مضمون میں یہ بھی ہے کہ "تیرے ہاتھ میں ساری بھلائی ہے"۔ اس سے یہ معنی بھی مستفاد ہوتے ہیں کہ اگر ربِّ کریم کسی سے اقتدار لے لیتا ہے یا اگر واقعی اُس کی طرف سے کسی کو ذلت اُٹھانی پڑتی ہے تو اس میں بھی درحقیقت بھلائی کا پہلو ہوتا ہے۔ بے شک وہ ہر شے پر ہر طرح کی پوری قدرت رکھتا ہے ___ بظاہر ذلت دے کر بھی بہ باطن

فائدہ پہنچا سکتا ہے! اور پہنچاتا ہے!!

(۲) سورۂ مبارکۂ ابراہیم کی آیت ہے:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ﴾

(سورۂ ابراہیم / آیت ۳۲)

''اور اُس نے تمہارے لیے کشتیوں کو مسخر کر دیا ہے کہ اُس کے حکم سے سمندروں میں رواں دواں رہیں۔''

یہ جُملہ مخلوقات خصوصاً انسان پر ربِّ اکبر کے متعدد الطاف وعنایات کو شمار کراتے ہوئے ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں مظاہرِ قدرت وحکمت اور مناظر فطرت کی طرف اس زاویۂ فکر سے توجہ مبذول کرائی گئی ہے کہ اگر خالقِ متعال کی حکمت کارفرما نہ ہوتو بھلا انسان کو جو سہولتیں اس گہوارۂ فطرت، یا آغوشِ رحمت میں میسر ہیں وہ کیوں کر حاصل ہوسکیں گی؟

سطحِ سمندر پر کشتیوں کا چلنا ہمارے لیے کتنا مانوس، کس قدر پرکشش، کتنا مسرت بخش اور کس قدر لطف انگیز ہے! لیکن غور کیجیے کہ سیال پانی کی جو فطرت ہے، سمندروں اور دریاؤں میں پانی کے بہاؤ اور ٹھہراؤ کے جو فطری اصول ہیں، مرکزِ زمین سے لے کر محیطِ فلک الافلاک تک جو قوتوں اور کششوں کا تانا بانا ہے، پانی کی لہروں اور ہواؤں کی موجوں میں جو تال میل ہے، اگر یہ کچھ نہ ہوتو بھلا کشتیوں کو پانی میں ڈوبنے سے کون بچا سکتا ہے؟ اور کون ان قوتوں اور کششوں کو ایجاد کر کے انہیں یہ کمالِ توازن اور یہ نظم ونسق عطا کر سکتا ہے؟ سوائے اسی معبودِ برحق اور خالقِ متعال کے جس نے اِسے پہلی بار بنایا ہے اور جو اس پورے نظا کو درہم برہم

کر کے دوبارہ بھی بنا سکتا ہے اور وہ یقیناً ایسا کرے گا۔

سورۂ ابراہیم کی مُحولہ بالا آیت میں کشتی کے مسخر کرنے کی بات کہی گئی ہے اور سورۂ مبارکۂ جاثیہ (سورہ ۴۵) کی ایک آیت میں سمندروں کو مسخر کرنے کا مضمون بیان ہوا ہے۔

﴿اللّٰهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ﴾

(جاثیہ آیت ۱۲)

''اللہ ہی نے تمہارے لیے سمندروں کو مسخر کیا ہے تاکہ اس میں کشتیاں چل سکیں''۔

آیت کا اس کے بعد کا حصہ بھی قابلِ غور ہے:

﴿وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾

''تاکہ تم اُس کے فیضانِ کرم کو پا سکو اور اس کے شکرگزار بنو!''

(۳) سمندروں اور کشتیوں کی تسخیر کے ساتھ ہی دُعا میں تسخیرِ ہوا کا بھی ذکر ہے اور یہ بھی قرآنِ مجید کی ایک سے زائد آیتوں میں مذکور ہے۔ سورۂ صٓ کی ۳۸ ویں آیت ہے:

''فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ حَيْثُ أَصَابَ''

یہ جناب سلیمان علیہ السلام کے تذکرے کے ضمن میں ہے کہ: ''ہم نے ہواؤں کو ان کے لیے مسخر کر دیا کہ انہیں کے حکم سے وہ جہاں چاہیں چلیں۔''

(۴) سورۂ مبارکۂ انعام کی ایک آیت (آیت ۹۶) میں ہے:

﴿فَالِقُ الْإِصْبَاحِ وَجَعَلَ اللَّيْلَ سَكَنًا وَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ

حُسبَاناً﴾

''وہی صبح کو پیدا کرنے والا ہے اور اسی نے رات کو ظرفِ سکون اور سورج اور چاند کو پیمائش کا اوزار بنایا ہے۔''

قُرآنِ مجید میں ''فَالِقُ الاِصْبَاحِ '' کی ترکیب اسی ایک مقام پر آئی ہے۔ دعائے افتتاح میں یہ صفتِ باری دو بار دہرائی گئی ہے۔ ایک اِس فقرے میں ایک اِس کے ذرا بعد کے فقرے میں۔

''فالق الاصباح'' کے لفظی معنی تو یہی ہیں کہ ''صبح کا نور شگافتہ کرنے والا''۔ ''شگافتہ کرنے'' کا لفظ یہاں پر نہ صُبح سے تعلق رکھتا ہے نہ روشنی و نور سے، بلکہ جیسے اردو میں ''پو پھٹنا'' یا ''پو پھوٹنا'' بولتے ہیں، اسی طرح عربی میں ''فَلَق'' کا لفظ اس کے لیے استعمال ہوتا ہے کہ رات کی تاریکی شگافتہ ہوتی ہے تو صبح کا اجالا پھیلتا ہے۔

لیکن اگر ''پو پھٹنے'' کا ذکر بطورِ استعارہ کیا جائے تو پھر کسی بھی تاریکی یا ظلمت کے پردے کے چاک ہونے اور نُور کے ظاہر ہونے کے لیے بول سکتے ہیں۔

بعثتِ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو اُجالا پھیلا وہ بھی اُسی ''فالق الاصباح'' کا لطفِ عظیم تھا اور اب حضرت قائم آلِ محمدؐ کے ظہور سے جو روشنی پھیلے گی وہ بھی اُسی ''فالقِ اصباح'' کا احسانِ عظیم ہوگا۔ عجب نہیں کہ دعائے افتتاح میں جو یہ صفت باری دو بار آئی ہے اس کی تاویل یہی ہو!

حافظؒ نے اپنی عرفانی شاعری میں بھی اِس ترکیب سے کیا حسین استفادہ کیا ہے۔

سواد روئے تو تفسیرِ جاعِلُ الظلمات
بیاضِ روے تو تبیانِ فالقُ الاصباح

اسی طرح ایک اور شعر میں انتہائی وارفتگی کی کیفیت کے ساتھ یہ زمزمہ زبان پر لائے ہیں:

کدام طاعتِ شایستہ آید از منِ مَست
کہ رنگِ صُبح ندانم زِ فالقُ الِاصباح

''دیّان الدّین'' کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ خوب اچھی جزا یا نہایت معقول، منصفانہ اور سچی جزا دینے والا ہے، اور یہ بھی کہ وہ دل کھول کر نہایت فیاضی کے ساتھ کسی نادیدہ سے عمل کی بھی بہت زیادہ جزا دینے والا ہے۔ اور یہ بھی کہ وہی حقیقۃً ''دین'' کو دین بنانے والا ہے۔ وہی قوت وقدرت وحکمتِ آئین سازی کا سرچشمہ ہے۔ کسی بھی قانون کو اعتبار بخشنے کی حیثیت بس اُسی کو حاصل ہے اور وہی اُس کے نفاذ کی قوت بھی رکھتا ہے۔ اور اسی حیثیت سے اس نے ارشاد فرمایا ہے:

''اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الاِسْلَام''

یا یہ ارشاد کہ:

﴿شَرَعَ لَکُم مِنَ الدِّیْنِ مَا وَصّیٰ بِہٖ نُوحاً وَالَّذِیٓ اَوحَینَا اِلَیکَ وَمَا وَصَّینَا بِہٖ اِبرٰھِیمَ وَ مُوسیٰ وَ عِیسیٰٓ اَنْ اَقِیمُوا الدِّیْنَ وَ لَا

تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ﴾ (سورۂ شوریٰ۴۲؍آیت ۱۳)

"اس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کی اس نے نوح کو وصیت کی تھی، اور جس کی تمہیں وحی کی ہے اور جس کی وصیت ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ سے کی تھی کہ دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ پیدا نہ کرو۔"

یا ربِّ اکبر کا یہ ارشادِ گرامی:

﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِی وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْناً﴾

"آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو پسندیدہ دین قرار دے دیا!"

☆☆☆☆☆

(۱۱)

ثنائے حلم وسپاسِ رحمت

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰى عِلْمِهٖ بَعْدَ حِلْمِهٖ

وَالْحَمْدُلِلّٰهِ عَلٰى عَفْوِهٖ بَعْدَ قُدْرَتِهٖ

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى طُوْلِ اَنَاتِهٖ فِي غَضَبِهٖ

وَهُوَ قَادِرٌ عَلٰى مَا يُرِيْدُ!

''تمام حمد ہے اسی معبود کی کہ وہ (اپنے بندوں کی نافرمانیاں) جانتے ہوئے بھی بردبار ہے۔

تمام حمد ہے اسی معبود کی جو (انتقام وسرزنش کی) قدرت رکھتے ہوئے معاف کرتا ہے!

تمام حمد ہے اسی معبود کے لیے جو بہت دیر میں غضب فرماتا ہے جبکہ وہ جو چاہے کرسکتا ہے!''

حمد وثنائے الٰہی کے اس فقرے میں اردو والوں کے لیے صرف ایک لفظ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے وہ ہے لفظِ ''اناتِہٖ'' ورنہ حِلم، علم، عفو، قدرت، طول، غضب وغیرہ تمام الفاظ نہ صرف یہ کہ مانوس ہیں بلکہ اردو کے محاورات اور روز مرہ میں شامل ہیں۔ لیکن ذرا سی چھان بین کیجیے تو معلوم ہوجائے گا کہ لفظ ''اناۃ'' کے مادّے سے بھی اردو زبان میں ایک لفظ مستعمل رہا ہے۔ ''تَاَنّی'' صاحبِ لغاتِ کشوری مولوی سید تصدق حسین رضوی اور صاحبِ فرہنگِ عامرہ محمد عبداللہ خاں خویشگی نے اِس لفظ کو اپنے اپنے لغت میں جگہ دی ہے۔ اور حیرت کی بات ہے صاحبِ مہذب اللغات نے اِسے اپنے ضخیم لغت میں جگہ نہ دی۔

بہرحال تَاَنّی یعنی تاخیر یا تاخیر سے کام لینا، اور اَناۃ یعنی بردباری، حِلم، غصہ اور غضب کے اظہار میں تحمّل اور تاخیر سے کام لینا، اِن دونوں الفاظ کا مادّہ اَنیٰ یَنِی ہے جس سے تَاَنّٰی یَتَاَنّٰی اور استأنیٰ یَسْتَانِی وغیرہ ابواب عربی میں مستعمل ہیں۔

مضمون ومفہوم کے لحاظ سے دعائے افتتاح کے یہ فقرے ربِّ کریم کے حلیم، صبور، عَفُوٌّ، رؤف اور منّان جیسے اسما وصفات کے برکات وتجلیات کی طرف مُلتفِت کرتے ہیں۔

اس کے ضمن میں مختلف اور متعدد زاویوں سے گفتگو ممکن ہے لیکن ہم صرف ایک نکتہ کو پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

اکثر وبیشتر یہ سوال سامنے آتا رہتا ہے کہ ربِّ اکبر آخر ظالموں کی رسی دراز کیوں فرماتا ہے؟ گنہگاروں کو فرصتِ گناہ اور مہلتِ زندگی ہی کیوں میسر ہوتی ہے؟

یہ سوال کبھی مباحثِ خیر وشر کے ضمن میں سامنے آتا ہے تو کبھی مسائلِ جبر و اختیار کے ذیل میں اور کبھی بغیر کسی خاص فلسفیانہ یا کلامی عنوان کے محض جذباتی انداز میں ذہنوں کو جھنجھوڑتا ہے۔ علما اور متکلمین نے اِس پر مختلف زاویوں سے تقریریں کی ہیں۔ لیکن ہم صرف قرآن مجید کی آیتوں پر اس بحث کا دارومدار رکھتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ حلم ایک ممدوح صفت ہے، اور علمِ اخلاق ونفسیات کی روشنی

میں دیکھا جائے تو یہ شجاعت کے اقسام یا مراتب یا مظاہر میں شمار ہوتی ہے۔ مافوقِ طبیعت و مافوقِ تجزِ حقیقت کے تعلق سے بھی حلم علم وقدرت کے مظاہرِ جمالی میں سے ہے۔

انسان پہلے سے مُطلع ہوئے بغیر کسی بُرائی یا مضرّت سے دوچار ہونے پر تحمل سے کام لیتا ہے تو اسے حِلم کا نام دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر علم واطلاع رکھتے ہوئے مضرّت کو برداشت کرتا ہے تو اسے کبھی حلم قرار دیتے ہیں اور کبھی اسے قطعاً کوئی ممدوح صفت قرار نہیں دیتے بلکہ اس کے برعکس قابلِ مذمت خصوصیت قرار دیتے ہیں۔

ربِّ اکبر کے صِفات کے تعلق سے ظاہر ہے کہ علم واطلاع کے نہ ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور علم ہوتے ہوئے، اپنے بندوں کی نافرمانیوں کو جانتے ہوئے بردبار رہنے کو مطلقاً ممدوح اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ اُس کی اس طرح کی بُردباری سے خود اُسے کوئی بھی نقصان پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اور اس کی بردباری سے دوسروں کو بھی ہمیشہ فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے۔ اور اس کے مخلص یا مومن بندوں کے حق میں، کہ جن سے خطاؤں کا صدور یقیناً نادانی، سہو یا پھر کسی طرح کے اضطرار کی کیفیت ہی میں ہوتا ہے، یہ حِلم و بُردباری بہر حال ممدوح و مستحسن ہے۔ لیکن جہاں تک کافروں، مشرکوں اور کھلے ہوئے ظالموں، فاسقوں کا سوال ہے، ان کے معاملے میں رب کریم کا تامُّل وتانّی اختیار فرمانا بندوں کی ناقص عقلوں میں نہیں آتا۔ اور اتنی آسانی سے یہ بات عقل میں آ بھی نہیں

سکتی۔ بقول شیفتہ ع

واجب کی حکمت آئیگی ممکن کی عقل میں کیا؟

اس لیے اس سوال کا جواب اور اس حکمت کا انکشاف ربِّ اکبر نے خود ہی فرمادیا ہے:

﴿وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوٓا اَنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ط اِنَّمَا نُمْلِي لَهُمْ لِيَزْدَادُوٓا اِثْمًا وَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ﴾

(سورۂ آلِ عمران آیت ۱۷۷)

''کفر اختیار کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم انہیں ڈھیل دے رہے ہیں اس میں ان کے لیے کوئی بھلائی ہے بلکہ ہم صرف اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ جتنا گناہ کرسکیں کرلیں، ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے!''

یہ وہی آیت ہے جسے معصومۂ کربلا عقیلۂ بنی ہاشم ام المصائب زینب بنتِ امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے دربار دارِشام کے سامنے تلاوت فرمایا تھا۔

اسی طرح سورۂ قلم میں ارشاد ہوا:

﴿وَاُمْلِي لَهُمْ اِنَّ كَيْدِي مَتِينٌ﴾

''اور ہم انہیں ڈھیل دے رہے ہیں، یقیناً ہمارا منصوبہ مضبوط ہے۔''

سورۂ بقرہ کی اس آیت سے بھی اس موضوع پر بہت روشنی پڑتی ہے:

﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ﴾

''خدا خود اُن کی ہنسی اڑا رہا ہے کہ اُنہیں سرکشی میں ڈھیل دیے ہوئے ہے

اور یہ اندھے ہو کر بہک رہے ہیں!"

یہ اور اسی قبیل کی دوسری آیتوں کے پیغامات پر غور کر کے اس طرح کے سوالات یا شبہات کا قلعہ قمع کیا جا سکتا ہے۔ اور کافرین کے بارے میں تدبیر و حکمتِ الٰہی کا، نیز مؤمنین و مخلصین کے حق میں اس کی رحمت و رأفت کا تھوڑا سا ادراک کیا جا سکتا ہے۔

فالحمد لله علی حِلمِه بعدَ عِلمه...!!!

☆☆☆☆☆

(۱۲)

سپاسِ خالق و رزّاقِ ماورائے نظر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ خَالِقِ الْخَلْقِ بَاسِطِ الرِّزْقِ فَالِقِ الْاِصْبَاحِ ذِي الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ وَالْفَضْلِ وَالْاِنْعَامِ الَّذِي بَعُدَ فَلَا يُرَىٰ وَقَرُبَ فَشَهِدَ النَّجْوَىٰ تَبَارَكَ وَ تَعَالَىٰ۔

"تمام حمد ہے اسی معبود کے لیے جو تمام خلقت کا پیدا کرنے والا ہے، روزی رساں ہے، سویرے کا نور کاڑھنے والا ہے، بزرگ ہے اور بزرگی عطا کرنے والا ہے، پرفیض ہے اور نعمتیں بانٹنے والا ہے، جس نے ایسی دوری اختیار کی ہے کہ نظر نہیں آتا اور جو ایسا نزدیک ہے کہ سرگوشیاں بھی سنتا ہے، بابرکت ہے اور بلند ہے۔"

☆☆☆

قرآن مجید میں جس کا بنیادی موضوع ہی "توحید" ہے اور حیات و کائنات سے متعلق تمام مضامین اسی ایک موضوع سے نکلتے چلے گئے ہیں، ایک مقام پر کہا گیا ہے :

﴿وَلَوْ اَنَّمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ﴾ (لقمان ۲۷)

"روئے زمین پر جتنے درخت ہیں سب قلم بن جائیں اور سارے سمندر روشنائی بن جائیں، اس میں سات سمندر اور بھی مل جائیں، تب بھی اللہ کی باتیں (اُس کے اسماء وصفات، اُن کے برکات وتجلیات) ختم ہونے والی نہیں...!"

اسی مضمون کو ہمارے خدائے سخن میر تقی میر علیہ الرحمہ نے اپنی اردو میں

اس طرح ادا کیا ہے ۔

اشجار خامہ ہوویں جو آبِ سیہ بحار
لکھنا نہ تو بھی ہو سکے اُس کی صفات کا!

حمد وثنائے الٰہی کے تسلسل میں دعائے افتتاح کا یہ دسواں فقرہ ہے۔ جس میں اس کی خالقیت، رزّاقیت، نورانیت، اُس کے جلال و بے نیازی کے ساتھ اِکرام ونوازش، اُس کے جود وسخا، اُس کی بے انتہا بلندی اور اُس کی بے پایاں قربت کی عاجزانہ تحسین اور شکر گزاری ہے!

بلاشبہ وہی تمام ہست و بود کا خالق ہے۔ مخلوقات میں سے کوئی بھی شے خود بخود خلق نہیں ہوئی ہے۔ نہ کوئی اس کے علاوہ یا اُس کے ساتھ مل کر خلق کرنے والا ہے۔ جس کے پاس بھی کوئی تخلیقی ہنر ہے کوئی فرزندِ آدمؑ ہو کہ دل بندِ مریم، سب کو اسی پروردگار کی عطا ہے۔ حضرت مسیح کی گواہی ہے:

﴿اِنِّي اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ● وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَ اُحْيِ الْمَوْتٰى فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ...﴾

"میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل بناتا ہوں پھر اس میں دم کرتا ہوں تو وہ پرندہ بن جاتا ہے اللہ ہی کے اذن سے! اور میں اندھے اور کوڑھی کو شفا دیتا ہوں اور مردوں کو زندہ کرتا ہوں اللہ ہی کے اذن سے!!"

اُس کے اذن کے بغیر کوئی نہ ماں کسی بچے کو جنم دے سکتی ہے نہ کوئی زمین

کوئی پر کاہ روئیدہ کر سکتی ہے نہ کوئی بادل ایک قطرۂ آب ارزانی کر سکتا ہے...نہ کوئی دل کوئی جذبہ پیدا کر سکتا ہے نہ کوئی ذہن کسی فکر کو پروان چڑھا سکتا ہے نہ کوئی قلم کوئی حرف لکھ سکتا ہے نہ کوئی لبِ اظہار کوئی آواز اٹھا سکتا ہے!

یہ سب کچھ جو دنیا میں ہو رہا ہے اُسی کی عطا کردہ تخلیقی صلاحیتوں سے ہو رہا ہے اور اس تقریر سے کوئی یہ بھی نہ سمجھ بیٹھے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اُسی کی ''مرضی'' کے مطابق ہو رہا ہے۔ کوئی نظام جبر قائم ہے! ہرگز نہیں یہ نظامِ اختیار و ''اذن'' ہے، یہ نظام رحمت و رأفت ہے۔ اُسی کی عطا کردہ صلاحیتوں کو اس کے بندے اُسی کی مرضی کے خلاف استعمال کر رہے ہیں لیکن وہ کریم نہ اُن سے اُن کا وجود سلب کرتا ہے نہ اُن پر اُن کا رزق تنگ کرتا ہے!

وہ ایسا ''باسط الرزق'' ہے کہ دوست دشمن، مقرٌ منکر، مؤمن کافر سب کو اُن سب کی ضرورتوں کے مُطابق رزق عطا کرتا ہے۔ کوئی اس کا کلمہ پڑھے چاہے نہ پڑھے شکر گزار ہو یا کفرانِ نعمت کرے!

ہاں وہ ''فالقُ الِاصباح'' بھی ہے۔ ہر طرح کی تاریکیوں کو دُور فرماتا رہتا ہے۔ نُور بکھیرتا رہتا ہے۔ کوئی ہدایت نہ پائے اپنی آنکھیں ہی بند کیے رہے اور بند ہی کیے رہے یہ اور بات ہے۔

اس سے قبل بھی ''فالق الاصباح'' کی تعبیر گزر چکی ہے۔ سیاقِ عبارت سے وہاں پر اِس کا مفہوم نورِ ایجاد و خلق و تکوین کے اِفاضہ سے متعلق معلوم ہوتا ہے یعنی وجودی (Ontological) یا کونیاتی (Cosmological) ہے۔ مُناسب

یہ ہے کہ دونوں مفاہیم شاملِ مراد سمجھے جائیں۔ لیکن اس مقام پر خلق و بسطِ رزق کے سیاق میں یہ نورِ ہدایت آشکار کرنے کے مفہوم کا حامل معلوم ہوتا ہے۔ یعنی جَہل کی تاریکی شگافتہ کر کے نورِ علم پیدا کرنے والا۔ یہ مفہوم اِس لیے قرینِ مُراد معلوم ہوتا ہے کہ علم و ہدایت بھی ''رزق'' ہے! علم غذائے روح ہے اور ''رزق'' کا مفہوم صرف غذائے مادّی تک محدود نہیں ہے بلکہ تمام ضروریاتِ زندگی کو شامل ہے اور اس اعتبار سے بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اُس فالق الِاصباح کا ایک لُطفِ خاص تھا۔ انشاء اللہ ظہورِ خاتم الوصیین حضرت مہدی منتظر علیہ السلام بھی اُسی ''فالق الاصباح'' ہی کے لطف و کرم سے ہوگا۔ کہ وہی بے نیاز صاحبِ جلال اپنے بندوں کی نیازمندیوں سے واقفیت رکھتا ہے اور انہیں رفع کرتا ہے اور یقیناً وہی اپنے کرم اور نوازش سے اضطراب و حیرت اور ظلم و جور کو دور فرمائے گا اور اپنا فضل و انعام فرمائے گا۔

''ذوالجلال و الاکرام'' کہنے کے بعد ''اَلَّذِی بَعُدَ فَلَا یُرٰی اور قَرُبَ فَشَھِدَ النَّجوٰی'' کہنا اس کے جلال و اکرام کے مظاہر کا تذکرہ کرنے کے مترادف ہے۔

اس کا جلال ہی تو اُس کا سب سے بڑا حجاب ہے! عرفانی چشم و گوش اور دل کا ہوش رکھنے والے اس کے جلال کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں لیکن کلامی زاویۂ فکر و نظر رکھنے والوں کے لیے مسئلہ رُویت بڑا ہی پیچیدہ اور دشوار مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس لیے ''الذی بعد فلا یُرٰی'' کا فقرہ ذہن کو اس مشہور کلامی بحث کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔

رُویتِ حضرت باری تعالیٰ عزّ اسمہ وجل شأنہ کا مسئلہ قرآنِ مجید کی ایک آیت کے پیغام کو درست سمجھنے یا نہ سمجھ پانے سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ سورۂ مبارکہ قیامت کی ایک آیت ہے جس پر بحث ونظر کی ایک قیامت برپا ہے۔ آیت کو اس کے پورے سیاق وسباق کے ساتھ تلاوت کیجیے اور لب ولہجۂ قرآن کو سمجھیے تو مشکل یہیں پر حل ہوسکتی ہے لیکن اسے کیا کیجیے کہ آیات وپیغاماتِ الٰہی کو سمجھنے کے لیے اُس کے صحیح طریق کار اور صحیح مآخذ سے استفادہ نہیں کیا جاتا تو مشکلات حل ہونے کی بجائے بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں۔

ارشادِ قرآنی یہ ہے کہ:

﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ

اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ

تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ بِهَا فَاقِرَةٌ﴾

"کچھ چہرے اُس دن کھِلے ہوئے ہوں گے

اور وہ اپنے پروردگار کی طرف دیکھ رہے ہوں گے

اور کچھ چہرے مرجھائے ہوئے ہوں گے

اس اندیشے میں کہ اُن کے پرخچے کردیے جائیں گے"

آیتوں کا منطوق ومفہوم دونوں بہت صاف ہے گنہ گار عذاب کے اندیشے میں ڈوبے ہوئے ہوں گے اور نیکوکار اپنے رب سے امیدِ جزا ونعمت لگائے

ہوئے ہوں گے۔ کسی کی طرف دیکھنا اُس کی ذات سے امید لگانے کے لیے بولتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں بھی کسی کی طرف "دیکھنے" کا لفظ استعمال ہو وہاں حقیقی معنی میں اُسے دیکھنا مراد ومقصود ہو۔ پھر جبکہ جسم وجسمانیات سے اُس کا مُنزّہ ہونا ثابت اور غیر اختلافی ہے۔ مکان ومکانیات، زمان وزمانیات، سَمت ومحاذات اور چشمِ ظاہر سے حسبِ ظاہر دیکھنے کے تمام شرائط ہی مُنتفی ہیں تو پھر "دیدار" کے امکان یا وقوع پر اصرار کا محل ہی کیا رہ جاتا ہے۔ اور جہاں تک چشمِ باطن سے حسبِ حقیقت رویت کی واقعیت کا ماجرا ہے تو وہ اُس قیامت پر کہاں موقوف ہے!

ع اُس نے کب کس سے کسی بھی طرح کا پردہ کیا؟

یوں سوچیے تو جتنے شرائطِ رویت عِلم مَناظِر میں مقرر ہیں وہ سب تو آج بھی اور ہر لحظہ وہر آن اور ہر گوشۂ امکان میں، متحقق ہیں کیوں کہ حضرتِ حق سبحانہ وتعالیٰ نے خود ہی فرمایا ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ﴾

"وہ تو تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو"

اور یہ کہ

﴿فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾

تم جدھر بھی رخ کرو اللہ تمہارے روبرو ہے!

اور یہ کہ

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ﴾

''اور ہم اس سے (انسان سے) رگِ گردن سے زیادہ قریب ہیں۔''

لیکن اِس کے باوجود وہ چشمِ ظاہر سے حسبِ ظاہر نظر نہیں آتا، اور حقیقت حال یہی سامنے آتی ہے کہ ''الذی بعدَ فلایُریٰ''۔

اس حقیقتِ حال پر میر انیس نے کیا عمدہ رباعی ارشاد فرمائی ہے۔

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تُو
آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
نزدیک رگِ گلو سے اُس پر یہ بُعد
اللہ اللہ کس قدر دُور ہے تو!

دیوانِ کلامِ اسلامی یعنی تجرید محقق طوسیؒ میں تو اس مسئلے کو جس اصلِ اصیل اور اساسِ متین ورصین پر حل وفصل کیا گیا ہے وہ صرف ''وجوب الوجود'' ہے اور حق و انصاف کی بات یہ ہے کہ یہی حکیمانہ اساس حقیقۃً اس مسئلے کا حل پیش کر دیتی ہے، محقق طوسیؒ کے یہ ریزہ ہائے الماس ملاحظہ فرمائیں:

''وَوُجوبُ الوجودِ يَدُلُّ علىٰ سَرمَدِيَّتِهٖ وَ نَفْيِ الزَّوائِدِ والشَّرِيْكِ وَالمثلِ و التَّرْكِيبِ بِمعَانِيهِ والضدِّ و التحَيُّزِ والحُلُولِ وَ الاتِّحادِ وَ الجهةِ و حُلولَ الحَوادِثِ فِيْهِ، وَ المعَانِىَ الاحوالِ والصِّفاتِ الزائِدَةِ عَيْناً والرُّؤْيَةِ...''

اس عبارت کے پورے ترجمے کی یہاں پر حاجت نہیں ہے۔ توجہ صرف

اس نکتہ کی طرف دلانی ہے کہ جناب خواجہ نے رویت کو بھی دوسرے تمام صفاتِ سلبیہ یا صفاتِ جلالیہ کے زمرے میں رکھتے ہوئے ایک صفتِ وُجوب کو اساس قرار دیتے ہوئے حضرتِ اقدس الٰہی سے مستبعد قرار دیا ہے۔ اور اس کے بعد کی عبارت میں خصوصیت کے ساتھ مسئلہ رویت کے مؤیدین کے دلائل کا جواب تحریر فرمایا ہے۔

''وَسوَالُ موسیٰ لِقوْمِه والنظر لایَدُلُّ علیٰ الرّویة مَعَ قَبُولِ التأویلِ و تَعْلِيْقُ الرُّؤْيَةِ باستقرارِ المُتحرّکِ لا يَدُلُّ عَلىٰ الامْكانِ!''

حضرتِ واجب الوجود کا چشم سر سے نظر آنا ناممکن ہے۔ اور جنابؑ کا اپنی قوم کے لیے حضرت باری تعالیٰ سے رویت کی درخواست کرنا یا آیت قرآنی میں لفظ نظر کا استعمال واطلاق جبکہ اس کی تاویل ممکن ہے، بلکہ ظاہر ہے، رویت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اور اسی طرح رویت کو مُتحرک پہاڑ کے استقرار پر معلق ومشروط قرار دینا بھی امکانِ رویت کی دلیل نہیں بن سکتا۔''

اس مختصر عبارت میں محقق طوسیؒ نے حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے بچشم سر رویت کے قائلین کو تشفی بخش جوابات دے دیے ہیں۔ بطورِ استدراک یہ عاجز و قاصر صرف اس قدر عرض کرنا چاہتا ہے کہ قائلینِ رویت ''التماسِ موسیٰ'' کو دلیل بناتے ہیں جواب ربِّ موسیٰ پر ذرا بھی کان نہیں دھرتے کہ فرمایا: ﴿لَنْ تَرانِیْ﴾ مجھے بچشمِ سر کبھی نہیں دیکھ سکتے!!

ہاں! اس بحث کو پھر اس نکتے کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہ وہ چشمِ ظاہر (بہ چشمِ سر) حسبِ ظاہر کبھی بھی نظر نہیں آ سکتا، البتہ نگاہِ باطن یا دیدۂ دل سے کبھی بھی

روپوش نہیں رَہتا جبھی تو مولائے موحدین امیر المؤمنین علیہ السلام نے ذِعلبِ یمانیؒ سے فرمایا تھا:

''اَفَاَعۡبُدُ مَالَا اَرٰی؟''

''کیا میں ایسے رب کی عبادت کرتا ہوں جسے دیکھتا نہیں ہوں؟''

آپ کا یہ فقرہ مختلف روایتوں میں مختلف الفاظ میں نقل ہُوا ہے، لیکن تمام روایتوں کو پیشِ نظر رکھ کر فی الجملہ اس واقعہ اور مکالمہ کی تصدیق ضرور کی جاسکتی ہے۔

اب اس سلسلۂ بحث ونظر سے قطعِ نظر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث پر غور کیجیے۔ میر انیسؒ کی ایک اور انتہائی لطیف رباعی پڑھیے اور وجدانِ عشق وعرفان پر وَجد کیجیے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''مَنۡ رَآنِیۡ فَقَدۡ رَی الۡحَقَّ''

''جس نے مجھے دیکھا اُس نے حق کا دیدار کیا!''

اور میر انیسؒ نے فرمایا:

یا ختمِ رُسل مَستِ مئے الفت ہیں!
قدموں کی قسم کہ عاشقِ صورت ہیں!
دیکھا جو حضورؐ کو، خدا کو دیکھا
اِس وجہ سے ہم بھی قائلِ رُویَت ہیں!!

☆☆☆☆

(۱۳)

حمدِ یگانہ ویکتا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي لَيْسَ لَهٗ مُنَازِعٌ يُعَادِلُهٗ

وَلَا شَبِيْهٌ يُشَاكِلُهٗ

وَلَا ظَهِيْرٌ يُعَاضِدُهٗ

قَهَرَ بِعِزَّتِهِ الْاَعِزَّاءَ

وَتَوَاضَعَ لِعَظَمَتِهِ الْعُظَمَاءُ

فَبَلَغَ بِقُدْرَتِهٖ مَايَشَاءُ

''تمام حمد ہے اسی معبود کی جس کے برابر کا اس سے کوئی جھگڑنے والا نہیں ہے۔

نہ اس کے جیسا کوئی اُس کا مثل ونظیر ہے

نہ اس کو سہارا دینے والا کوئی پشت پناہ!

اس نے اپنی شان سے تمام عزیزانِ دہر کو زیر کیا

اور تمام بزرگانِ دہر نے اس کی بزرگی کے سامنے فروتنی اختیار کی

اور اس نے اپنی قدرت سے جو چاہا کیا!''

اس فقرے کے الفاظ زیادہ بحث وتحقیق کے متقاضی نہیں معلوم ہوتے۔

مضمون اصطلاحی طور پر ''توحیدِ تنزیہی'' ___ نفیِ شرک ___ وحدت مطلقہ اور وحدتِ حقہ ہی کے اثبات واعتراف کا ہے۔ معبودِ برحق کی یکتائی اور یگانگی کا اِس سے مشابہ بیان اس دُعا کے پانچویں اور چھٹے فقروں میں گزر چکا ہے۔ انسان عقل کی بے حاصلی اور بے حوصلگی، نیت کی کھوٹ، دل کی ویرانی، دارِ دنیا یا دارِ غفلت میں انہماک

اور غفلت شعاری، بے ضمیری، غرض بہت سے اسباب کی بنا پر حقیقتِ توحید کو درک و دریافت کرنے سے عاجز یا قاصر رہ جاتا ہے اور طرح طرح سے مشرکانہ خیالات میں گرفتار ہوتا رہتا ہے۔ اسی لیے اہلِ تحقیق اربابِ توحید گوناں گوں اسالیب میں بار بار شرک کی نفی اور ربِ اکبر کی یکتائی بیان کرتے رہتے ہیں۔ پھر کچھ یہ بھی ہے کہ جب عرفان وعشق کمال پر ہوتا ہے تو ذکرِ محبوب میں زیادہ سے زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے بقولِ حضرت آثر لکھنوی:

دَخل ہے اس کو بہت کچھ مرے تڑپانے میں

وہ جو لذت ہے ترے نام کے دہرانے میں

اور کچھ یہ بھی ہے کہ ربِ اکبر ہی نے اپنے مخلصین کو حمد وثنا، ذکر وتسبیح، توصیف وتمجید، شکر وسپاس، دعا اور مناجات کے گوناگوں عارفانہ اسالیب میں اپنی وحدانیت کے بیان کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائی ہے تاکہ ان فقروں میں الفاظ کی ذرا ذرا سی ردوبدل اور مضامین میں تھوڑے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اُن مغالطوں کے کافی وشافی جوابات فراہم ہوجائیں جو مختلف مُشرکانہ اور ملحدانہ مذاہب رکھنے والے طرح طرح کی تشکیک اور توہمات کی شکل میں پیش کرتے رہتے ہیں۔

اسی کے ساتھ اس کے مختلف ''صفات'' کا بیان بھی ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً اِس دُعا کے آغاز سے اب تک اس کی چند صفتوں کا تذکرہ ہوا۔ اب اس فقرے میں ایک اور صفت کا تذکرہ سامنے آیا اور وہ صفت ''قہاریّت'' ہے۔

"قَھَرَ بِعِزَّتِہِ الْاَعِزَّاءِ" کا جملہ ربِ اکبر کے اسم گرامی "قہّار" میں غور و خوض کا مقتضی ہے۔ لیکن یہ بحث شرحِ دعائے جوشنِ کبیر میں آگئی ہے اس لیے یہاں پر اس کی پوری تفصیل پیش کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مختصراً صرف دو مطالب کی طرف اشارے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اوّلاً: یاد رکھنا چاہیے کہ اسمِ مبارکِ "قہّار" کا مفہوم ذہنِ عوام میں کچھ عجیب سا ہے، جبکہ یہ اسم مبارک بھی معبودِ برحق کے اسمائے حُسنیٰ میں سے ہے۔ اور اِس میں مخلوقات کے لیے افاضۂ صفات اور نفاذِ مصالحِ الٰہیہ کے برکات پائے جاتے ہیں۔

ثانیاً: اس کے معنی اور اطلاقات کو معصومین علیہم السلام کے اِرشادات میں جا بجا تلاش کرنے کی ضرورت ہے مثلاً حضرتِ امیر المؤمنین علیہ السلام سے منسوب دعائے صباح میں یہ جملہ بہت معنی کشا ہے کہ:

"یَامَنْ تَوَحَّدَ بِالعِزِّ وَ البَقَاءِ وَ قَھَرَ عِبَادَہُ بِالمَوْتِ و الفَنَاءِ"

"اے وہ کہ جس نے اعزاز و بقا کے ساتھ یکتائی حاصل کی اور مرگ و ناتمامی کے ذریعہ اپنے بندوں کو زیر کیا" [1]

عارفوں، عاشقوں یا دوسرے لفظوں میں شیعیانِ خدا کے لیے اُس کے قہر میں بھی بے پناہ لذت ہے۔ جس کا ادراک اس کی معرفت اور محبت سے خالی دل و دماغ کے لوگ کسی طرح نہیں کر سکتے۔ حضرت مولانا صفی لکھنوی کا شعر ہے۔

[1] فنا، بقا کی ضد ہے "بقا میں" "دوام" کے معنی ہیں تو اس کی ضد "ناتمامی" قرار پاتی ہے جو نابودی کو بھی مستلزم ہے۔"

کچھ ہمارا ہی دل سمجھتا ہے

اُن کے لطف و عتاب کا عالم!

بلاشبہ اُس کی قہاریّت کی شان بھی ہر آن، ہر مکان، ہر فرد، ہر فرمان میں جُدا جُدا ظاہر ہوتی ہے۔ یہ بھی اس کی قہاریت ہی کی ایک شان ہے جس کی ترجمانی حضرت اکبر الہ آبادی کے اس شعر میں ہوتی ہے۔

خدا سے بیگانہ تھی طبیعت دلی ارادوں پہ تھا بھروسہ

عزیمتیں فسخ ہوگئیں جب عرفت ربی عرفت ربی [1]

یا اسی مضمون کا انہیں کا ایک شعر ہے۔

تدبیر سدا راس جو آتی نہیں اکبر

انسان کی طاقت کے سوا بھی ہے کوئی چیز

اور یہ بھی ایک شانِ قہاریّت ہی ہے جسے مولانا حالی کے پاکیزہ وِجدان نے شعر کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔

اُن کے غصے میں ہے دلسوزی ملامت میں ہے پیار

مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح

یہی سبب ہے کہ ادا شناسانِ مشیت "قہرِ الٰہی" کے مقابلے میں تسلیم و تواضع کی خو پیدا کرتے ہیں نہ کہ بغاوت یا سرگرانی یا قرآنی تعبیر میں "استکبار" کی ___ اور اسی لیے

[1] اکبر الہ آبادی کے اس شعر کا مضمون دراصل حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ایک مشہور قول سے ماخوذ ہے۔ یہ قولِ فنِ حدیث کی اصطلاح میں صحیح اسناد کے ساتھ آنجنابؑ سے مروی ہے:

"عرفتُ رَبّی بفسخ العزائم"

اسی سیاق میں، دُعا کے اسی فقرے میں کہا گیا ہے:

"وَتَوَاضَعَ لِعَظَمَتِهِ العُظَمَآءُ"

''اور تمام بزرگانِ دہر نے اُس کی بزرگی کے سامنے فروتنی اختیار کی''

اس جملے میں عظماء سے مراد مستعمرین و مستکبرین و طواغیت نہیں ہیں کہ وہ کسی ''داعی الی اللہ'' یا ''ناجی من اللہ'' کی تعبیر میں عظمت سے متصف نہیں ہو سکتے، یہاں مُراد شیعانِ خدا ہیں جو جاہت کے ساتھ اطاعت کی اور ہر ہر تقاضائے مشیت کے سامنے تواضع و تسلیم کی خُو رکھتے ہیں۔ اور انہیں کے وسیلے سے ربِّ اکبر اپنی قدرتوں اور مشیتوں کا اظہار فرماتا رہتا ہے، "فَبَلَغَ بِقُدْرَتِهِ مَا يَشَآءُ" ـ ''اور اس نے اپنی قدرت سے جو چاہا کیا''۔

☆☆☆☆☆

(۱۴)

زمزمۂ ثنا

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يُجِيْبُنِي حِيْنَ اُنَادِيْهِ وَيَسْتُرُ عَلَيَّ كُلَّ عَوْرَةٍ وَاَنَا اَعْصِيْهِ وَيُعَظِّمُ النِّعْمَةَ عَلَيَّ فَلاَ اُجَازِيْهِ فَكَمْ مِنْ مَوْهِبَةٍ هَنِيْئَةٍ قَدْ اَعْطَانِي وَعَظِيْمَةٍ مَخُوْفَةٍ قَدْ كَفَانِي وَبَهْجَةٍ مُوْنِقَةٍ قَدْ اَرَانِي فَاُثْنِي عَلَيْهِ حَامِداً وَاَذْكُرُهُ مُسَبِّحاً.

''حمد ہے اس معبود کی! جسے میں پکارتا ہوں تو وہ میرا جواب دیتا ہے، اور میری ہر برائی کو چھپاتا ہے جبکہ میں اس کی نافرمانی کرتا ہوں، اور مجھ پر نعمتوں کی فراوانی کرتا ہے جبکہ میں اس کا صلہ نہیں دیتا، نہ جانے کتنی خوشگوار نعمتیں اس نے مجھے عطا کیں ہیں، اور نہ جانے کتنے خوفناک مہلکوں میں اس نے مجھے بچایا اور مجھے نرالی خوشیاں دکھائیں، بس میں شکر گزاری کرتے ہوئے اس کی نیکیاں دہراتا ہوں اور تسبیح پڑھ کر اس کو یاد کرتا ہوں!''

ربِّ کریم کی کتنی ہی مخصوص عنایتیں ہر ہر فرد کے شاملِ حال رہتی ہیں اس کی معرفت صرف کسی کسی کو ہوتی ہے۔ دعائے افتتاح کے اس فقرے میں اِسی حقیقت کا اظہار فرمایا گیا ہے۔

وہ سمیع و مجیب ہر ایک کی ہر بات سنتا ہے، خصوصاً کوئی فریاد و فغاں اس کی بارگاہِ اقدس میں ''صدا بصحرا''نہیں ہوتی! وہ خود ہی ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَاِذَا سَئَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّی فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ﴾

''اور جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں (تو آپ فرمادیں کہ) میں نزدیک ہی ہوں، پکارنے والے کی آواز پر آواز دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارے! بس ان کے لیے ضروری ہے کہ میری آواز پر آواز دیں

اور مجھ پر یقین رکھیں تاکہ صحیح راستا پا جائیں!''

یہ آیتِ کریمہ مسئلۂ دعا کے دینیاتی اور فقہی ابعاد کا احاطہ کرتی ہے۔ اور شرائطِ قبولیتِ دعا پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ دعائے افتتاح کے زیرِ غور فقرے میں جو بات کہی گئی ہے اس کی تصدیق بھی کرتی ہے۔ ''جسے میں پکارتا ہوں تو وہ میری آواز پر لبیک کہتا ہے!''۔ اگرچہ یہ بات ہر کس و ناکس کی زبان پر نہیں آسکتی۔ اگر آتی بھی ہے تو ازروئے حقیقت نہیں بلکہ برسبیلِ حکایت یا بہ عنوانِ مجاز آتی ہے۔ دعائے افتتاح کے اس جملے میں ''صاحبِ دعا'' حجتِ خدا علیہ التحیۃ والثناء حقیقۃً ذہنِ انسانی کے اسی قلعۂ بستہ کو فتح کرنے کی تربیت فرما رہا ہیں۔ انسان اور معبود برحق کے درمیان موہوم فاصلے کو مٹا رہے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ جسے انسان نے گنبدِ بے در سمجھ رکھا ہے اس کے دروازے کی نشاندہی فرمارہے ہیں کہ وہ ربِّ کریم ایسا ہی ہے، اُسے پکارنے کی جرأت تو کرو!

''اَلَّذِیْ یُجِیْبُنِیْ حِیْنَ اُنَادِیْهِ'' اس جملے میں حقیقتِ دعا کو تجربۂ ذات و ماجرائے نفس کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

بات حقیقتِ دُعا کی چھڑ گئی ہے اور یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ سورۂ مبارکۂ بقرہ کی آیت میں مسئلۂ دعا کے دینیاتی اور فقہی ابعاد کا احاطہ کیا گیا ہے تو اس آیت کی تلاوت کا شرف بھی حاصل کر لیجیے جو حقیقتِ دُعا کے فلسفیانہ وجودی اور عرفانی ابعاد کا احاطہ کرتی ہے۔

﴿اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَ یَکْشِفُ السُّوْٓءَ﴾

(سورۂ نمل آیت ۶۱)

بھلا وہ کون ہے جو سُنتا ہے ناچاروں کی جب وہ اسے پکارتے ہیں اور

(بھلا وہ کون ہے) جو مصیبتوں کو دُور کرتا ہے؟''

قرآن مجید میں حقیقتِ دعا پر اور بھی متعدد آیتیں روشنی ڈالتی ہیں لیکن اگر کوئی انہیں دو آیتوں پر کماحقہ غور کرلے تو بھی شرحِ صدر کے لیے کافی سروسامان مُہیا ہوسکتا ہے۔

ربِّ کریم کی مخصوص اور مسلسل عنایتوں میں سے یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بندوں کی آواز پر آواز دیتا ہے اور یہ بھی ہے کہ وہ بندوں کی برائی کو چھپاتا ہے جبکہ بندے اس کی نافرمانیاں کرتے رہتے ہیں!

دُعائے افتتاح کا یہ جملہ ''وَيَسْتُرُ عَلَىَّ كُلَّ عَوْرَةٍ وَ اَنَا اَعْصِيهِ'' اسی حقیقت کی ترجمانی کرتا ہے اور ربِّ اکبر کے اسمائے مبارکہ ''ستار'' اور ''عفوٌّ'' کے جاری وساری برکات کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے!

اسی طرح اس کے بعد کے جملے اُس کے اَلطاف وعِنایات اور اِفضال و اِکرام کے بعض تجلیات کی طرف ملتفت کرتے ہیں۔

دعائے افتتاح کے ان جملوں سے حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام سے مروی دعائے کمیل کے بعض جملوں کی طرف بھی ذہن منتقل ہوتا ہے۔ بطورِ خاص یہ جملے:

''اَللّٰهُمَّ مَوْلَایَ كَمْ مِنْ قَبِيحٍ سَتَرْتَهُ وَ كَمْ مِنْ فَادِحٍ مِنَ الْبَلَآءِ اَقَلْتَهُ وَ كَمْ مِنْ عِثَارٍ وَقَيْتَهُ وَ كَمْ مِنْ مَكْرُوهٍ دَفَعْتَهُ وَ كَمْ مِنْ ثَنَاءٍ جَمِيلٍ لَسْتُ اَهْلاً لَهُ نَشَرْتَهُ!''

اے معبود اے آقا! کتنے ہی عیب ہیں جنہیں تو نے چھپایا ہے اور کتنی ہی سنگین بلائیں ہیں جن سے تو نے چھڑایا ہے اور کتنی ہی ٹھوکریں ہیں جن سے تو نے

بچایا ہے اور کتنی ہی برائیاں ہیں جنہیں تو نے دفع کیا ہے اور کتنی ہی اچھی تعریفیں ہیں جن کا میں اہل نہیں تھا لیکن تو نے پھیلائی ہیں!''

حقیقت یہ ہے کہ ربِّ کریم کی اتنی نعمتیں انسان کو حاصل ہیں اور اُس کے لطف وکرم کا ایسا فیضان اِس کائنات میں جاری وساری ہے کہ انسان نہ اس کا احصاو احاطہ کرسکتا ہے نہ ادائے شکر پر قادر ہے۔ اُس کی ''ستاری'' ہی کی شان کو اگر کوئی غور کرے تو اتنا تو سمجھ ہی سکتا ہے کہ اُس ستار العیوب نے ہر ہر انسان کو کس قدر حجاباتِ عزت وشرف سے اعزاز واحتشام عطا فرمایا ہے کہ انسان نہ جانے اپنے دل ودماغ میں دوسروں کے لیے کیا کیا سوچتا رہتا ہے لیکن دوسروں کو اس کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہوتا اسی طرح نہ جانے کیا کیا غلطیاں انسان سے سرزد ہوتی رہتی ہیں لیکن اس کی بہت ہی کم غلطیوں کی اطلاع دوسرے انسانوں کو ہوپاتی ہے جیسے کسی انتہائی چاہنے والے بُرے وقتوں پر کام آنے والے بے لوث و بے غرض دوست کا ہاتھ انسان کی تمام غلطیوں کے آثار مٹاتا چلا جاتا ہے تاکہ اس کی کوئی گرفت نہ ہوجائے۔ ورنہ اگر انسان کے تمام خیالات، تمام ارادوں، تمام نیتوں اور تمام غلط کاریوں کا افشا ہوجائے یا ہوتا رہے تو ذرا سوچیے کہ اس معمورۂ عالم میں ہر آن کیسی حشر سامانی برپا رہے!!!

ہاں وہی ہے معبودِ برحق، رؤف ورحیم، رحمان ووَدُود، جو اپنے بندوں پر ماں باپ اور قریب سے قریب تر عزیزوں سے بھی زیادہ شفیق ہے، جو اس کی آواز پر آواز دیتا ہے، اس کی ہر ہر برائی کو چھپاتا ہے، اور پیہم افزائشِ نعمت فرماتا رہتا ہے جبکہ انسان اس کی قدرِ نعمت کرنے سے بھی قاصرِ محض ہے ___ اور اس کے علاوہ اس کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہے کہ اُسی کے بتائے ہوئے ذکرِ حمد وورد تسبیح میں مشغول

رہنے کی اپنی سی کوشش میں لگا رہے تاکہ یہ بھی کہنے کے قابل رہے "فاثنی علیہ حامداً واذکرہُ مسبحاً"!

مناسب ہے کہ اس مقام پر ذِکر وتسبیح کے بارے میں بعض آیات و روایات پر نظر ڈالتے ہوئے کچھ مدام ذکر اور مسلسل تسبیح کے آداب بھی سیکھتے چلیں۔

"ذکر" کے معنی صرف زبان پر کسی کا نام جاری رکھنے یا کوئی جملہ دہراتے رہنے کے نہیں ہیں، بلکہ "ذکر" دل میں کسی یاد کو قائم رکھنے کا نام ہے۔ کبھی یادِ معبود میں کمالِ استغراق خموشی کا موجب بن جاتا ہے تو خموشی بھی ذکر کہلاتی ہے! بقولِ شاعر۔

لفظوں کے پرستار خبر بھی تجھے کیا ہے
جب دل سے لگی ہو تو خموشی بھی دعا ہے!

اور کبھی تلاوت ونماز میں بھی اگر توجہ صرف حُسنِ صوت وحسن ادا پر مرکوز رہے تو وہی سروسامانِ غفلت بن جاتی ہے! تاہم دل، دماغ، زبان اور عمل، ذاتِ انسانی کے ہر جزو اور شخصیت کے ہر عُنصر کو مشغولِ ذکر رکھنا ضروری ہے۔ یہ ضرورتِ دین نہیں ضرورتِ انسان ہے۔ ضرورتِ وجود اور ضمانتِ بقا وارتقا ہے!

قرآنِ مجید میں ذکرِ الٰہی کو دل کا چین کہا گیا ہے:

﴿اَلا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ (سورۂ رعد ۱۳، آیت ۲۸)

"ہاں! آگاہ رہو کہ یادِ خدا سے دلوں کو اطمنان نصیب ہوتا ہے!"

ذکر کے وسیع تر مفہوم ومصداق کو سمجھنے کے لیے قرآنِ مجید کا یہ جملہ بھی بہت کافی ہوسکتا ہے کہ ربِّ اکبر نے "نماز" کو بھی ذکر ہی کا ایک مصداق قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

﴿اَقِمِ الصَّلَاۃَ لِذِکْرِیْ﴾ (سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۱۴)

"مجھے یاد کرنے کے لیے نماز قائم کرو"۔

اور نماز کی ایک مخصوص وموقت ولازمی ہیئت کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس کے مفہوم کی حقیقی وسعیت اور اس کے مَصادیق کی کثرت کو بھی بہت سے آیات و احادیث میں پیش کیا گیا ہے۔ مثلاً کہا گیا:

"جب تک تم طہارت پر رہو گے گویا کہ نماز میں ہو!"

انہیں اِرشادات سے تفصیلی منازِل ومَقاماتِ ذکر کی جستجو کا باب کھل جاتا ہے۔

"ذکر" کے مقابلے میں "تسبیح" کے معنی، مفہوم اور مصداق میں دقت و ظرافت یا لطافت ونزاکت کچھ زیادہ ہی ہے۔

اس کے جمال کا پُرجلال بیان ذکر ہے، اور اس کے جلال کا پُرجمال اظہار تسبیح۔

تسبیح کے معنی ہیں معبودِ برحق کی پاکی اور قداست بیان کرنا، ظاہر ہے کہ اس ذاتِ ستودہ صفات کا تمام صفات سلبیہ سے مبرّا ہونے کا بیان چاہے کسی بھی اسلوب میں ہو حقِ بیان ادا نہیں ہوسکتا۔ دوسری طرف قرآنِ مجید کا حکم ہے:

﴿سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الاَعْلٰی﴾ (سورۂ اعلیٰ آیت ۱)

"تسبیح کرو اپنے بلند پروردگار کے نام کی!"

﴿فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّکَ الْعَظِیْم﴾

(سورۂ واقعہ ۵۶ آیت ۷۴ اور آیت ۹۶)

اور قرآنِ مجید میں کئی سورے تسبیحِ پروردگار ہی سے شروع ہوتے ہیں

جنہیں اہلِ ذکر کی زبان میں ''مستحبات'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اور جن کی تلاوت'' تزکیۂ نفس اور تجلیۂ قلب کی اکسیر ہے!

ان سورہائے قرآنی کے علاوہ ائمہ اہلِ بیت نبوت علیہم السلام سے بہت سے اَوراد و اذکار خصوصاً ''تسبیحات'' کے عنوان سے بھی وارد ہوئے ہیں جن میں سے سب سے زیادہ مشہور اور غالباً سب سے زیادہ قابلِ عمل اور گنجینۂ ثواب ''تسبیح زہرا'' علیہا السلام ہے، جس کے متعلق یہاں تک روایت ہے کہ ایک تسبیح زہراؑ ایک ہزار رکعت نوافل کا ثواب رکھتی ہے! اللہ اکبر والحمد للہ وسبحان اللہ!!!

☆☆☆☆☆

(۱۵)

حسن نقاب اور حجابِ عظمت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي
لَایُهْتَکُ حِجَابُهُ وَلَا یُغْلَقُ بَابُهُ
وَلَایُرَدُّ سَائِلُهُ
وَلَایُخَیَّبُ آمِلُهُ

''تمام تعریف اس معبود کی ہے
جس کا نہ پردہ چاک ہوتا ہے نہ اس کا دروازہ بند ہوتا ہے
نہ اس کا سوالی پھیرا جاتا ہے
نہ اس سے امید لگانے والا مایوس ہوتا ہے۔''

الفاظ کے لحاظ سے ''یُھْتَکُ'' (فعل مضارع مجہول کا صیغہ) اُسی مادّے سے ہے جس سے اردو میں لفظِ ہتک استعمال ہوتا ہے۔ زیادہ تر ہتکِ حرمت، ہتکِ عزت، وغیرہ ترکیبوں کے ساتھ، اور یُغلق (وہی فعلِ مضارع مجہول کا صیغہ) اس مادّے سے جس سے اردو میں ''مُغلق'' کا لفظ مستعمل ہے۔ اسی طرح بقیہ تمام الفاظ ہیں۔ خالص عربی کی ہیئت وترکیب میں ہونے کی بنا پر جو غرابت ہے وہ ترجمے سے دُور ہو جاتی ہے۔

اس فقرے میں بھی مضمونِ حمد وثنا ہے مگر ایک الگ ہی مقام سے ہے۔ یہ وہ عارفانہ زاویۂ نظر ہے جس میں شاذ ونادر ہی کوئی عارف زاویہ نشیں رہ پاتا ہے، اور محض شاعرانہ ادراک وتخیل یا نرا تفلسف توحید شناسی کے اِس مقام کا وجدان حاصل نہیں کر پاتا۔ اصحابِ عرفان و اربابِ تصوف کے کلمات میں ربِّ اکبر کے ''حجابات'' کا تذکرہ بہت پایا جاتا ہے۔ بعض روایات میں بھی حجابہائے نورانی و ظلمانی کی تفصیل پائی جاتی ہے۔ اگر چہ ان روایات کا کسی معصوم سے صادر ہونا یقینی

نہیں ہے۔ لیکن فی الجملہ اِس مضمون کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے اربابِ سیر و سلوک کی زبان پر اکثر یہ فقرہ بھی رہتا ہے کہ ''العلم هو الحجاب الاکبر!'' علم ہی سب سے بڑا حجاب ہے۔ اس جملے کے معنی بیان کرنے میں اصحابِ قول وقلم میں خاصا اختلاف ہے۔ اس وقت ہمیں اس سے غرض نہیں ہے۔

قرآنِ مجید میں پروردگار کے اور اس کے بندوں کے درمیان جس حجابِ جلال وعظمت کا تذکرہ ملتا ہے وہ یہ ہے کہ فرمایا گیا:

﴿وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَاءُ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَکِیْمٌ﴾

''مضمونِ آیت یہ ہے کہ کسی بشر کو یہ اعزاز حاصل نہیں کہ معبودِ برحق اس سے کلام فرمائے مگر یہ کہ بذریعۂ وحی یا پسِ حجاب سے یا کوئی فرشتہ بھیجے کہ وہ اُس کے اذن سے جو چاہے وَحی پہنچائے، یقیناً وہ بلندی اور حکمت والا ہے!''

اس کی بلندی کی حقیقت یہ ہے کہ وہ جسم وجسمانیات سے، مکان اور مکانیات سے، زمان اور زمانیات سے، عالمِ طبیعت اور اپنے مخلوقات کے جملہ خصوصیات سے پاک اور منزہ ہے! اُس کے سراپردۂ جلال تک مخلوقات کی کسی بھی خصوصیت کا گزر نہیں ہے! پھر مخلوقات سے اُس کے قرب کا تصور کیوں کر قائم ہو سکتا ہے؟ یہ سوال بہت سے اربابِ فکر ونظر کو دشواری میں مبتلا کرتا رہتا ہے۔ اس وقت اِس سوال سے تعرض کا محل نہیں ہے۔ بس یہ ہے کہ اس کا ایک خاص حسن التفات ہے، ایک عنایت، ایک مہربانی، ایک توجہِ خاص، ایک چشمِ کرم ہے، جسے حاصل ہو جائے! لیکن ابھی دعائے افتتاح کے بالکل اس سے پہلے والے فقرے میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے دعا گزار بندوں کی آواز پر آواز دیتا ہے! اور یہاں اس آیت میں

کہا جا رہا ہے کہ وہ کسی سے بھی بغیر کسی حجاب یا واسطہ کے کلام نہیں فرماتا اور دُعا کے اس فقرے کے پہلے ہی جملے میں کہا گیا ہے کہ "لَا یُھتَکُ حِجَابُہٗ" "اس کا پردہ چاک نہیں ہوتا" "یا اُس کا پردہ اٹھایا نہیں جا سکتا!" اِن تمام مقاماتِ سخن کو علیحدہ علیحدہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

دعا گزار کی آواز پر آواز دینا ایک الگ مفہوم رکھتا ہے۔ اور کسی بشر سے اس کا ہم کلام ہونا ایک الگ معنی ہے اور کسی نہ کسی حجاب کا درمیان میں رہنا ایک جُداگانہ احتشام ہے اور یہاں پر جو کہا گیا ہے کہ "اس کا نہ پردہ چاک ہوتا ہے اور نہ اس کا دروازہ بند ہوتا ہے" یہ مخلوقات کی پرورش و پرداخت کے اُس کے حکیمانہ نظام کا ایک تمثیلی بیان ہے۔

نہ اس کا کوئی سوالی پھیرا جاتا ہے نہ اس سے کوئی امید لگانے والا مایوس ہوتا ہے یہ سب کچھ ہے لیکن اس کا پردۂ جلال قائم ہے!

کہاں حجابِ عظمت وجلال کا یہ بلند پایہ مفہوم اور کہاں یہ شاعری کہ:

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں!

ہاں مجھے آرزو لکھنوی کے اس شعر میں ضرور اس مضمون سے کچھ مناسبت نظر آتی ہے:

اللہ اللہ حسن کی یہ پردہ داری دیکھیے
بھید جس نے کھولنا چاہا وہ دیوانہ ہوا!

☆☆☆☆☆

(۱۶)

جمالِ عدل وجلالِ رحمت

"اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يُؤمِنُ الْخائِفِينَ وَيُنَجِّي الصّالِحِين
وَيَرْفَعُ الْمُسْتَضْعَفِينَ وَيَضَعُ الْمُسْتَكْبِرِينَ
وَيُهْلِكُ مُلُوكاً وَيَسْتَخْلِفُ آخَرِينَ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ قاصِمِ الْجَبّارِينَ، مُبِيرِ الظّالِمِينَ ، مُدْرِكِ الْهارِبِينَ، نَكالِ الظّالِمِينَ، مُعْتَمَدِ المُؤمِنِينَ !"

تعریف ہے اسی معبود کی جو ڈرنے والوں کو پناہ دیتا ہے، نیکو کاروں کو نجات دیتا ہے،

کمزور بنائے گئے لوگوں کو اٹھاتا ہے، بڑے بننے والوں کو زیر کرتا ہے،

بادشاہوں کو ہلاک کرتا ہے، اور ان کی جگہ دوسروں کو عطا کرتا ہے،

تعریف ہے اسی معبود کی جو جبّاروں کو توڑنے والا ہے، ظالموں کو ہلاک کرنے والا ہے، بھاگنے والوں کو پکڑنے والا ہے، ظلم کرنے والوں کو سزا دینے والا ہے، فریاد کرنے والوں کا فریاد رس ہے، چاہنے والوں کی حاجتوں کا مرکز ہے، ایمانداروں کا بھروسہ ہے!

☆☆☆

ان فقروں میں چند الفاظ قابلِ غور ہیں ۔

يُؤمِنُ ، يُنَجِّي ، يَرْفَعُ ، يَضَعُ ، يُهْلِكُ ، يَسْتَخْلِفُ ، یہ سب کلمات اَفعال (Verbs) ہیں ۔ اور سب کے سب مضارع کے صیغے ہیں جن کا حال اور استقبال دونوں پر اطلاق ہوتا ہے ۔ اور ان کے اطلاق سے استمرار (Continuation) کے معنی بھی پیدا ہوتے ہیں ۔ اور کسی جاری و ساری و ثابت اصول یا قانون کی تعبیر کے لیے اسی کے بطن سے ثبوت اور اِثبات کے مفاہیم بھی

حاصل ہوتے ہیں ۔

یہ عجب حسنِ اتفاق ہے کہ اس دعا میں شروع سے اَب تک بیشتر کلمات ایسے آئے ہیں جن کے بارے میں بار بار عرض کیا گیا کہ ان کے مادّے سے مشتق مختلف کلمات ہماری اردو زبان میں بھی موجود ہیں ۔ اَب یہ چھ کے چھ افعال ایسے ہیں کہ ان کے مادّوں سے مشتق الفاظ نہ صرف یہ کہ اردو میں استعمال ہوتے ہیں بلکہ بکثرت استعمال ہوتے ہیں ۔

یُؤمِنُ (پناہ دیتا ہے) اس کا مادّہ (Rootword) ۔ اَ م ن ۔ امن، امان، ایمان، اور مومن وغیرہ کلمات بھی اسی مادّے سے ہیں ۔

یُنَجِّی (بچاتا ہے یا نجات دیتا ہے) یہ ۔نجّی ۔ ینجّی ثلاثی مزید فیہ کا صیغہ ہے ۔ جبکہ اس کی اشتقاقی اصل ن ج و کے مادّے سے آتی ہے ۔

اَور اسی مادّے سے نجات کا لفظ اردو اور بہت سی ہندوستانی زبانوں میں مستعمل ہے ۔ "ناجی" کا لفظ ہمارے ایک قدیم کلاسیکی شاعر "شاکر ناجی" کے نام کا جزو ہے ۔

یَرْفَعُ (اٹھاتا ہے، بلند کرتا ہے) ۔ ر ف ع ۔ رِفعت، رَفیع، تَرَفُّع کلمات اسی مادّے سے ہیں ۔ آپ کے ذہن کی غرابت بھی رفع ہوگئی ہوگی ۔

یَضَعُ (رکھتا ہے، گراتا ہے، زیر کرتا ہے) یہ ۔ و ض ع ۔ کے مادّے سے ہے ۔ اردو میں وضع، وضع قطع، وضع دار، وضع داری، وضع کرنا، وضع ملنا، وضع نباہنا، وضیع (بمعنی ذلیل) اور (بمعنی منکسر المزاج) شریف و وضیع، واضع اور موضوع وغیرہ سارے کلمات اسی مادّے سے ہیں ۔

یُھلِکُ (ہلاک کرتا ہے) ۔ ھ ل ک ۔ ھلاکت، آج کل دنیا میں

روزانہ بے شمار حادثے رونما ہوتے رہتے ہیں جن میں ''ہلاکتوں'' اور ''مَہلوکین'' کی تعداد سے دل بیٹھا جاتا ہے۔

یَستَخلِفُ (جانشیں ہوتا ہے یا بناتا ہے، خلافت عطا کرتا ہے...) یہ خ ل ف کے مادّے سے ہے، خِلاف، مُخالفت، خلیفہ، یہ سب کلمات بھی اسی مادّے سے ہیں۔

صرف ان ہیئتوں (Forms) کی تبدیلیوں اور تصاریف (Variations) کی وجہ سے معانی بدلتے چلے گئے ہیں۔

اِن افعال کے بعد چند اسماء ہیں، جو مشتقات سے ہیں، یا وہ مبنی برائے مفعول ہیں، یا مبنی برائے فاعل، مُستَضعَفِین (کمزور بنائے گئے لوگ) مُستَکبِرین (بڑائی یا تکبر کرنے والے) قَاصِم (توڑنے والا) مُبِیر (ہلاک کرنے والا) مُدرِک (پانے یا پکڑنے والا) ھَارِبِین (فرار کرنے والے) مُستَصرِخِینَ (چیخنے والے یا فریادی) ذرا مشکل سے ہیں ورنہ خائِفِینَ (ڈرنے والے) صَالِحِینَ (نیکوکار) مُلُوک (بادشاہ) جَبَّارِینَ (ستم پیشہ حکمراں) ظَالِمِینَ (ظلم کرنے والے) اور طَالِبِینَ (طلب کرنے والے، مانگنے والے یا چاہنے والے) وغیرہ کلمات سے آپ تقریباً آشنا اور مانوس ہیں۔

☆☆☆

الفاظ سے گزر کر ان فقروں کے مفہوم میں غور کریں۔

یہ کلمات ''عدلِ الٰہی'' کی انتہائی پیچیدہ اور مشکل بحث کا اِحاطہ کر رہے ہیں۔ انسانی افکار و نظریات اور مسلمانوں کے عقائد کی تاریخ میں ''عدل'' کی بحث بہت اہمیت رکھتی ہے۔ بلکہ اس بحث نے بھی مسلمانوں میں بڑا تفرقہ ڈالا ہے۔ اس

کی تفصیل ''مِلَل و نِحَل'' کی کتابوں سے مل سکتی ہے۔

دعائے افتتاح کے پیشِ نظر کلمات کی روشنی میں ہم اصل موضوع پر غور کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ''عدل'' ''رحمت'' کے بعد اور ''رحمت'' کے پردے میں (مُستَتِر) یا ذاتِ باری تعالیٰ، ذاتِ حق جلّ شانہ وعزّ اسمہ کے جملہ صفات، خصوصاً صفت رحمانیت و رحیمیت کی جلو میں سب سے اہم، سب سے بنیادی، سب سے جوہری اور سب سے محوری ''صفتِ فعلی'' ہے!

اِس عالم کا ترکیبی قوام اور تدبیری نظام اسی ''عدل'' پر استوار ہے۔

پروردگارِ عالم نے جو نظامِ ہدایت قائم فرمایا ہے، بعثتِ انبیاء، اوصیائے انبیاء اور ائمۂ ہدیٰ علیہم السّلام کی تعیین، آسمانی کتابوں اور صحیفوں کے نزول کا سلسلہ، پھر حشر و نشر، جزا و سزا، بہشت اور دوزخ غرض معاد اور آخرت کا سارا اہتمام، سب اسی عدل کے تقاضوں کے تحت فرمایا گیا ہے۔

ارشادِ الٰہی ہے:

''لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنَاتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ'' (سورۂ حدید، آیت ۲۵)

''ہم نے اپنے پیمبروں کو حقیقت طراز معجزوں کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور ترازو بھیجی تاکہ لوگ عدل قائم کریں''

اب ظاہر ہے کہ جو ربّ اپنے بندوں کو عدل قائم کرنے کا حکم فرمائے کیا وہ خود عدل کی راہ و روش اختیار نہ فرمائے گا؟!

عدل کی ضِد ظلم ہے۔ ظلم ہی سے انسان کو خوف لاحق ہوتا ہے۔ ظلم سے ڈرا سہا ہُوا مظلوم ''عدالت'' اور ''عادل'' کی پناہ میں عافیت کا طالب ہوتا ہے۔ وہ خوف

جو عظمت و جلالِ الٰہی کے اثر سے پیدا ہوتا ہے، اُس کی حقیقت اِس خوف سے مختلف ہے جو ظالم اور اس کے ظلم سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا بیان دعا کے دوسرے کلمات کے ضمن میں آئے گا۔ یہاں پر ارشاد فرمایا جا رہا ہے ''تعریف ہے اُسی معبود کی جو ڈرے سہمے ہوئے لوگوں کو پناہ دیتا ہے!'' یہ آثارِ عدل کو بیان کر کے عدلِ الٰہی کی تفہیم کا ایک طریقہ ہے۔

اسی طرح اس سے متصل تمام جملے فکر و نظر کو ایک ایک شانِ عدالت ربّانی کی طرف مُتوجہ کرتے ہیں۔ صالحین یا اچھوں اور نیکوکاروں کو نجات یا سرفرازی عطا کرنا، ظلم اور زیادتی سے کمزور بنا دیے گئے لوگوں کو اٹھانا، انہیں قوت و اقتدار بخشنا، ناحق بڑے بننے والوں کو زیر کرنا، ستم پیشہ حکمرانوں کو ہلاک کرنا اور ان کی جگہ دوسرے عدالت شعار اور رَحم پَرَور اشخاص کو حکمرانی عطا کرنا، جفا کاروں جبّاروں کو توڑنا، ظالموں کو ہلاک کرنا، فریادیوں کی فریاد رسی، ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا اور ایمان داروں، امن و عافیت پسندوں کا بھروسہ قائم رکھنا، یہ سب امور عدالت کے تقاضے، عدل شعاری کے لوازم اور کسی عادلِ حکیم و حلیم کے لازمی اوصاف اور خصوصیات ہیں۔ اسی لیے عرض کیا گیا کہ معبودِ برحق اور خالقِ کائنات کے صفات میں ''عدل'' کو ''بنیادی'' اور ''محوری'' حیثیت حاصل ہے۔

آثارِ عدل و آثارِ ظلم پر غور کیا جائے، ظالمین و مستکبرینِ عالم کے تمام افعال و اقوال کا تجزیہ کیا جائے اور ظالم کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ ظلم کیوں کرتا ہے؟ تو اس کی ہزار ہا وجہیں بیان کی جا سکتی ہیں، لیکن اگر ان تمام وجوہ کا علمی، بیانی اور نفسیاتی تجزیہ کیا جائے تو دنیا میں ہنگامہ آرا اور حشر ساماں تمام اسبابِ ظلم کی صرف دو ہی بنیادیں سامنے آتی ہیں۔ ایک ''جہل'' اور ایک ''حرص''۔

انسان یا جہل و نادانی کی بنیاد پر ظلم کرتا ہے یا حرص و ہوس کی وجہ سے اپنے حق سے تجاوز کر کے دوسروں کا حق یا حصہ غصب کر لیتا ہے۔ اسی لیے جہاں غِنائے مطلق اور استغنائے کامل ہو اور علم بھی ہو وہاں ''ظلم'' یا قبح کا وجود ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی سبب ہے کہ عدل کی بحث میں محقق طوسیؒ نے تجرید الاعتقاد میں یہ جملہ سپردِ قلم کیا ہے:

''اِسْتِغْنَاؤُہٗ وَعِلْمُہٗ یَدُلَّانِ عَلٰی اِنْتِفَاءِ الْقُبْحِ عَنْ اَفْعَالِہٖ تَعَالٰی''

''اس کا بے نیاز ہونا اور اس کا علم، یہ دونوں اوصاف، اس کے افعال سے قبح کی نفی پر دلالت کرتے ہیں''

اس باب میں ''خلاصۂ کلام'' یہی ہے، لیکن اسی نقطہ کو پھیلائیں تو پورا قرآن پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت پیدا ہو جائے گی۔ اور اس مشکل بحث کو حل و فصل کرنے کے لیے عدلِ تکوینی، عدلِ تشریعی، عدلِ عاجل، عدلِ آجل کے مُصطلحات کا سہارا لینا پڑے گا۔

خیر اور شر کے مسائل، جبر و اختیار کے مباحث، قضا و قدر کے اسرار، ذہن و قلب کو پریشان تو ضرور کرتے ہیں مگر اُسی معبودِ برحق کے ''ذکر'' سے، قرآن ہو یا پھر دعا، جمعیتِ خاطر تشفّیِ ذہن اور تسلّیِ دل کا سر و سامان کرتے ہیں۔

ہر ایک مسئلہ پر مفصل بحثیں مُطوّل کتابوں میں موجود ہیں، اِس مختصر میں بِنا اشارے اور ایجاز ہی پر ہے۔ تاہم ''خیر و شر'' کا مسئلہ چونکہ آج کل بہت زیادہ موضوعِ بحث بنا ہوا ہے اس لیے اس کی تھوڑی سی وضاحت کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

خالقِ مُتعال خیرِ محض ہے۔ اور اُس نے جو کچھ بھی خلق فرمایا ہے محض خیر ہے۔ ''شر'' ممکنات کی محدودیتوں یا اَعدام سے مُنتزع (Draw یا Perceive)

ہوتا ہے۔

ہے خیر سے معمورۂ ہستی آباد
معدوم ہے اِمکان میں شر کی بنیاد
لبریز ہے توحید کے مضمون سے عِلم
ہے جہل فقط دلیلِ شرک و الحاد

شر کے اعدام یا معدوم سے منتزع ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ربِّ کریم نے ایجاد وتکوین وخلق فرمایا ہے اُس میں کہیں پر ذرّہ بھر بھی شر کا کوئی شائبہ نہیں ہے! بلکہ اُس کے ایجادات سے انسان جب سوءِ استفادہ کرتا ہے تو شر پیدا ہوتا ہے! کسی بھی شئ سے انسان کے سوءِ استفادہ کو بھلا اُس ربِّ رحیم، معبودِ برحق، خالقِ علیم اور باریِ لطیف کی طرف کس طرح نسبت دی جاسکتی ہے؟! اسی لیے اللہ کے معصوم بندوں نے اپنی دعاؤں میں ارشاد فرمایا ہے ''والشــرُّ لیــس اِلیکَ!'' (اے معبود شر تیری جانب سے نہیں ہے!) اور اگر کہیں پر خیر وشر دونوں کے خلق کی نسبت خدائے متعال کی جانب آئی بھی ہے تو اس کے معنی ''خلقِ تقدیری'' کے ہیں نہ کہ ''خلقِ تکوینی'' کے۔ یعنی اس نے اپنے علم کی بنیاد پر مُقدّراتِ کارِ بشر میں، لوحِ محفوظ میں، پہلے ہی سے اُس انجامِ کار اور نتیجۂ عمل کو ثبت فرمادیا ہے۔ جسے انسان کاشت کرتا ہے:

مولا است مُرادِ ہمہ کس می داند
دانا است سوادِ ہمہ کس میں داند
دانستنِ اُو علتِ کارِ ما نیست
داند چوں نہادِ ہمہ کس می داند

جبر واختیار وتفویض کے مسائل میں تمام بحثوں کا خلاصہ اولیائے معصومین علیہم السلام سے تواتر کے ساتھ نقل ہونے والا یہ جملہ ہے کہ اپنی جامعیت اور کمالِ بلاغت میں ایک آیت ہے:

''لاجبرَ ولا تفویضَ وَلکن امرٌ بینَ اَمرینِ'' (مجمع البحرین طریحی)

''نہ سراسر جبر ہے نہ سربسر تفویض، بلکہ دو امروں کے درمیان ایک امر ہے''۔

اردو کے ایک اہلِ دل اہلِ مودّت شاعر رزمؔ ردولوی نے اس موضوع کو حیرت انگیز شاعرانہ دل آویزی کے ساتھ ایک رُباعی میں سموڈالا ہے:

ہر چند کہ جبر خِشتِ بنیادی ہے
قدرت نے مگر راہ بھی بتلا دی ہے
اُٹھّے تو دوعالم کو مُسخّر کرلے
اِتنی حدِ زنجیر میں آزادی ہے!

اُور تو اور ہمارے ''زبان کے شاعر'' جناب شیخ امام بخش ناسخ نے بھی اس موضوع پر ایک ایسا شعر کہہ دیا ہے کہ اس کی تشریح ایک مبسوط کتاب کی متقاضی ہوسکتی ہے۔

چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا!

☆☆☆

دعائے افتتاح کے بالکل ابتدائی فقروں کے ذیل میں لطفِ الٰہی کے بیان میں میں نے عرض کیا تھا کہ ''انسان اِس کائنات میں ''مجبورِ محض'' نہیں ہے

بلکہ "محتاجِ محض" ہے! اور یہ محتاجی "مخلوق" ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ اُس قادِر وقیوم نے اِسے محتاج کیا ہے! یہ انسانِ ذلیل ہے کہ اپنی حقیقت وحیثیتِ ذاتی میں محتاج ہے اور وہ ربِّ کریم ہے کہ اپنے لطف سے اِسے مختار بننے کی راہیں دکھاتا جاتا ہے!!!"

اور بلا مبالغہ تمام مباحثِ "عدل" و "توحید" کا قُرآنِ بلاغت و بیان حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا یہ جملہ ہے:

"اَلتُّوحِیدُ اَلَّا تَتَوَهَّمَهُ والعَدْلُ اَلَّا تَتَّهِمَهُ"

(نہج البلاغہ، نسخہ صبحی صالح)

"توحید یہ ہے کہ اُسے اپنے وہم وگمان کے حدود میں نہ لاؤ اور عدل یہ ہے کہ اُس پر اتہام نہ رکھو!"

☆☆☆☆☆

(۱۷)

جلال وجبروتِ قدرت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي مِنْ خَشْيَتِهِ تَرْعَدُ السَّمَاءُ وَ سُكَّانُهَا وَتَرْجُفُ الْاَرْضُ وَعُمَّارُهَاوَتَمُوْجُ الْبِحَارُ وَمَنْ يَسْبَحُ فِي غَمَرَاتِهَا.

تمام حمد ہے اس معبود کی جس کی ہیبت سے آسمان اور آسمانوں میں بسنے والے کانپتے ہیں زمین اور اس پر زندگی بسر کرنے والے لرزتے ہیں سمندروں اور اس کی گہرائیوں میں پیرنے والے لرزہ بجاں ہیں۔

دعائے افتتاح کا یہ فقرہ عجیب فرازِ معرفت کی نشاندہی کرتا ہے۔توحیدِ ذات ،توحیدِ صفات، توحید افعال، صفاتِ ثبوتیہ اور صفاتِ سلبیہ کے بہت سے گوشوں کی طرف گزشتہ فقراتِ حمد وثنا میں توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔اس مقام پر تمام کائنات پر اُس کے جلال وقہاریت کا ایک اثر بیان کیا گیا ہے کہ:

اس کے آگے کمالِ تواضع سے آسمان اور اہلِ آسمان،

زمین اور اہلِ زمین

سمندر اور اس کی گہرائیوں میں تیرنے والے سبھی لرزہ براندام ہیں!

اس سے قبل کے بعض فقرات میں کچھ اس سے قریب تر مضامین گزر چکے ہیں مثلاً دعا کے پہلے ہی فقرے میں یہ جملہ بھی تھا:

”وَاَعْظَمُ الْمُتَجَبِّرِيْنَ فِيْ مَوْضِعِ الْكِبْرِيَآءِ وَ الْعَظَمَةِ“

”(اے معبود) کبریائی اور عظمت کے موقع پر کوئی تجھ سے برتر صاحبِ جلال وجبروت نہیں ہے۔“

اس جملے میں صرف عظمت و جبروت کا ذکر ہے، مخلوقات پر اس کے کسی

واضح اثر کی نشاندہی نہیں ہے۔

اس کے بعد ایک فقرے میں یہ جملہ بھی آیا ہے:

”قَهَرَ بِعِزَّتِهِ الْاَعِزَّآءَ وَ تَوَاضَعَ لِعَظَمَتِهِ الْعُظَمَآءُ فَبَلَغَ بِقُدْرَتِهِ مَا يَشَاءُ“

اس جملے میں قہاریت کے ذکر کے ساتھ مخلوقات پر اس کے ایک بڑے اثر کی نشاندہی بھی موجود ہے۔ اور وہ ہے ربِّ اکبر کی عظمت کے مقابلے میں مخلوقات کا خضوع وخشوع و”تواضع“۔

زیرِ غور فقرے میں ایک اور بڑا اثر بیان کیا گیا ہے۔خشیت جس کے بجائے خود بہت سے آثار ہیں۔مثلاً رونا، سرافگندہ ہونا، لرزہ براندام ہونا۔

اردو میں عام طور پر خشیت کا ترجمہ خوف سے کر دیا جاتا ہے۔جبکہ اگر لفظ و معنی کے رشتوں سے متعلق اُس نظریہ کو تسلیم کیا جائے جس میں مترادفات کے وجود کا سرے سے انکار کیا گیا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ ہر لفظ بجائے خود اپنے مستقل معنی و مصداق رکھتا ہے۔ اگر دو مستقل الفاظ ہوں گے تو اُن کے معنی بھی بہر حال علیحدہ علیحدہ ہوں گے۔یہ ممکن نہیں کہ دونوں لفظوں کے بعینہٖ ایک ہی معنی ہوں۔تو پھر غور کرنا پڑے گا کہ خوف اور خشیت دونوں الفاظ عربیِ فصیح میں پائے جاتے ہیں اور دونوں ہی الفاظ قرآنِ مجید میں بھی اپنے اپنے موقع محل پر استعمال ہوئے ہیں۔تو پھر ان کے درمیان معنی کا کچھ نہ کچھ فرق وتفاوت ضرور ہوگا۔

اور اگر اس نظریہ کو تسلیم نہ بھی کریں یعنی مترادفات کے وجود کو تسلیم کریں

تب بھی مختلف الفاظ بطورِ خاص اِن دونوں کلمات (خشیت وخوف) کے درمیان معنوی امتیاز کی جستجو کا جواز بہر حال باقی رہے گا خصوصاً جب کہ دونوں الفاظ قرآنِ مجید میں علیحدہ علیحدہ استعمال ہوئے ہیں۔

کلامِ عرب اور قرآنِ مجید کے آیات میں ان الفاظ کا تفحص کرنے سے یہ نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے کہ خوف اور خشیت کے الفاظ بالکل مترادف اور متحد المعنی تو نہیں ہیں لیکن قریب المعنی ضرور ہیں۔ فرق وتفاوت یہ ہے کہ ''خوف'' مذموم اور منفی انفعالِ نفس کا نام ہے اور خشیت ممدوح اور مثبت اثر پذیری اور تواضع کے درجۂ کمال کا نام ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں جگہ جگہ مؤمنین وصالحین کے صفات میں خشوع اور خشیت کا شمار کرایا گیا ہے اور خوف کی ان سے نفی کی گئی ہے۔

﴿لا خَوفٌ عَلَيهِم وَلا هُم يَحزَنُونَ﴾

بعض مرشدین ومُعلّمینِ اخلاق نے ''خوف'' کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں۔

خوف، خشیت، وجل، رہبت، ہیبت۔

اور فرمایا ہے کہ خوف گنہگاروں کو لاحق ہوتا ہے، خشیت ادائے حق میں تقصیر کے احساس سے پیدا ہونے والی کیفیت ہے، وجل ترکِ خدمت کے نتیجہ میں ہونے والا انفعال ہے، رہبت اور ہیبت، حسبِ مقاماتِ معرفت، اس کی عظمت و جبروت کے احساسات کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے عاجزانہ تاثرات ہیں۔ قرآنِ مجید کے مختلف آیات میں ان تمام مقاماتِ خوف وخشیت کا تذکرہ آیا ہے۔ مثلاً:

۱۔ ﴿وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ﴾ (سورۂ رحمٰن آیت ۴۶)

''اور جو اپنے رب کے مقامِ عظمت کا خوف رکھتا ہے اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔''

۲۔ ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ (سورۂ فاطر آیت ۲۸)

''حقیقت یہ ہے کہ اللہ سے خشیت اس کے بندوں میں صرف علم رکھنے والے ہی رکھتے ہیں۔''

۳۔ ﴿وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾

(سورۂ انفال آیت ۲ وسورۂ حج آیت ۳۵)

''ایمان والے تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں۔''

۴۔ ﴿وَيَدْعُوْنَنَا رَغَباً وَ رَهَباً﴾ (سورۂ انبیاء آیت ۹۰)

''اور (یہ انبیاء) ہمیں رغبت اور رہبت کے ساتھ پکارتے ہیں۔''

۵۔ ہیبت کا کلمہ قرآنِ مجید میں نہیں آیا ہے، اس کے معنی ومفہوم کو دوسرے کلمات وتعبیرات مثلاً ﴿يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ﴾ وغیرہ کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔

تمام عالمِ ممکنات پر جس طرح خوف وخشیت وکمالِ تواضع کی تصویر کشی دعائے افتتاح کے اس فقرے میں کی گئی ہے وہ دعائے سمات کے بعض جملوں کی یاد بھی دلاتی ہے جہاں کہا گیا ہے:

"وَبِجَلَالِ وَجْهِكَ الْكَرِيمِ أَكْرَمِ الْوُجُوهِ وَ أَعَزِّ الْوُجُوهِ الَّذِي عَنَتْ لَهُ الْوُجُوهُ، وَخَضَعَتْ لَهُ الرِّقَابُ، وَخَشَعَتْ لَهُ الْأَصْوَاتُ، وَوَجِلَتْ لَهُ الْقُلُوبُ مِنْ مَخَافَتِكَ".

''اور (تیری بارگاہ میں سوالی ہوں) تری کرم گستر ذات کے جلال کے حوالے سے، جو سب سے زیادہ عظیم اور سب سے زیادہ باعزت ہے۔ جس کے آگے سبھی ذاتیں سرنگوں ہیں، اور ساری گردنیں خمیدہ ہیں، تمام آوازیں لرزاں اور تمام دل ترے خوف سے ہراساں ہیں۔''

☆☆☆☆☆

(۱۸)

لطفِ ربوبیت
یا
فیضانِ ہدایت

""اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدَانَا لِهٰذَا وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْ لَا أَنْ هَدَانَا اللّٰهُ""

""تمام تعریفیں اُسی معبودِ برحق کی ہیں جس نے ہماری (اس بابِ راہِ نجات وفردوس تک) رہنمائی فرمائی جبکہ اگر معبودِ برحق رہنمائی نہ فرماتا تو ہم ہدایت پانے والے نہ تھے۔""

دُعا کا یہ فقرہ قرآنِ مجید کی ایک آیت سے اِقتباس کیا گیا ہے۔ یہ سورۂ مبارکۂ اعراف (ساتویں سورے) کی ۴۳ویں آیت کا اِبتدائی حصہ ہے جو یہاں بغیر کسی تصرف کے بعنوانِ ثنائے الٰہی دُہرایا گیا ہے۔

اصل آیت میں عالمِ آخرت کی حکایت ہے۔ یعنی یہ مقام محاکاتِ قرآنی میں سے ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ انسانی ادب میں بیشتر بلکہ تمامتر ماضی ہی کی محاکات پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ قرآنِ مجید کے عظیم ترین خصوصیات میں سے ہے کہ اس میں بہ کثرت اور بہ کمالِ حسن و بہ کمالِ صداقت مستقبل اور آخرت سے متعلق محاکات موجود ہیں۔

اِس سے قطعِ نظر، اصل آیت میں بات یہ بیان کی گئی ہے کہ آخرت میں نجات پانے اور بہشتِ بریں میں جگہ پانے والوں کی صدائے حال اوران کا زمزمۂ مقال یہ ہوگا کہ:

""شکر ہے معبودِ برحق کا جس نے ہم کو (نجات اور فردوس تک پہنچنے والے) اِس راستے پر لگادیا اور ہم یہ راستا پا ہی نہیں سکتے تھے اگر اللہ ہمیں اس کی رہنمائی نہ فرماتا!""

قرآن مجید میں اس کے آگے ایک فقرہ اور ہے جس میں اللہ کی طرف

سے آنے والے پیمبروں کی تصدیق اوراُن کے برحق ہونے کا اعلان ہے:

﴿لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ﴾

""ہمارے پروردگار کے پیغام پہنچانے والے بلاشبہ برحق آئے۔""

اس محاکاتِ قرآنی میں کانٹے کی بات یہی ہے کہ اگر وہ ربِّ کریم اپنے نظامِ ہدایت سے ہمیں بہرہ مند نہ فرماتا تو ہم ایسے کہاں کے دانا تھے جو خود بخود ہدایت پاجاتے اوراپنی دنیا وآخرت سجا سنوار کر نجات پاسکتے۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس مخصوص لُطفِ الٰہی یعنی نظامِ ہدایت ربّانی کا کسی قدر تفصیل سے تذکرہ کرنے کی سعادت بھی حاصل کی جائے کہ یہ بھی ایک اندازِ شکر وسپاس اور ایک اسلوبِ حمد وثنا ہے۔

گزشتہ مباحث میں کہیں پر یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ حقیقۃً بنیادِ تخلیق ""لُطفِ مشیت"" یا ""مشیتِ لطف"" ہے۔ ابتدائے خلقت سے انتہائے آخرت تک جو کچھ بھی ہے سروسامانِ لطفِ ربّانی ہی کی جلوہ گری ہے۔ یہاں پر خصوصیت کے ساتھ یہ تذکرہ مقصود ہے کہ اسی لطفِ بے پایاں کا تقاضا یہ ہوا کہ ""خلق"" سے پہلے ہدایتِ خلق کا اہتمام فرمایا جائے۔ چنانچہ ربِّ کریم نے ہدایتِ خلق کا موثر ترین وسیلہ سب سے پہلے خلق فرمایا جس کا نام عقل ہے۔ اس کے علاوہ اصولِ کافی کی یہ مشہور حدیث صحیح السند بھی ہے اور صریح الدلالت بھی:

[اَخبرنا ابو جعفر محمد بن يعقوب قال: حدثني عِدَّةٌ من اصحابنا منهم يحيٰ العطار، عن احمد بن محمد، عن الحسن بن محبوب، عن العلاء بن رزين عن محمد بن مسلم عن أبي جعفرؑ قال:]

”لَمّا خلق الله العقل استنطقه ثم قال له: اَقْبِلْ فَاَقْبَلَ ثُمَّ قَالَ لَهُ اَدْبِرْ فَاَدْبَرَ، ثُمّ قَالَ وَ عِزَّتِي وَ جَلَالِي مَاخَلَقْتُ خَلْقاً هُوَ أَحَبُّ اِلَيَّ مِنْكَ وَلَا اَكْمَلْتُكَ اِلَّا فِيْمَنْ أُحِبُّ، اَمَّا اِنِّي اِيَّاكَ آمُرُ وَ اِيَّاكَ انهِي وَ اِيَّاكَ اُعَاقِبُ وَ اِيَّاكَ اُثِيْبُ!“

حضرت امام محمد باقرؑ علیہ السلام نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ نے عقل کو پیدا کیا تو اسے گویا کیا پھر اس سے فرمایا کہ آگے بڑھو تو وہ آگے بڑھی پھر فرمایا کہ پیچھے ہٹو تو وہ پیچھے ہٹ گئی پھر فرمایا کہ میری عزت اور میرے جلال کی قسم میں نے کوئی مخلوق ایسی نہیں پیدا کی جو مجھے تجھ سے زیادہ محبوب ہو اور میں تجھے کسی بھی فرد میں بہ حد کمال نہیں پہنچاؤں گا مگر اسی میں جس سے مجھے محبت ہوگی۔ میں تیرے ہی ذریعہ سے اَمر کروں گا اور تیرے ہی ذریعہ سے نہی کروں گا اور تیرے ہی سبب سے سرزنش کروں گا اور تیرے ہی ذریعہ سے جزا دوں گا۔“

اس حدیث سے نظامِ ہدایتِ الٰہیہ میں عقل کی اہمیت اور اس کی محوری حیثیت پر روشنی پڑتی ہے۔ بعض اسلامی روایات میں ”عقل“ کو ”نبیِ باطن“ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ عقل ہی ہے جس سے سلامت روی اور سعادت مندی کے ساتھ استفادہ کیا جائے تو حقیقتِ کبریٰ تک رسائی یا ثبوتِ حق کے لیے کوئی سرگردانی نہیں ہوتی اور انسان بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
اگر رسولؐ نہ آتے تو صبح کافی تھی!

لیکن یہ بھی ایک تلخ سچائی ہے کہ انسان بالعموم اپنی عقل کی آواز اور اپنے ضمیر کی پکار بھی نہیں سنتا۔ اسی لیے ہادیِ مطلق نے اپنے نظامِ ہدایت میں انبیا و

مرسلین، ائمہ اور اولیا کا منظم سلسلہ بھی قائم فرمایا۔[۱] قرآن حکیم گواہ ہے کہ کوئی بھی نسل، کوئی بھی قبیلہ اور کوئی بھی خطّۂ ارض یا کوئی منطقۂ حیات آسمانی ہدایت کے فیضان سے محروم نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ قرآنِ مجید نے ایک سے زائد مقامات پر اس بات کی صراحت فرمائی ہے۔ سورۂ مبارکۂ یونس (دسویں سورے) میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَسُولٌ﴾ (آیت ۴۷)

”اور ہر امت کے لیے رسول ہوئے“

اسی طرح سورۂ مبارکہ نحل (سولہویں سورے) میں ارشاد ہوا ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولاً أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ (آیت ۶)

”اور ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور سرکشوں کی بندگی سے بچو۔“

یہی حقیقت سورۂ نحل کی ۸۴ویں آیت سے مُستَفاد ہوتی ہے:

﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيداً﴾

”اور جس روز (روزِ آخرت) ہم ہر امت میں سے ایک گواہ اٹھائیں گے...“

---

[۱] محقق طوسیؒ نے تجرید الاعتقاد میں بعثتِ انبیاء کے باب میں نظریۂ لُطف کے حوالے سے یہ عبارت تحریر فرمائی ہے:

”البعثةُ حَسَنَةٌ لِاِشْتِمَالِهَا علٰی فَوائدَ كماضدة العَقْلِ فِيمَا يَدُلُّ عليهِ وَاستفادة الحكم فيما لايدل...“

ان کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ پروردگارِ عالم کا نبیوں کو بھیجنا اچھائی ہے۔ اس سے بندوں کے حق میں ربِّ کریم کا لطف شامل حال ہوجاتا ہے۔ اس لیے انبیا کے بھیجنے میں بہت سے فائدے ہیں۔ مثلاً جن باتوں میں عقل انسانی رہنمائی کرتی ہے نبوت ان باتوں میں عقل کی تائید کرتی ہے اور جن باتوں میں عقل کوئی رہنمائی نہیں کرتی اُن میں نبوت رہنمائی کرتی ہے...“

سورۂ فاطر (۳۵) میں ہے:

﴿وَ اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ (آیت ۲۴)

''اور کوئی اُمّت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی ''نذیر'' (کوئی خدا اور آخرت سے ڈرانے والا) نہ آیا ہو۔''

اِن صاف وصریح قرآنی بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت کہ پروردگار نے کسی بھی قوم کو اپنے لطفِ ہدایت سے محروم نہیں رکھا، اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

یہ ایک علیحدہ بحث ہے اور ایک خاص مصلحتِ الٰہی پر مبنی ہے کہ قرآنِ مجید میں نہ تمام کی تمام اقوام وملل کا تذکرہ ہے نہ سارے کے سارے مبعوث ہونے والے انبیا کا۔ قرآنِ مجید میں تو صرف ۲۵ ر انبیا کا نام آیا ہے جو حسب ذیل ہیں: [1]

۱۔ حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۲۔ حضرت آدمؑ   ۳۔ حضرت ادریسؑ

۴۔ حضرت نوحؑ   ۵۔ حضرت ہودؑ

۶۔ حضرت صالحؑ   ۷۔ حضرت ابراہیمؑ

۸۔ حضرت لوطؑ   ۹۔ حضرت اسماعیلؑ

۱۰۔ حضرت اسحاقؑ   ۱۱۔ حضرت یعقوبؑ

۱۲۔ حضرت یوسفؑ   ۱۳۔ حضرت ایوبؑ

۱۴۔ حضرت شعیبؑ   ۱۵۔ حضرت موسیٰؑ

۱۶۔ حضرت ہارونؑ   ۱۷۔ حضرت یونسؑ

---

۱ جیسا کہ سورۂ مبارکۂ نسا کی اس آیت میں خود ہی ارشاد فرمایا ہے:

(وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ...)

''کچھ رسول ہیں جن کے قصے ہم نے آپ سے بیان کیے ہیں اور کچھ رسول ہیں جن کا تذکرہ ہم نے نہیں کیا...''

۱۸۔ حضرت داوٗدؑ   ۱۹۔ حضرت سلیمانؑ

۲۰۔ حضرت الیاسؑ   ۲۱۔ حضرت الیسعؑ

۲۲۔ حضرت زکریاؑ   ۲۳۔ حضرت یحییٰؑ

۲۴۔ حضرت عیسیٰؑ

۲۵۔ حضرت ذوالکفلؑ (بقولِ اکثرِ مفسرین)

یہ نام علامہ بہائیؒ کی مرتب کردہ فہرست کے مطابق ہیں جو انہوں نے کشکول میں ثبت فرمائی ہے۔

(کشکول بہائی ج ۱ ص ۲۷، نسخۂ خراسان طبع نجف، عراق)۔

بعض علماء نے ان انبیاء کے مفصل حالات میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ بعض نے زیادہ ''توسّع'' سے کام لیا ہے اور قرآنِ مجید میں مذکور انبیا کے علاوہ دوسرے تاریخی مآخذ سے استفادہ کرتے ہوئے اور بھی بہت سے انبیا کا تذکرہ مرتب فرمایا ہے۔ برادرِ معظم جناب حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا سید ذیشان ہدایتی صاحب قبلہ نے ایک عرصہ سے ''تاریخ انبیاے ہندوستان'' مرتب کرنے کا بیڑہ اٹھا رکھا ہے۔ جس کا کافی مواد جمع کر لیا ہے، لیکن ابھی وہ کام بھی تحقیقی مراحل میں ہے اور اختتام یا اتمام تک نہیں پہنچ سکا ہے۔ اسی طرح اسی موضوع پر ایک آیتِ قرآنی کے ذیل میں معاصر بزرگوار علامہ عبقری حضرت علامہ طالب جوہری مدظلہ العالی بھی تحقیق وتحریر مباحث ومطالب میں مشغول ہیں۔ ربّ کریم سے دعا ہے کہ وہ ان مساعیِ جلیلہ کو اِتمام اور قبولیت سے سرفراز فرمائے۔

مجملاً اس باب میں جو استفادہ میں نے ان بزرگوں کے بیانات سے کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین پر آنے والے پیمبروں میں بعض اہم قرائن کی

بنیاد پر گوتم بدھ، کرشن، مہادیو وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہندوستان کے مشہور صوفی شاعر اور مفسر و عالم حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ کی رائے اور بعض دوسرے علمائے اعلام کی رائیں بھی خاصی شہرت رکھتی ہیں۔ جن کا نقل کرنا ضروری نہیں معلوم ہوتا۔

جہاں قرآنِ مجید میں تمام اقوام یا امتوں میں بعثتِ انبیاء کا تذکرہ کیا ہے وہیں اس افسوس ناک تاریخی حقیقت کا بھی ایک سے زائد مقامات پر تذکرہ کیا ہے کہ ہر امت نے اپنے ''رسول'' یا نبی کا مذاق بھی اڑایا ہے اور خدا کے نمائندوں سے نبرد آزمائی بھی کی ہے۔ انبیا کی زندگیوں میں بھی انہیں ہر طرح کی اذیتیں دی ہیں اور ان کے گزر جانے کے بعد اُن کی سیرتوں کو مسخ اور شریعتوں کو منحرف کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ یقیناً یہ تاریخِ انسانی کا شرمناک ترین باب ہے کہ قرآنِ مجید میں قلبِ مشیت کی بھی ''آہ'' اِن الفاظ میں ڈھل گئی ہے:

﴿يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ﴾ (یٰسین آیت ۳۰)

''ہائے افسوس! ان بندوں پر جن کے پاس جو بھی رسول آیا اس کے ساتھ انہوں نے تمسخر کیا۔''

اسی طرح سورۂ غافر کی یہ آیت ہے:

﴿وَ هَمَّتْ كُلُّ أُمَّةٍ بِرَسُولِهِمْ لِيَأْخُذُوهُ وَ جَادَلُوهُ بِالْبَاطِلِ﴾

(سورۂ غافر آیت ۵)

''اور ہر امت اپنے رسول کی درپے ہوئی کہ انہیں گرفتار کرے اور باطل پر جھگڑتی رہی۔''

اس کے علاوہ اور بھی آیتیں ہیں۔ ان آیات کا تاریخِ انبیاء خصوصاً سیرت و سوانحِ انبیاء اور ان کی طرف منسوب تعلیمات کا مطالعہ کرتے وقت لحاظ رکھنا صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے ازبس ضروری ہے۔ ورنہ گمراہی میں پڑ جانا آسان ہے۔

☆☆☆

تخلیقِ عقل یا نبیِ باطن اور بعثتِ انبیا یا عقولِ کاملہ وظاہرہ کے علاوہ آسمانی صحیفوں کا نزول اور شریعتوں یا زندگی بسر کرنے اور معاشرۂ انسانی کو منظم کرنے کے اصول اور قوانین کا پروردگار کی جانب سے عطا کیا جانا بھی اسی لطفِ ربانی، لطفِ ہدایت اور محبت الٰہیہ کا بہترین مظہر ہے۔ اور غور کیجیے تو جتنے عُلوم وفنون شرفِ انسانی کا سرمایہ ہیں سب کے سب انہیں دو سرچشموں سے حاصل ہوئے ہیں۔ یا عقل و ادراکِ انسانی سے یا تعلیماتِ انبیاء علیہم السلام سے۔ اور اس لحاظ سے تمام علوم و فنون سراسر الطافِ الٰہیہ کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں!

اسی لیے میں اکثر یہ عرض کیا کرتا ہوں کہ جب بھی کسی کے ذہن میں کوئی تازہ علمی نکتہ، نظریہ یا کوئی بھی مسئلہ منکشف ہو، اسے اپنی ذہانت پر نازاں نہیں ہونا چاہیے بلکہ ربِّ کریم کا سجدۂ شکر بجالانا چاہیے کہ معبودِ برحق نے اُس پر لُطف فرمایا، تجلّی فرمائی کہ اُسے انسانی تہذیب کے سرمایہ میں کسی علم و اطلاع کے اضافے کا ذریعہ بنایا۔

اس موقع پر حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشادِ مبارک بھی ذکر کرنے کی سعادت حاصل کرنی چاہیے کہ آپؐ نے فرمایا:

''العلمُ نُورٌ يَقْذِفُهُ اللّٰهُ فِي قَلْبِ مَنْ يَّشَاء''

''علم نور ہے اللہ جس کے دل میں چاہتا ہے ڈال دیتا ہے''۔

☆☆☆

اِس مقام پر تمام علوم وفنون کا تذکرہ تو کُجا اُن کی فہرست سازی بھی ممکن نہیں ہے۔ تاہم چند اساسی علوم وفنون کی طرف کچھ سرسری اشارے بھی ضروری معلوم ہوتے ہیں۔

الطافِ الٰہیہ سے انسانی عقل کا سب سے بڑا اکتساب ''حکمت'' یا ''فلسفہ'' ہے۔ جسے علومِ انبیاء کی تائید بھی حاصل ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اغراض میں شریعت اور حکمت دونوں کی تعلیم شامل ہے۔

''حِکمت'' اصالۃً عربی اور قُرآنی کلمہ ہے۔ اور، اپنے لغوی اور اصطلاحی معانی اور تعریفات کے لحاظ سے، اپنے یونانی مترادف کلمہ ''فلسفہ'' سے کہیں زیادہ وقیع، وزین اور وسیع ہے۔

''حکمت'' یا ''فلسفہ'' کی تعریف میں تعبیرات کا بہت اختلاف ہے۔ لیکن جو تعریف مجھے سب سے زیادہ اچھی اور سچی لگتی ہے وہ یہ ہے کہ ''حِکمت حقیقت کو جاننے اور اس کے مطابق عمل کرنے کا نام ہے۔'' اس تعریف میں حکمتِ نظری اور حکمتِ عملی دونوں ہی کا تعارف شامل ہے۔

حکمت کی یہ بہت پرانی تقسیم ہے کہ بنیادی طور پر اس کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں اور پھر ہر قسم کے تین اقسام بیان کیے گئے ہیں:

حکمت یا فلسفہ
- حکمت نظری یا فلسفۂ نظری
  - الٰہیات، یا علمِ اعلیٰ
  - ریاضیات یا علمِ اوسط
  - طبیعیات یا علمِ ادنیٰ
- حکمت عملی یا فلسفۂ عملی
  - تہذیبِ نفس یا علمِ اخلاق
  - تدبیرِ منزل یا اصولِ خانہ داری
  - سیاستِ مدن یا تدبیرِ اجتماع
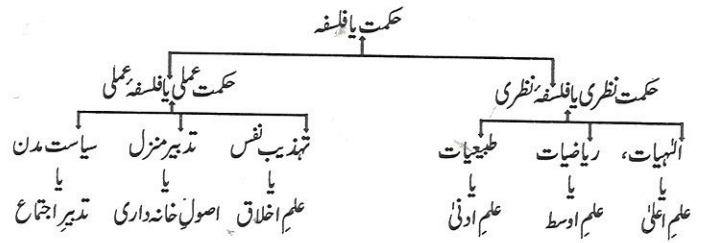
بقیہ تمام علوم انہیں بنیادی علوم کی شاخیں ہیں۔

یہاں پر ایک اور اہم نکتہ کی طرف التفات ضروری ہے کہ ''علوم'' کے

اقسام دراصل اقسام نہیں ہیں بلکہ یہ ''تقسیمِ ناپذیرِ حقیقتِ علم'' کے مختلف مراتب ہیں۔ جنہیں سہولت پسندی سے اقسام کہہ دیا جاتا ہے۔ اور جہاں عُلومِ عقلی کے مراتب ختم ہوتے ہیں وہاں سے علومِ وحی کے مراتب شروع ہوتے ہیں۔ یعنی عالمِ حقیقت وہستی کے جو مراتب عقلِ بشری بطورِ خود درک ودریافت کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے، حضرت ربّ الارباب اپنے فیضِ مزید اور لطفِ مُستزاد سے وحی و نبوت کے ذریعہ عالمِ بشری کو اُن مراتبِ حقیقت وہستی سے بھی ''باخبر'' فرماتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں دامنِ علمِ بشری علومِ وحی یا علومِ نبوت اور کتبِ سماویہ سے مالا مال ہوتا ہے۔ یہی مراتبِ علم ''علومِ دینیہ'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔

''علومِ دینیہ''، جنہیں ''علومِ عقلیہ'' (حکمت یا فلسفہ اور اس کے اقسام) کے بالمقابل ''علومِ نقلیہ'' (Narrative Sciences) کے ضمن میں شمار کیا جاتا ہے، میرے نقطۂ نظر سے اَساسی طور پر قرآنِ مجید ہی سے متفرع یا منشعب ہوتے ہیں۔ اور اسی لحاظ سے علمِ تفسیر کو علومِ دینیہ کی نسبت سے ام العلوم کہنا خلافِ حقیقت نہ ہوگا۔ قرآن مجید کی جو آیتیں توحیدِ ذات اور صفاتِ الٰہیہ سے متعلق مضامین کا احاطہ کرتی ہیں ''علمِ عرفانِ توحید'' کو انہیں آیات کی تفسیر سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح جو آیتیں احکام ومعاملاتِ زندگی سے متعلق ہیں، ''علمِ فقہ'' کو انہیں آیات کی تفصیل اور توضیح قرار دیا جاسکتا ہے۔ بقیہ علومِ دین انہیں دو علوم کی تکمیل وتدوین کے فنی آلات اور وسائل یا مَبادیاتِ فقہ وعرفان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فقہ اور بعض دوسرے علومِ دینیہ پر کچھ اور روشنی دعا کے آئندہ فقروں کے ضمن میں بھی ڈالی جائے گی۔

تخلیق وبخششِ عقل، بعثتِ انبیاء، تنزیلِ کتاب اور کشفِ اسرار وعلوم

کے علاوہ ایک عظیم لطفِ ربانی نظامِ ہدایت کا وہ تربیتی نصاب اور عَملی دستور و منشور بھی ہے۔ خصوصاً وہ تربیتی نصاب جسے ''نظامِ عبادات'' کی شکل میں شریعت کا لازمی حصہ قرار دیا گیا ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکاۃ اور جہاد وہ ارکانِ دین اور تربیتِ انسانی کے وہ نسخے ہیں جو سر بسر لطفِ الٰہی اور محبت و شفقتِ ربانی کے مصالح سے لبریز ہیں۔ مشہور فلسفی ابنِ سینا نے ایک مقام پر لکھا ہے کہ یہ رسومِ عبادات دراصل اللہ کے پیمبر کی غیر موجودگی میں اُن کی قائم مقامی اور یاددہانی کی تاثیر رکھتے ہیں۔

بعض نارسا اذہان تکالیفِ شرعیہ اور رسومِ عبادات کی طلب و تعیین پر مختلف وجوہ سے اعتراض کرتے ہیں مثلاً کوئی کہتا ہے:

بدنام نہ کیوں ہو خَمِ گردن یہ خودی کا
مارا ہے ازل سے تری سجدہ طلبی کا
جھکنا بھی بُرا اور جھکانا بھی بُرا ہے
چوکھٹ سے مٹا داغ مری خیر سری کا

حالانکہ وہ غور نہیں کرتا کہ:

اللہ رے اعجاز یہ سجدہ طلبی کا
احساس تو بیدار ہے بندے میں خودی کا

ہوتا نہ تقاضا تو یہ توہین بڑی تھی
احسان رہا شوق پہ سجدہ طلبی کا

جب سے تری چوکھٹ پہ جھکا ہے سرِ تسلیم
آنکھوں کو کھٹکتا ہے نشاں خیر سری کا

☆☆☆

(۱۹)

فیضانِ حیات و فردوسِ بقا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي يَخْلُقُ وَلَمْ يُخْلَقْ
وَيَرْزُقُ وَلَايُرْزَقُ
وَيُطْعِمُ وَلَايُطْعَمُ
وَيُمِيْتُ الْأَحْيَاءَ وَيُحْيِي الْمَوْتَىٰ
وَهُوَ حَيٌّ لَايَمُوْتُ
بِيَدِهِ الْخَيْرُ
وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ

حمد اس معبود کی!
جو پیدا کرتا ہے خود پیدا نہیں کیا گیا!
جو رزق دیتا ہے اسے رزق نہیں دیا جاتا
جو کھلاتا ہے کھاتا نہیں،
جو زندوں کو مارتا ہے، اور مردوں کو جلاتا ہے
اور وہ خود ایسا زندہ ہے جسے موت نہیں،
اسی کے ہاتھ میں بھلائی ہے
اور وہی ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے

دعائے افتتاح میں حمد وثنا کے سلسلے کا یہ اٹھارواں اور آخری فقرہ ہے۔ اس میں کوئی لفظ اَدَق، غریب، مُغلَق یا مشکل نہیں ہے۔ سادہ الفاظ میں گہری باتیں اور سامنے کی باتوں میں ماورائی حقیقتیں سموئی ہوئی ہیں۔

توحیدِ باری اور ثنائے الٰہی کے بعض اَدَق مضامین گزشتہ فقروں میں آچکے ہیں۔ یہاں پر وہ باتیں ذکر کی گئی ہیں جن پر ہر کس وناکس غور کر سکتا ہے، اور ہر طرح کی تشکیک دل سے نکال کر اطمنان ویقین حاصل کر سکتا ہے۔

''وہ پیدا کرتا ہے خود پیدا نہیں کیا گیا''

یہ جواب ہے ایسے کوتاہ اندیشوں کا جو سمجھتے ہیں کہ ذاتِ باری تعالیٰ کا تصور ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے۔ اس فکر کی ترجمانی بعض شعرانے بہت زیادہ کی ہے اور کچھ ایسی شاعرانہ دل آویزی کے ساتھ کی ہے کہ راہ گم کردہ لوگ اپنی گمراہی میں اور راسخ ہوجاتے ہیں، [1] لیکن شاعری شاعری ہے اور حقیقت وحکمت، حقیقت و حکمت ہے!

تقریباً تمام عالمِ خلقت ہمارے سامنے ہے۔ ہر مخلوق کو ہم بنتے بگڑتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، ہماری سائنسی نگاہ بھی عالَمِ تغیرات کا دقیق تر مُشاہدہ کر رہی ہے۔ اور اگرچہ وہ ''دستِ تخلیق کار'' جو اس تمام سلسلۂ تخلیق وتغیر میں کار پرداز ہے کسی کے مشاہدہ میں نہیں آتا لیکن اُس کے تصرفات تو سبھی کے مشاہدے میں آرہے ہیں۔ اس لیے اُس وجودِ حقیقی اور واجب الوجود کو محض ایک انسانِ مجبور کے تھکے ہوئے ذہن کا ایک تصورِ موہوم کیوں کر کہا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا سوچنا یا اس خیال کا اظہار کرنا، نہ صرف ایک بڑی جسارت ہے بلکہ یہ فکر بجائے خود بعض اذہان کی تھکن یا نارسائی کا مظہر ہے۔ اور جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ مشاہدے ہی میں نہیں آتا تو کسی بھی دستِ تصرُّف کا اُس کے دامنِ ناز تک پہنچنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے کہ کوئی اُسے کسی بھی صورت یا کسی بھی شکل میں تخلیق کرے یا اُسے رزق یا غذا فراہم کرے۔ اسی لیے درحقیقت یہ انسان کے صاف وشفاف ضمیر

---

[1] جیسے:
بے نیازوں کے لیے چاہیے تخییل پناہ
وہ نہ ہو بھی تو ضرورت ہے مسلم اس کی
ہے خدا اورصنم آذرِیِ فکر و نظر
خود اک افسُردہَ اصنام ہے وحدت اس کی
فلسفیوں نے جسے جنبشِ مجبور کہا
فلسفوں پر متبسم رہی حکمت اس کی

اور اُس کے بیدار قلب کی ''اذانِ توحید'' کے بول ہیں جو دعائے افتتاح کے اس فقرے میں آ گئے ہیں:

''وہ رزق دیتا ہے اُسے رزق نہیں دیا جاتا''

''وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں ہے''

یہ انسان کی عملی فکر کے ثمرات ہیں جو نظری سطح پر حقیقتِ توحید کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

''وہ پیدا کرتا ہے خود پیدا نہیں کیا گیا''

یہ جملہ ان لوگوں کی فکری الجھنوں کا بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں مداوا بھی کرتا ہے جو ایک خالق کے قائل تو ہیں لیکن اُس کی عبادت کے لیے طرح طرح سے صنم تراشیاں بھی کرتے ہیں۔ یہ جملہ مُشاہداتی بیان اَور تجربی وجدان کی روشنی میں بطلانِ تسلسل کا نظریاتی محاکمہ بھی ہے۔

''وہ رزق دیتا ہے اُسے رزق نہیں دیا جاتا''

یہ عرفانِ جمیل بھی ہے۔ یعنی حیات وکائنات کی تمام نیازمَندیوں کا اُسی کے فیض سے پورا ہوتے رہنے کا اعتراف ہے اور ساتھ ہی اُس کی عظمت اور عُلُوّ کی یہ شان بھی ظاہر کر رہا ہے کہ ہر شے اپنی ہر ضرورت میں اُسی کی نیازمند ہے جبکہ وہ کسی بھی لحاظ سے کسی کا نیازمند نہیں ہے۔ اور ہر ایک کی تمام نیازمندیوں کو پورا بھی کرتا ہے۔ لفظ ''رزق'' لفظ ''طعام'' سے زیادہ وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اسی لیے اس میں ''تمام نیازمندیوں'' کا ذکر آ گیا۔ جس میں مادّی اور معنوی، جسمانی اور روحانی سبھی نیازمندیاں شامل ہو گئیں۔ اور اسی بنا پر سطحی، مادّی اور جسمانی ضرورتوں تک محدود فکر ونظر رکھنے والوں کے لیے بطورِ استدراک واتمامِ کلام یہ بھی کہا گیا:

''وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں ہے!''

☆☆☆☆☆

چونکہ حمد وثنائے الٰہی کے مضامین کا سلسلہ یہاں پر تمام ہو رہا تھا اس لیے حیات وموت اور حیاتِ ابدی کا تذکرہ کر کے ''عالمِ آخرت'' کی طرف بھی دُعاگزار کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔

''وہ زندوں کو مارتا ہے اور مردوں کو جلاتا ہے''

اِس جملے کی تشریح میں معانی اور مفاہیم کی کئی منزلیں سر کرنی پڑیں گی۔

''حیات'' ایک ذومراتب یعنی نہایت تہہ دار حقیقت ہے اور اس کی ہر تہہ، اس کی ہر سطح اور اس کے ہر مرتبہ کی مناسبت سے ''موت'' کے مفاہیم اور مصادیق بھی اُتنے ہی تہہ دار یا مرتبہ درمرتبہ، سطح در سطح، گوناں گونی کی صفت سے متصف ہیں۔

قرآنِ مجید کی استعاراتی زبان میں ''ایمان'' کو ''حیات'' اور کفر کو ''موت'' سے تعبیر کرنے کی مثال بھی موجود ہے۔

چنانچہ سورۂ مبارکہ یونس کے اِن الفاظ کی:

﴿يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَ يُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ﴾

''وہ زندے کو مردہ سے اور مردے کو زندہ سے نکالتا ہے''

تشریح میں مَروی ہے کہ معصوم علیہ السلام نے فرمایا یہاں پر مراد یہ ہے کہ وہ پروردگار کافر کی صُلب سے مومن اور مومن کی صلب سے کافر کو پیدا کرتا ہے۔

خلاصۂ مطلب یہ ہے کہ حیات کے گوناں گوں مراتب ہیں۔ حیاتِ مادّی کا ایک مرتبہ ہے، حیاتِ روحانی کا مرتبہ کچھ اور ہے۔ حیاتِ دنیوی الگ ہے۔ حیاتِ اخروی جداگانہ ہے۔ حیاتِ ممکن کے مرتبے محدود اور حیاتِ الٰہیہ کی لامتناہی حقیقت بالکل ماورائے حدود وقیود ہے ''وھو حیّ لا یموت''۔ ''وہ ایسا زندہ ہے کہ اُسے موت نہیں ہے''۔ یہاں مطالب اس قدر ہیں کہ ایک علیٰحدہ کتاب کے مقتضی ہیں۔ تاہم چند نکات نہایت اختصار کے ساتھ ذکر کر دینے میں اس مقام پر بھی کوئی

مضائقہ نہیں ہے۔

اولاً: حیاتِ حضرتِ رَبُّ الارباب کی صفتِ ذاتی ہے۔ وہ ''حی'' ہے چونکہ جس طرح حیات صفت ذاتی ہے اسی طرح ''قِدم'' بھی اس کی صفتِ ذاتی ہے۔ جیسا کہ صفاتِ ثبوتیہ میں ذکر کیا جاتا ہے کہ وہ ''قدیم'' ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ چنانچہ اس کی حیات کی ابدیت و سرمدیت میں کوئی جائے تردید نہیں ہے۔ اور یہ بہت سادہ سی بات ہے جو صِفاتِ ثبوتیہ کے مشہور بیان وتقریر کے مطابق کہہ دی گئی۔ ورنہ صفتِ ''قدم'' تو صفتِ حیات کے عینِ ذات ہونے کا لازمہ ہے۔

ثانیاً: جملہ مخلوقات خصوصاً انسان اپنی ابتدا سے انتہا تک مختلف مراتبِ حیات سے گزرتا اور اُسی نسبت سے مختلف موتوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ اس کی مثال اسی ایک عرصۂ حیاتِ دنیوی میں کئی لحاظ سے پیش کی جاسکتی ہے۔ علم ایک مرتبۂ حیات ہے اور اس کے مقابلے جہل ایک موت ہے۔ انسان جب کوئی علم حاصل کرتا ہے تو اس کے وجود کا وہ حصہ زندہ ہوجاتا ہے، جو اُس پر حائز ہوتا ہے۔ اور جب انسان کوئی علم فراموش کردیتا ہے تو اُس کا وہ حصۂ وجود جو اس علم پر حائز ہوتا ہے مردہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ایمان ایک مرتبۂ حیات ہے۔ جب انسان ایمان پیدا کرلیتا ہے تو اسے زندگی حاصل ہوجاتی ہے۔ جب اس کا ایمان زائل ہوجاتا ہے تو وہ اس لحاظ سے مردہ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح ایک ایک اخلاقی صفت کا لحاظ کرتے ہوئے بھی حیات اور موت کے گوناں گوں مراتب کو اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے۔ حضرتِ رب الارباب کی ذات چونکہ ہرلحاظ سے کامل ہے اس لیے اس کی حیات بھی ہرلحاظ سے مکمل ہے اور کسی بھی طرح کی موت کا شائبہ اس میں نہیں پایا جاسکتا۔

ثالثاً: چونکہ حضرتِ احدیت کی حیات ہرلحاظ سے کامل واکمل ہے اسی

لیے خیرِ مطلق کا سرچشمہ بھی وہی ہے اسی لیے اسی سیاق میں کہا گیا :

''اُسی کے ہاتھ میں ساری بھلائی ہے''

اس لیے کہ جہاں بھی عدم کا ذرا سا بھی شائبہ ہوگا اُسی نسبت سے ''خیر'' محدود ہوجائے گا۔ ''الخیر'' کسی نہ کسی طرح ''خَیر'' میں بدل جائے گا۔ اور اسی نسبت سے وہاں ''شر'' بھی پیدا ہوجائے گا۔ یہ بحث بھی کافی بیان وتفصیل کی متقاضی ہے لیکن:

ابھی شکایتِ جورِ خزاں کا وقت نہیں
ابھی حکایتِ فصلِ بہار باقی ہے

اسی فقرے کے ضمن میں حیات وموت کے ذکر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم ایک اور انتہائی اہم بحث یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں، تاکہ توحید کے بعد ''اصولِ دین'' یا انسانی ذہن کے فِکری مسائل کی تشفی کے موضوعات میں سے ایک اور اہم موضوع یعنی موضوعِ ''آخرت'' بھی مختصراً ہی سہی اس کتاب میں زیرِ بحث آجائے۔ جبکہ متن کے سطور و بین السطور میں بھی اس موضوع کی گنجائش موجود ہے۔

ربِّ کریم کے فَیّاض علی الاطلاق ہونے اور خود اس کی حیات کے سرمدی ہونے کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مخلوقات کو بھی، ہر ایک کے حسبِ ظرف، ابدیت کی لذت سے ضرور بہرہ مند فرمائے۔ جبکہ:

''بِیَدِهِ الْخَیْرُ''

''اسی کے ہاتھ میں ساری بھلائی ہے''

اور ''وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر''

''وہی ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے''

پھر اُسے فانی کو بھی باقی بنا دینے میں کیا دشواری پیش آسکتی ہے؟!

''فیضانِ حیات'' اور ''فردوسِ بقا''

رَبِّ حیّ وقیُّوم اور مُنعِمِ غنی وفیاض کی جانب سے اس کے مخلوقات خصوصاً ذی شعور مخلوقات بالاخص ''انسان'' کے مستقبل حیات کا کیا اہتمام ممکن ہے اس سوال پر شاعرانہ فکروتخیل سے کام لے نے والے تو اِس طرح کا استفہام قائم کرتے ہیں:

نہ جانے کل تری جلوہ گری کا نام کیا ہوگا
ادائے خاص کیا ہوگی، لباسِ عام کیا ہوگا

لیکن علمی ،عرفانی اور کلامی مذاق رکھنے والے عالمِ آخرت اور بہشت و دوزخ کے بارے میں اپنے اپنے زاویہ ہائے نظر سے بہت کچھ تفصیلات بیان کرتے ہیں۔

حقیقت عالَمِ برزخ اور امکانِ قیامت سے لے کر وقوعِ حشر ونشر وحساب ومیزان وصراط اور دیگر منازل آخرت واعراف تک اور پھر حقیقتِ جنت ونار اور معنیِ خُلُود وابدیّت تک نہ جانے کتنی بحثیں ہیں جو علمِ کلام، علمِ حکمت اور عرفان اسلامی کی کتابوں میں سموئی ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں پر اُن تمام مباحث کا ان کے تمام جزئیات کے ساتھ ذکر و بیان ممکن نہیں ہے۔ اس لیے صرف چند کلی مباحث کی طرف سرسری اشاروں پر اکتفا کی جاتی ہے۔

اس باب میں سب سے پہلا نکتہ یہ قابلِ ذکر ہے کہ اس وقت کسی بھی آسمانی کتاب میں جنہیں آسمانی کہا یا سمجھا جاتا ہے اور جن میں، سوائے قرآنِ کریم کے، انسان کے دست انحراف نے خوب خوب تحریفیں بھی کر ڈلی ہیں، آخرت کے موضوع پر کوئی قابلِ ذکر تفصیل نہیں ملتی۔ موجودہ توریت تو سرے سے ذکر آخرت سے خالی ہے۔ انجیل میں ضرور چند مقامات پر معمولی سے اشارے باقی رہ گئے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ آج اہلِ توراۃ واہلِ انجیل دُنیا میں فتنہ وفساد اور دہشت گردی کی سیاست اختیار کرنے میں ذرا سی بھی جھجھک محسوس نہیں کرتے کیونکہ سرے

سے ''آخرت'' کا عقیدہ ہی نہیں رکھتے تو حضورِ پروردگار میں جواب دہ ہونے کا خوف ہی کہاں رہ جاتا ہے؟

ہاں! یقیناً یہ صرف قرآنِ کریم ہے جو آخرت پر ایمان، اور دنیا وآخرت دونوں جہانوں میں عدل ومیزان پر نہ صرف بار بار زور دیتا ہے بلکہ اس کتابِ عظیم کی تقریباً بیس فی صد آیتیں آخرت شناسی کے رموز واسرار سے بحث کرتی ہیں۔ اور اگر صرف انہیں آیات کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو اس باب میں کوئی بھی مسئلہ مبہم یا غیر واضح باقی نہیں رہ سکتا۔

قرآنِ مجید کی انہیں آیتوں کی تفسیر وتاویل میں وارد رسولِ اسلام خطیبِ قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثوں اور ائمہ اہلِ بیت علیہم السلام کی بیان کردہ تشریحوں کا مطالعہ اس نتیجہ تک پہنچاتا ہے کہ وقوعِ آخرت پر ایک دو نہیں بلکہ متعدد مستقل دلیلیں بیان کی جاسکتی ہیں۔ اور آخرت یا معاد کے دلائل امکان ہی نہیں بلکہ اس کے وقوع پر دینیاتی، طبیعاتی اور مابعد طبیعاتی تینوں زاویہ ہائے نگاہ سے نہایت مستحکم براہین موجود ہیں۔ ان میں سے سرِ دست ہم صرف پانچ دلائل آخرت کے عناوین ذکر کرنے پر اکتفا کر رہے ہیں۔

۱- دلیلِ حرکت: وجود حضرت باری تعالیٰ پر ارسطو کی جانب ایک دلیل منسوب ہے کہ اس خدا پرست فلسفی نے وجود حق سبحانہ وتعالیٰ پر یہ دلیل قائم کی تھی کہ کوئی بھی حرکت بغیر محرک کے پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس لیے یہ تمام حرکت وحرارت زندگی جو کائنات کی صورت میں ہمارے مشاہدے میں ہے یہ کسی ''محرکِ اول'' کے بغیر کیوں کر وجود میں آسکتی ہے!

اُس نے حرکت ومحرک کے حوالے سے صرف نقطۂ آغاز وابتداء کا معمہ حل کرنے کی کوشش کی تھی۔ بعد کے اسلامی حکماء نے اسی دلیلِ حرکت سے انجام و انتہاء پر دلیل قائم کی کہ ہر وہ حرکت جو کہیں سے شروع ہوتی ہے وہ بالآخر کہیں پر

جا کر ختم ضرور ہوتی ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ حرکت شروع ہو لیکن پھر کبھی ختم نہ ہو۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہ تمام کائنات جو مختلف حرکات ہی کا مجموعہ ہے ایک دِن ضرور نقطۂ آخر تک پہنچ کر تمام ہو جائے گی۔

اس دلیل کی تائید میں بعض آیتوں کے حوالے بھی دیے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آخرت کے دینی یا اسلامی نظریہ پر اس دلیل کی یہ تقریر ناقص ہے۔ آیات سے مزید روشنی حاصل کر کے اِسے ایک مکمل دلیل معاد بنانے کے لیے مزید کدوکاوشِ فکر ونظر درکار ہے۔ اس عاجز وقاصر کا معروضہ یہ ہے کہ قیامت کی دلیل حرکت سے کہیں زیادہ مستحکم وہ کونیاتی دلیل ہے جو قرآنِ مجید کے ان الفاظ میں سموئی ہوئی ہے:

﴿اَلسَّمَاءُ مُنفَطِرٌ بِهِ﴾

''یہ پوری قضائے کائنات اسی حقیقت وحکمت پر مبنی ہے!''[1]

اس ناچیز کی رائے میں قرآنی اور دینیاتی نقطۂ نظر سے سب سے مستحکم دلیل، ''دلیلِ رحمت'' ہے۔

قرآنِ مجید کی پہلی ہی آیت بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے لے کر آخرِ قرآن تک بہت سے مقامات پر جوششِ رحمت الٰہیہ کو دلیل معاد وآخرت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، میں جب بھی اس دلیل کو پیش کرتا ہوں، جناب میر انیس علیہ الرحمہ کا ایک شعر ضرور یاد آ جاتا ہے۔ فرمایا ہے:

سیاقِ رحمتِ معبود ہے قیامت و حشر
ہم اس کو بھی کرمِ بے حساب سمجھے ہیں

خلاصۂ دلیل یہ ہے کہ ربِّ کریم جو کہ غنی علی الاطلاق بھی ہے اور

[1] سورۂ مزمل کی یہ مختصر آیت اپنے دامنِ معنی میں دو دلیلوں کی جامع ہے، دلیل کونی اور دلیل دینی، ''اَلسَّمَاءُ مُنفَطِرٌ بِهِ'' دلیل کونی کا ترجمان فقرہ ہے اور ''كَانَ وَعْدُهُ مَفْعُولًا'' ایک طرح کی دینیاتی دلیل ہے!

فیاض علی الاطلاق بھی! وہ اپنے فیضانِ حیات میں کبھی بھی کوئی کمی فرمانے والا نہیں ہے۔ جبکہ اُس نے ابتدا ہی میں بغیر کسی طلب کے فیضِ وجود عطا فرمایا تو وہ اس فیض کو کبھی ''سلب'' نہیں فرما سکتا۔ بس یہ ہے کہ جو جس طرح کا مذاقِ زندگی پیدا کرے گا اُسے وہ اُسی طرح کا دارِ بقا عطا فرمائے گا۔ زندگی کے حسنِ حقیقی کے قدردانوں کو ''فردوسِ بقا'' عنایت فرمائے گا تو ناقدروں کو خُلود فی النار نصیب ہوگا۔ اور یہ ان کے اپنے مذاقِ زندگی ہی کا صلہ ہوگا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا قرآن مجید میں رحمت کو مختلف الفاظ وعبارات میں پیش کیا گیا ہے، تاہم یہ ایک آیت یہاں پر بطورِ استشہاد پیش کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے سورۂ انعام آیت ۱۲:

﴿قُلْ لِّمَنْ مَّافِي السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾

''کہیے کہ جو کچھ آسمانوں میں اور زمینوں میں ہے، وہ کس کا ہے؟ کہہ دیجیے کہ اللہ کا ہے۔ اس نے اپنے ذمہ رحمت کرنا عائد کر لیا ہے وہ تم سب کو یقیناً روزِ قیامت تک جس میں کوئی شک نہیں اکٹھا کرتا رہے گا جنہوں نے خود اپنا نقصان کیا وہ ایمان نہیں لائیں گے''

دلیلِ حرکت اور دلیلِ رحمت کی طرح دلیلِ حکمت، دلیلِ عدالت، دلیلِ فطرت، دلیلِ قدرت اور اسی طرح مزید دلائلِ آخرت ہیں جن کی تفصیل وتوضیح کلام وحکمت کی مفصل کتابوں سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

وہ بحث بھی اس سے بھی ذرا آگے کی ہے جو ہمارے عرفانی صحیفوں مین پائی جاتی ہے کہ ''قیامت'' بھی کوئی ایک ہی تھوڑی ہے، قیامت یہ ہے کہ پانچ

(۲۰)

درودِ بے پایاں

قیامتیں ہیں جن سے گزر کر انسانِ ضعیف کو ربِّ قوی قہار کا فیضِ ابدی حاصل کرنا ہے۔ شرحِ فصوصِ قیصری کی عبارت ہے:

اَقْسَامُ الْقِیَامَةِ خَمْسَةٌ: مَا هُوَ فِي كُلِّ وَقتٍ وَ آنٍ

وَمَاهُوَ بِالْمَوْتِ الطَّبِيْعِیْ

وَمَا هُوَ بِالْمَوْتِ الارَادِيْ

وَمَا هُوَ مَوْعُوْدٌ مُنْتَظَرٌ

وَمَاهُو بِالْفِنَاءِ لِلْعَارِفِیْنَ!"

قیامت کی پانچ قسمیں ہیں۔ ایک وہ ہے جو ہر وقت اور ہر آن سر پر کھڑی ہے۔

ایک وہ ہے جس سے طبیعی موت کے بعد روبرو ہونا ہے

ایک وہ جو موت اِرادی پر موقوف ہے

ایک وہ قیامتِ موعودِ منتظر ہے

اور ایک وہ قیامت ہے جو عرفاء کو فَنَا فی اللہ کا مقام حاصل ہونے پر برپا ہوتی ہے!

☆☆☆☆☆

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَرَسُوْلِکَ وَاَمِیْنِکَ وَصَفِیِّکَ وَ حَبِیْبِکَ وَ خِیَرَتِکَ مِنْ خَلْقِکَ وَحَافِظِ سِرِّکَ وَمُبَلِّغِ رِسَالاتِکَ اَفْضَلَ وَ اَحْسَنَ وَ اَجْمَلَ وَ اَکْمَلَ وَاَزْکٰی وَ اَنْمٰی وَ اَطْیَبَ وَ اَطْھَرَ وَاَسْنٰی وَاَکْثَرَ مَاصَلَّیْتَ وَبَارَکْتَ وَتَرَحَّمْتَ وَتَحَنَّنْتَ وَسَلَّمْتَ عَلٰی اَحَدٍ مِنْ عِبَادِکَ وَ اَنْبِیَائِکَ وَرُسُلِکَ وَاَھْلِ الْکَرَامَۃِ عَلَیْکَ مِنْ خَلْقِکَ.

اے معبود! رحمت فرما اپنے بندے، اپنے پیمبر، اپنے امانت دار، اپنے برگزیدہ، اپنے چہیتے، اپنی تمام خلقت میں سب سے بہتر، اپنے راز دار اور اپنے پیغامات کے پہنچانے والے محمدؐ پر!

سب سے بہتر، سب سے برتر، سب سے حَسین، سب سے کامل، سب سے زیادہ نفیس، سب سے زیادہ پرفروغ، سب سے زیادہ پرنکہت، سب سے زیادہ پاکیزہ اور سب سے بلند رحمت! اور جو بھی رحمت، برکت، ہمدردی، محبت اور سلامتی تو نے اپنے بندوں، نبیوں، رسولوں، اپنے چنے ہوئے لوگوں اور اپنی تمام خلقت میں سے اپنے نزدیک بامرتبہ، باشرف لوگوں پر کی ہے، اُس سب سے بھی زیادہ!

☆☆☆

اس فقرے کے ساتھ دعائے افتتاح ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتی ہے! یہ مرحلہ نہایت لطیف اور پہلے مرحلے سے شیریں تر ہے۔

پہلے مرحلے میں ربِّ ذوالجلال کی حمد کا زمزمہ تھا جس میں عظمت وجلالِ کبریائی کا پرتو زیادہ تھا۔ اس مرحلے میں رب کریم کے حضور میں اُس کے حبیبؐ کے ذکر کی لطافت شامل ہوگئی ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ ''حبیبِ کبریاء'' اور

اس کے تمام تر اوصاف کے کامل ترین مظہر۔ بطورِ خاص اس کی رحمتِ کاملہ کا مجسمہ ہیں، اس کے محبوب ترین بندے ہیں، اس کے مخلوق اور عبد، اس کے مظہرِ صفات اور پیمبر ہونے کی حیثیتوں سے بجائے خود اس کی لامتناہی اور جاودانی رحمتوں کے مستحق ترین فرد ہیں، اس لیے دعا گزار ربِّ کریم کے حضور میں اُن کا ذکر کر کے رب کی بیش از بیش عنایتیں اپنے شاملِ حال کر لیتا ہے!

کس کے قلم اور کس کی زبان میں طاقت ہے جو ''حبیب کبریاء''، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوصاف، آپ کے خصائص، آپ کی نعت وسیرتِ پاک لکھنے اور بیان کرنے کا حق ادا کر سکے؟! اسی لیے بڑے سے بڑے بلند پرواز، قادرالکلام شاعروں، ادیبوں اور خطیبوں نے ہمیشہ اپنے عجز کا قرارواقعی اعتراف کیا ہے۔

عرفی کا مشہور شعر ہے۔

عُرفی مشتاب این رہِ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دمِ تیغ است قدم را

(اے عرفی جلدی شتابی نہ کرو، یہ نعتِ پیمبر کا راستا ہے کوئی صحرا، کوئی اور وادیِ تخیل نہیں ہے، آہستہ چلو یہاں تلوار کی دھار پر راستا طے کرنا ہے)۔

اسی قصیدے کا ایک اور شعر ہے۔

دانش نکشاید بسزا عقدۂ نعتش
زین جاست کہ اندیشہ نگون کرد علم را

(علم ودانش کے زور سے آپؐ کی نعت کا عقدہ حل نہیں ہو سکتا، یہی وہ مقام ہے جہاں فکر وتخیل نے اپنا پرچم سرنگوں کر دیا ہے!)

اور غالبؔ کا یہ مقطع بھی بہت مشہور ہے۔

غالبؔ ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتیم
کاں ذات پاک مرتبہ دانِ محمدؐ است!

(غالبؔ ہم نے آقا کی ثنا، حضرت یزداں پر چھوڑ دی ہے کیونکہ وہی ذات پاک اس ستودہ صفات کی مرتبہ داں ہے!)

حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی سیرتِ طیبہ کا سچا مرقع تو ربِّ کریم کا ''قرآن'' ہی ہے جس میں آپ کے ''خلقِ عظیم'' اور ''رحمتِ عالمین'' ہونے کے اسنادِ الٰہی ثبت ہیں اور جس کے آیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کی عبادت وبندگی ،مجاہدۂ نفس اور جہاد فی سبیل اللہ کی کوئی حدّ وانتہا سامنے نہ آسکی بلکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو ارشاد فرمانا پڑا:

''اے میرے حبیب نمازیں پڑھو، مگر کم...''

﴿یَا اَیُّھا المُزَّمِّل قُمِ اللَّیلَ اِلّا قَلِیلاً...﴾

یا رب کریم کو یہ فرمان صادر کرنا پڑا کہ:

''اے میرے پاک و پاکیزہ، طیب و طاہر، اے طٰہٰ، اے نفاست کے پیکر، میں نے قرآن تمہارے اوپر اس لیے نہیں اتارا کہ اتنی زحمتیں اور مشقتیں اٹھاؤ...''

﴿طٰہٰ مَا اَنزَلنَا عَلَیکَ القُرآنَ لِتَشقٰی﴾

''...لگتا ہے تم اس غم میں کہ لوگ مجھ پر ایمان نہیں لاتے اپنی جان دے ڈالو گے...''

﴿لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَفسَکَ الَّا یَکُونُوا مُؤمِنِینَ...﴾

قرآن مجید کے ان آیات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت

کیسی محبت الٰہیہ، کیسے تعلق خاص اور کس قدر محبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے اور جناب ربّ العزت کی نسبت آپؐ کی بندگی اور جاں نثاری کی کیسی بے پناہ کیفیت سامنے آتی ہے۔

جب آپؐ نے مخلوق ہو کر اس کی بندگی میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی تو وہ آپؐ پر اپنی رحمتوں کا سلسلہ کیسے منقطع کرسکتا ہے اسی لیے اس نے ارشاد فرمایا:

''اِنَّ اللّٰہَ وَمَلا ئِکَتَہ' یُصَلُّونَ عَلیَ النَّبِیِّ یَا اَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَیہِ وَسَلِّمُوا تَسلِیماً'' (سورۂ احزاب ۵۶)

''حق یہ ہے کہ اللہ اور اُس کے فرشتے اِس نبی پر درود بھیجتے ہیں اے ایمان والو! تم بھی اُن پر درود بھیجو اور اُن کے سامنے اس طرح سرِ تسلیم خم کرو جو اطاعت اور تسلیم کا حق ہے!''

اور اسی لیے ہر دعا گزار کی دُعا کا ایک ضروری جزو ''صلوٰت'' ہوتی ہے۔

چنانچہ اس دعائے افتتاح میں بھی یہ صَلوٰت کا جزو بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

☆☆☆

اِس فقرۂ دعا میں جو الفاظ آئے ہیں اُن کے معانی ترجمے سے ظاہر ہو گئے ہیں۔ ان کے مزید اشتقاقی اور تصریفی مسائل سے یہاں صرفِ نظر کرتے ہیں۔ اور ان محدود و معدود سطور و صفحات میں جس قدر بھی ممکن ہے ''سیرتِ طیبہ'' ہی سے متعلق نکات پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

☆☆☆

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آئینۂ سیرت اسماء وصفاتِ ربّانیہ کی غیر منقطع تجلیات سے اس قدر معمور ہے کہ اس آئینۂ جلال و جمال کا کوئی ایک جوہر

بھی کسی کی چشمِ حیراں میں سما نہیں سکتا۔ تاریخ کی کتابوں میں جو کچھ ہے وہ آپؐ کی حیاتِ جاوداں کا بس ایک ایسا پرتو ہے جو اس خاکنائے دہر کے لیے قابلِ تحمل ہو سکتا تھا، بلکہ اس سے بھی کم!

آپؐ کی تاریخِ تخلیق کا مصرع تو لوحِ عرش کی زینت ہے، نہ اسے کوئی پڑھ سکتا ہے نہ بتا سکتا ہے کہ آپ کا نورِ مبارک کب خلق ہوا، ہمیں تو آپؐ ہی کی زبانی معلوم ہوا:[1]

"اَوَّلُ ما خَلَقَ اللّٰہُ نُورِی"

"معبود نے سب سے پہلے جو خلق کیا وہ میرا نور تھا"

اسی طرح کوئی نہیں بتا سکتا کہ آپؐ کی نبوت کا سلسلہ کب شروع ہوا، آپ کا یہ ارشادِ مبارک آپؐ کی نبوت کے کسی درمیانی مرحلے کا سُراغ دیتا ہے:

"کُنْتُ نَبِیّاً و آدمُ بَیْنَ المَآءِ وَالطِّیْنِ"

"میں اس وقت بھی نبی تھا جب آدم پانی اور مٹی کے درمیان تھے"

ہاں جب آپ نے اس خاکنائے دہر کو اپنے ظہور سے منور فرمایا تو وہ ماہِ ربیع الاول کی ۱۷ر تاریخ جمعہ کا دن عام الفیل کا پہلا سال اور سن عیسوی کے لحاظ سے ۵۷۰ء کا سال تھا۔

آپؐ کی ولادت حرمِ الٰہی مکۂ مکرمہ میں اللہ کے ولی اور کعبہ کے متولی حضرت ابوطالب علیہ السلام کے گھر میں ہوئی۔ یہ گھر آج تک محفوظ اور دار القرآن کے نام سے موسوم ہے!

[1] راقم کے ایک نعتیہ قصیدہ کی ایک بیت ہے۔

ظلمتِ تاریخ کے فرزند کیا پائیں سُراغ
اس کی تاریخِ تجلی عرش پر تحریر ہے

آپؐ نے ۵۳ر برس اسی شہر میں گزارے، ۴۰ر برس خاموش عملی تبلیغ کے اور ۱۳ر برس رسالت کے منصب پر فائز ہو کر ہمہ گیر طور پر پیغام رسانی کے۔ ۱۰ر برس مدینہ منورہ میں گزارے اور اسی شہر کو اپنا حرم قرار دیا۔ جب آپ نے ۲۸ر صفر ۱۱ ہجری کو دارِ بقا میں لقائے خدا اختیار فرمایا تو اسی سرزمین کو قیامِ قیامت تک آپ کے جسدِ اطہر کی امانت داری کا شرف نصیب ہوا۔

"صَلَوٰتُ اللّٰہِ وَصَلَوٰتُ مَلائِکَتِہٖ وَاَنْبِیائِہٖ وَرُسُلِہٖ وَجَمِیْعِ خَلْقِہٖ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ وَالسَّلامُ عَلَیْہِ وَ عَلَیْہِمْ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ!

☆☆☆

۶۳ر برسوں کی مدتِ زمانی میں آپؐ نے وہ نمونۂ زندگی پیش کیا جس سے اس خاکزار کے کسی بھی گوشے میں اور کسی بھی عہد میں گزر بسر کرنے والا کوئی بھی بشر، فائدہ اٹھا کر "خدارسیدہ انسان" بن سکتا ہے!

سبھی انبیا خالقِ کائنات اور معبودِ برحق کی وحدانیت کا پیام لے کر آئے تھے لیکن تقریباً ہر نبی کی یا تو زندگی ہی میں یا اس کی وفات یا شہادت کے فوراً بعد اس کے ماننے والوں میں کسی نہ کسی صورت سے شرک و بت پرستی داخل ہوگئی۔ لیکن آپؐ کے کمالِ تبلیغ نے حقیقتِ توحید کو ذہنوں اور ضمیروں میں اِس طرح راسخ کر دیا کہ ذاتِ باری گویا انسانی ادراکات (Perceptions) کے دائرے میں آگئی اور آپؐ کے زیرِ داماں پروردہ ذہانت نے کہا:

"لَوْ کُشِفَ الغِطآءُ لَمَا ازْدَدْتُ یَقِیْناً"

"اگر پردے ہٹا دیے جائیں تو میرے یقین میں کوئی اضافہ نہ ہوگا"

یہی نہیں آپؐ کے ادائے حق رسالت کا لازوال اثر یہ ہے کہ آج تک آپؐ کے دین میں کسی بھی شکل وصورت میں شرک و بت پرستی کا نفوذ نہ ہوسکا۔ نہ آئندہ قیامت تک اس کا امکان ہے! اربابِ فکر ونظر کے لیے اس نکتہ میں ختمِ نبوت کا ایک بڑا راز پوشیدہ ہے!

آپؐ نے مدینہ منورہ میں ''مدینۂ فاضلہ'' بلکہ ''مدنیّتِ الٰہیہ'' کی بنیاد رکھی! افراد انسانی کو انفرادی زندگی بسر کرنے کے آداب سکھانے کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی کو معمور رکھنے کے اصول اور قوانین تعلیم فرمائے۔ تھوڑے تھوڑے قوانین کے مجموعے تو گزشتہ انبیاء کی میراث سے بھی بعد کے انسانوں تک منتقل ہوتے آئے تھے لیکن آپ نے قیامِ قیامت تک کے لیے پہلے سے وضع شدہ قوانین کی غیر موجودگی میں تازہ قوانین بنانے کے اصول اور ضوابط بھی تعلیم فرمائے۔ یہ بات بھی منجملۂ اسرارِ خاتمیت ہے!

آپؐ نے اللہ کے تمام احکام اور اللہ ہی کے دیے ہوئے حکم اور حق کے تحت اپنے بنائے ہوئے تمام قوانین کے نفاذ میں بھی دنیا کے سامنے مثالی کردار پیش کیا اور اخلاق کی اس بلندی پر فائز ہوئے کہ خالقِ کائنات نے ''اِنَّکَ لَعَلیٰ خُلُقٍ عَظِیم'' کی لفظی سَنَد عطا فرمانے کے ساتھ ساتھ عملاً آپؐ کو ''معراج'' کا شرف بخشا!

اہلِ دل آگاہ ہیں کہ معراجِ مصطفوی بھی مقامِ ''ختم نبوت'' کا ایک سُراغ نامہ ہے!

آپؐ نے اپنی مختصری زندگی میں تقریباً ۶۷/ (یا بقولے ۸۴) چھوٹی بڑی جنگیں لڑیں، جو سب کی سب دفاعی تھیں اور جن میں آپ کی حکمتِ عملی سے مثالی حد

تک کم سے کم خوں ریزی ہوئی اور زیادہ سے زیادہ احکام، اقدار اور جان و مال و ناموسِ انسانی کی حفاظت ہوئی بلکہ اپنے جانبازوں کے لیے آپؐ کے فرامین حقوقِ بشری کے ساتھ ساتھ زمینوں، کھیتوں، درختوں اور حیوانوں تک کے حقوق کی نگہداشت کے مثالی دستور کی حیثیت رکھتے ہیں!

''عَبدُکَ''

دعائے افتتاح میں صلوٰت کا یہ فقرہ ہو، یا اذان وتشہدِ نماز میں رسالت کی گواہی کے جملے، اکثر مقامات پر آپ دیکھیں گے کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نام نامی کے ذکر کے بعد آپ کی رسالت کی گواہی سے پہلے آپ کی ''عبدیت'' کی گواہی دی گئی ہے! بجائے خود اس میں بڑے بڑے اسرار و آیات پوشیدہ ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ''شانِ بندگی'' کی عظمتوں کا بھی کوئی ٹھکانہ ہے؟!

آپؐ کی ''لامتناہی عبدیت'' معراج بداماں ہے! سورۂ اسراء کا مطلع کس مسلمان، مومن اور عاشقِ رسول کو یاد نہ ہوگا؟ جس میں ربِّ سبحان نے اپنے بندۂ خاص کی ''دعوتِ لاہوتی'' کا تذکرہ کرکے خود اپنی بڑائی بیان کی ہے:

﴿سُبحَانَ الَّذِیْ اَسریٰ بِعَبدِهٖ لَیلًا مِّنَ المَسجِدِ الحَرَامِ اِلَی المَسجِدِ الاَقصیٰ الَّذِیْ بَارَکْنَا حَولَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ آیَاتِنَا اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیعُ البَصِیرُ﴾

''پاک ہے، منزہ ہے جس نے اپنے بندے کو راتوں رات سیر کرائی، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک، جس کے گرد و پیش کو ہم نے پُر برکت

بنایا ہے تاکہ ہم اسے اپنی نشانیاں دکھائیں، یقیناً وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے!''

معراج واسرائے پیغمبرؐ کے موضوع پر پوری بحث کا یہاں موقع نہیں ہے۔

اس مقام پر لفظ ''عَبْـــدِکَ'' کی اہمیت اور اس کی تشریح میں ایک ارشاد نبوی بھی سماعت فرمالیں۔ مبرّد نے الکامل میں نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''لَا تَرْفَعُوْنِی فَوْقَ قَدْرِي، فَتَقُولُوا فِيَّ مَا قَالَتِ النَّصَارىٰ فِي الْمَسِيحِ، فَإِنَّ اللّٰهَ اتَّخَذَنِي عَبْداً قَبْلَ اَنْ يَّتَّخِذَنِي رَسُوْلاً''

''مجھے میری واقعی قدر ومنزلت سے اوپر نہ اٹھانا کہیں تم میرے بارے میں ویسی بات کہنے لگو جو نصاریٰ نے مسیح کے بارے میں کہدی، اس لیے کہ اللہ نے مجھے اپنا پیمبر بنانے سے پہلے اپنا بندہ بنایا ہے''!

یہیں پر ایک یاددہانی بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اسی روایت کو توڑ مڑور کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حاسدوں نے ایسی روایتیں بھی بنا ڈالی ہیں اور وقتاً فوقتاً اسے اپنی تحریروں اور تقریروں میں پیش کرتے رہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا مجھے مجھ سے پہلے کے انبیاء اور مرسلین سے افضل و برتر قرار نہ دو... ظاہر ہے کہ وہ روایتیں بے اصل ہیں۔ آنحضرتؐ کی فضیلت تمام انبیاء پر عقلاً اور نقلاً ہر طرح ثابت اور آشکارا ہے۔ اس میں کوئی جائے بحث نہیں، اصل روایت یہی ہے جو مبرّد کے حوالے سے عرض کی گئی۔

یقیناً آپ ''ابن اللہ'' نہیں ہیں، ''ثالث ثلاثہ'' نہیں ہیں، آپ معبودِ

وَاحِد واَحَد کے وَاحِد واَحَد بندے ہیں۔

ع وہ خالقِ کل ہے تو یہ کاملِ مخلوق!!

☆☆☆

''رَسُوْلِکَ''

آپ کی شانِ رسالت اور اَسرارِ خاتمیت پر چند اشارے گزشتہ سطور میں گزر چکے، یہاں پر ہم صرف لفظ رسول پر تھوڑی سی گفتگو کرنا چاہیں گے۔

''رسول'' کے لفظی یا لغوی معنی ہیں ''بھیجا ہوا'' ___ قرآن مجید میں اس کا اطلاق فرشتوں پر بھی ہوا ہے اور انسانوں پر بھی۔ لیکن ''اصطلاحی'' تعریف کے لحاظ سے ''مرتبۂ رسالت ونبوت'' پر ربِّ کریم نے صرف اپنے والہانہ اطاعت شعار اور ''انسانِ کامل'' بندوں کو منصوب فرمایا ہے اور انہیں سندِ رسالت کے طور پر معجزات عطا فرمائے۔

ہمارے نبی کریم حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی بہت سے معجزات عطا فرمائے گئے۔ لیکن آپؐ کا سب سے بڑا معجزہ ''قرآنِ مجید'' ہے۔ جس کے بارے میں دُعا کے آئندہ فقروں کے ضمن میں کسی قدر تفصیلی بحث آئے گی۔

بعض علماء وحکماء نے معجزات کی دو قسمیں قرار دی ہیں: ''قولی معجزات'' یعنی وہ معجزات جن کا تعلق صرف لفظ وبیان سے ہے جیسے ''قرآنِ مجید''۔ اور ''فعلی معجزات''، یعنی وہ معجزات جن کا تعلق عمل اور عناصرِ خارجیہ سے ہے۔ جیسے سرکارؐ کے ہاتھوں پر سنگریزوں کا کلمہ پڑھنا، درخت کا حرکت کرنا، چاند کا شق ہونا یا سورج کا پلٹنا! اس ضمن میں یاد رکھنا چاہیے کہ آنحضرتؐ کا سب سے بڑا معجزہ ''قرآن'' اپنے ''متن ومحتویٰ'' کے لحاظ سے تو ''قولی'' معجزہ ہے، لیکن اپنے آثار اور اپنی بقا

کے لحاظ سے یہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فعلی معجزہ بھی ہے!

اس کے علاوہ آپ کا ایک فعلی معجزہ جو آج تک باقی ہے اور قیامت تک آپ کی شانِ اعجاز کی طرف لوگوں کی توجہ کو مبذول کراتا رہے گا وہ مسجد نبویؐ کے ''قبلہ'' کا تعین ہے!

اس کی شرح و تفصیل علیحدہ مقالے کی متدعی ہے۔

یہ سب اپنی جگہ پر، لیکن ہمارے ایک مرثیہ نگار شاعر ڈاکٹر سید صفدر حسین مرحوم نے کیا اچھی اور سچی بات کہی ہے کہ

ع ''معجزے دو تھے پیمبرؐ کے علیؑ اور قرآن''

دعا کے اس کے بعد کے فقرے میں وصیِ رسولؐ و معجزۂ خاتم حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام ہی پر درود و صلوٰت کا ذکر ہے۔

☆☆☆☆☆

(۲۱)

سلامِ فروزاں

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلىٰ عَلِيٍّ اَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ

وَوَصِيِّ رَسُولِ رَبِّ الْعالَمِينَ

عَبْدِكَ وَوَلِيِّكَ

وَاَخِي رَسُولِكَ

وَحُجَّتِكَ عَلىٰ خَلْقِكَ

وَآيَتِكَ الْكُبْرىٰ

وَالنَّبَأُ الْعَظِيمِ

اے معبود! رحمت فرما امیرالمومنین،

وصی رسول،

اپنے بندۂ خاص اور اپنے ولی

اپنے رسول کے بھائی

اور اپنی تمام خلقت پر اپنی ''حجت''،

اپنی بزرگ نشانی

اور اپنے ''عظیم ترین پیغام'' علیؑ پر!

☆☆☆

دعائے افتتاح کا یہ فقرہ حضرت امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے بارے میں تمام عقائدِ حقہ بلکہ آپؑ سے متعلق جملہ مباحث کا بہترین خلاصہ ہے۔

دعا کے اسی فقرے کی مکمل اور مفصل شرح کی جائے تو کئی ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک مستقل کتاب تیار ہو جائے۔ بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ آج تک حضرتِ

امیرالمؤمنین علیہ السلام کے بارے میں قرآن وحدیث کی صحیح ترجمانی کرتے ہوئے جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں اُن سب کو دُعائے افتتاح کے اس فقرے کی شرح سمجھنا چاہیے۔

''علیؑ'' نام ہے اور آپؑ کی بلند پایہ ذات کا ایک نامی حوالہ ہے۔

''امیرالمؤمنین'' آپ کے ظاہری منصبِ الٰہی کا شناس نامہ ہے۔

''عَبدِکَ'' آپؑ کی مخصوص عرفانی حقیقت کا استعارہ ہے،

''ولیک'' آپ کے باطنی عُہدۂ ربانی، واسطۂ فیض رحمانی اور وسیلۂ فیضانِ رحیمی ہونے کا تعارف نامہ ہے۔

''اخی رسولک'' آپ کی شخصیت کے تمام نَسبی اور نِسبی فضائل ومناقب کا حسین ترین کنایہ ہے۔

''وَحُجّتِکَ علیٰ خلقک'' خدا اور دینِ خدا کی طرف آپ کی رہنمایانہ حیثیت اور عصمت کا توثیق نامہ ہے۔

''آیتک الکبریٰ'' اور ''نبأ عظیم'' آپ کی ذات وشخصیت کے قرآنی استعارے اور القاب ہیں۔

میں نے اس سے قبل کہیں لکھا ہے اور بارہا منبروں سے کہا ہے کہ:

''حق ناشناس لوگ خصوصیت کے ساتھ حضرت امیرالمؤمنین علیہ السلام کے مقام ومنصب اور آپ کے فضائل میں شکوک وشبہات رکھتے ہیں یا پیدا کرتے ہیں اور کبھی کبھی یہ سوال کرتے ہیں کہ آپ کا نامِ نامی قرآن میں کیوں نہیں آیا؟ حالانکہ کب نہیں آیا اور کہاں نہیں آیا؟

جب کسی شخصیت میں گوناگوں صفات ہوتے ہیں تو اسی مناسبت سے اس

کے نام اور القاب بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ ربّ کریم نے تو اپنے اس جامعِ کمالات ''ولی'' اور مظہرِ صفات ''بندے'' کا ذکر ایک سے ایک اچھے سے اچھے اسماء والقاب کے ساتھ قرآنِ مجید میں جابجا فرمایا ہے! کہیں صراطِ مستقیم کہا ہے تو کہیں امام مبین، کہیں ''حبلِ متین'' کہا ہے تو کہیں ''ماءِ معین''، کہیں ''خیر البریّہ'' کہا ہے تو کہیں ''صالح المؤمنین''، کہیں ''نباءِ عظیم'' کہا ہے تو کہیں ولیِ امرِ مُسلمین، بلکہ ولیِ امرِ عالمین...

کہیں کتاب کہا ہے تو کہیں ذکر، کہیں صلاۃ کہا ہے تو کہیں صبر، کہیں اذان کہا ہے تو کہیں دُعا!...

کہیں ''ولی'' کہا ہے تو کہیں وسیلہ، کہیں عدل کہا ہے تو کہیں احسان، کہیں حیاۃ کہا ہے تو کہیں ایمان... کہیں وصی کہا ہے تو کہیں وارث... کہیں خلیفہ کہا ہے تو کہیں امام!

معلوم ہے کہ تاریخ میں آپ کے صرف چند نام، القاب اور کنیتیں زیادہ مشہور ہیں مثلاً علی، حیدر، امیر المؤمنین، مرتضیٰ، ابوالحسن اور ابوتراب، یعسوب الدین، یعسوب المسلمین وغیرہ۔

غالبؔ نے اپنی ایک فارسی کی دُعائیہ نظم میں بڑے حُسن کے ساتھ حضرت علی علیہ السلام کے چند اسماء والقاب کو ایک ہی مصرع میں نظم کیا ہے۔

حرمتِ جانِ محمدؐ یک نظر کن سوئے من
یا علی یا مرتضیٰ یا بوالحسن یا بوتراب!

ہمارے مشہور مُفکر شاعر سر ڈاکٹر اقبالؔ نے جناب امیر المؤمنین علیہ السلام کے اسمائے مبارکہ کے کچھ اسرار اپنی مثنوی اسرار خودی میں بیان کرکے اس

منظومہ کی زینت اور معنویت میں چار چاند لگائے ہیں اور اس فصل میں ایسے نکات پیدا کیے ہیں جس سے اُن کے فلسفہ اور پیغام کو تقویت ملتی ہے۔

اقبالؔ کے یہ اشعار یہاں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''در شرحِ اسرارِ اسمائے علی مرتضیٰؑ''

مسلمِ اوّل شہِ مرداں علیؑ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؑ
از ولائے دودمانش زندہ ام
در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام
نرگسم وارفتۂ نظارہ ام
در خیابانش چوبو آوارہ ام
زمزم ار جوشد زخاکِ من از اوست
مے اگر ریزد زتاکِ من از اوست
خاکم و از مہرِ او آئینہ ام
می تواں دیدن نوادر سینہ ام
از رُخِ او فال پیغمبرؐ گرفت
ملّتِ حق از شکوہش فرگرفت
قوتِ دینِ مبیں فرمودہ اش
کائنات آئیں پذیر از دودہ اش

مُرسلِ حق کرد نامش بوتراب
حق ید اللہ خواند در اُم الکتاب
ہر کہ دانائے رموزِ زندگیست
سرِّ اسمائے علیؑ داند کہ چیست
خاکِ تاریکے کہ نامِ او تن است
عقل از بیدادِ او در شیون است
فکرِ گردوں رس زمیں پیما ازو
چشم کورو گوش ناشنوا ازو
از ہوس تیغ دو رُو دارد بدست
رہرواں را دل بریں رہزن شکست
شیرِ حق ایں خاک را تسخیر کرد
ایں گلِ تاریک را اکسیر کرد
مرتضیٰؑ کز تیغ او حق روشن است
بوتراب از فتح اقلیم تن است
مرد کشور گیر از کراری است
گوہرش را آبرو خود داری است
ہرکہ در آفاق گرد بوتراب
باز گر داند زمغرب آفتاب
ہرکہ زیں برمرکبِ تن تنگ بست
چوں نگیں برخاتمِ دولت نشست
زیرِ پاش اینجا شکوہِ خیبراست
دست او آنجا قسیمِ کوثر است

از خود آگاہی یداللّٰہی کند
از یداللّٰہی شہنشاہی کند
ذات او دروازۂ شہر علوم
زیرِ فرمانش حجاز و چین و روم
حکمراں باید شدن بر خاکِ خیش
تا مئے روشن خوری از تاکِ خیش
خاک گشتن مذہبِ پروانگی است
خاک را اب شو کہ ایں مردانگی است

بلاشبہ حضرتِ امیر المؤمنین علی مرتضیٰ علیہ التحیۃ والثنا کی ذاتِ مبارک حضرت خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک زندہ مجسم اور لازوال معجزہ ہے۔ اور منجملۂ اسرارِ خاتمیت ہے!

• آپ کی ولادت ۱۳/رجب المرجب ۳۰ھ عام الفیل کو مکۂ مکرمہ میں جوفِ کعبہ میں ہوئی، اور یہ وہ شرف ہے جو کبھی کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔ جیسا کہ ائمۂ حدیث وتاریخ: حاکمِ نیشاپوری، ابنِ صباغ مالکی، ابوعبداللہ محمد بن یوسف شافعی، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، ملّا مبین فرنگی محلی اور بہت سے محدثین ومؤرخین نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

مرزا دبیر علیہ الرحمہ کی ایک رُباعی کے آخر کے دو مصرعے ہیں۔

ہوں بیت سے جس طرح عیاں معنیِ بیت
یوں ہم نے علیؑ کو حق کے گھر سے پایا

اردو، فارسی، ترکی، عربی اور دوسری زبانوں میں بھی شاہکار قصیدے کہے

گئے ہیں، لیکن مجھے سنائی کا یہ شعر بہت پسند ہے:

در پسِ پردہ آنچہ بود آمد
اسد اللہ در وجود آمد

اور اسی طرح عربی کی یہ بیت ۔

مَا لُفَّ فِي خِرَقِ القَوَابِلِ مِثْلُهُ
اِلَّا ابْنُ آمِنَةَ النَّبِي مُحَمَّدُ

● آپ کی ولادت سے پہلے اور ولادت کے وقت ہی کے معجزات وکرامات اتنے ہیں کہ انہیں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے اور ان سے متعلق تمام روایات میں پوشیدہ اَسرار اور ان اَسرار کے تاویلات پر بحث کی جائے تو بجائے خود ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی۔ اسی سے ظاہر ہے کہ آپؑ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ کرامات و معجزات بداماں تھا!

● آپ نے اس دنیا میں کل ۶۳ برس گزارے۔ جس میں ۳۳ برس اپنے ابنِ عم، استاد و مربی، رسول خاتم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ بسر کیے۔ اُنہیں کی آغوشِ نُور اور سایۂ رحمت میں پروان چڑھے اور انہیں کے قدم بہ قدم تمام مہماتِ رسالت میں کار پرداز رہے!

● آپؑ کے ذاتی اوصاف میں تمام اُصولِ اخلاق؛ حکمت و شجاعت و عفت کا ایسا ہی اجتماع تھا کہ آپ آیتِ مباہلہ میں صاحب خلقِ عظیم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے لیے بمنزلۂ ''نفس'' قرار دیے گئے۔

● آپؑ کے علم کے چرچے محبوں اور مبغضوں دونوں ہی کی زبانوں پر اپنے اپنے انداز سے، شروع سے آج تک جاری رہے ہیں۔ جمع قرآن و تفسیر قرآن اور فی الجملہ علوم القرآن کے باب میں آپ کے کارنامے، تالیف و تحفظِ سیرتِ نبویہؐ میں آپ کے مجاہدات، بیان و بلاغت میں آپ کے معجزات، علوم ادب کے ایجاد اور

تدوین میں آپ کے اولیات، قیامِ قیامت تک سبیلِ علم و حکمت بنے رہیں گے۔

● آپ کی شجاعت کے باب میں چاہے بدر و احد و خیبر و خندق و حنین کے غزوات ہوں، چاہے جمل و صفین و نہروان کے معرکے، چاہے عہدِ نبویؐ میں یمن سے لے کر خود اپنے عہد حکومت میں سرحدِ ہند و سندھ تک کے فتوحات، تاریخ عزیمت و شرف انسانی میں تجلی بار حرفوں سے لکھے ہوئے کارنامے ہیں۔

● آپؑ کی سیاست عدلِ الٰہی کا مکمل آئینہ تھی۔ جو اہلِ دنیا اور طالبانِ دنیا کے لیے ناقابلِ تحمل تھی، اسی لیے جمل و صفین کے معرکے پیش آئے اور یہی عدل گسترانہ راہ و روش آپ کی شہادت کا سبب بنی۔ اس سلسلے میں آپ کا ایک انتہائی بلیغ جملہ گوشِ تاریخ میں گونجتا رہتا ہے: ''انا قتیل العدالة'' ''میں کشتۂ عدالت ہوں'' آپ کی شہادت کا واقعہ یہ ہے کہ ایک باغیانہ منصوبہ کے تحت انتہائی سازشی انداز میں ۱۹ ر رمضان المبارک کو مسجد کوفہ میں، نماز فجر میں آپ کے اوپر قاتلانہ حملہ کیا گیا، اور ۲۱ ر رمضان المبارک ۴۰ ھ کو آپ نے اس دارِ فنا سے دارِ بقا کی جانب توجہ فرمائی۔

کردیا کلکِ مشیت نے بصد ناز و نیاز
فرقِ محراب پہ تاریخ شہادت تحریر
۴۰ ھ

آپ کی ولادت اور شہادت دونوں واقعات کو ایک ہی شعر میں بہت سے شعراء نے نظم کیا ہے لیکن اس موضوع و مضمون کا غالباً سب سے مشہور شعر شیخ سعدی کا ہے۔

کسے را میسر نہ شد ایں سعادت
بہ کعبہ ولادت بہ مسجد شہادت

اردو میں لِسان القوم مولانا سید علی نقی صفی لکھنوی کے قصیدۂ لامیہ کے یہ اشعار بھی قابلِ حوالہ ہیں:

مہد سے تابہ لحد ذاتِ خُدا پر تکیہ
مسقط الرأس حرم، مسجدِ کوفہ مقتل
ذکرِ توحید ہے بے ذکر علی لاحاصل
نقدِ اسلام ہے بے حبِّ علی جنسِ دَغل [1]

☆☆☆

تاویلِ آیات کے باب میں واردِ ارشاداتِ نبویہ میں سورۂ والشمس کی آیت ''اِذِانبَعَثَ اَشقٰھَا'' کی تاویل میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کا قاتل ''اَشقی الآخرین'' اور ''اشقی الناس'' ہے!

بظاہر آپؑ کا قاتل ایک خارجی تھا۔ لعنۃ اللہ علیہ وعلیٰ مَن اَیدہ من الاولین والآخرین۔ لیکن تاریخ کے دقیق مطالعہ اور تجزیہ سے آپ کے قتل کی تمام تر ذمہ داری 'باغیِ شام' پر عائد ہوتی ہے۔

کوئی چاہے اس سے اختلاف کرے یا اس کا اعتراف، اور قتلِ امیر المؤمنین علیہ السلام کی اصلی ذمہ داری جس پر بھی عائد ہوتی ہو، قرآنِ کریم کی یہ آیتیں اُس کے انجام کی پوری خبر دیتی ہیں:

---

[1] لسان القوم مولانا سید علی نقی صفی لکھنوی، اردو شاعری کے اساتذۂ متاخرین میں فردِ فرید، اور استادِ وحید کی حیثیت رکھتے ہیں تھے۔ اُن کا ۱۰۵ اشعار پر مشتمل یہ قصیدہ تمام مشتاقانِ ادب وعرفان کے پڑھنے کی چیز ہے، اور اردو کے عرفانی شعر وادب کا ایک بہترین حصہ ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

پیچ در پیچ ہے شیرازۂ اسباب وعلل
رازِ ہستی ہے عجب عقدۂ مالا ینحل

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِآيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ﴾ (سورۂ آلِ عمران، آیات ۲۱،۲۲)

''جو لوگ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں، اور ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں، اُنہیں دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو، یہ وہ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں اکارت ہو گئے اور ان کے لیے کوئی مددگار نہیں ہے!''

☆☆☆

''امیر المؤمنین''

دعائے افتتاح کے زیرِ غور فقرے میں نامِ نامی کے بعد ''امیر المؤمنین'' کے لقب کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسے یہاں پر نام سے پہلے نہیں لایا گیا ہے، جیسے عام طور پر مسلمانوں کی تاریخ میں بہت سے ناموں سے پہلے یہ لقب اُن کے سیاسی منصب کو ظاہر کرنے کے لیے لکھا جاتا ہے۔ اِس کا سبب یہ ہے کہ حدیث و تاریخ سے خصوصاً روایاتِ اہلبیت علیہم السلام سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ یہ لقب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی حیاتِ طیبہ میں حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کو عطا فرمایا تھا۔ اور تمام لوگوں کو حکم دیا تھا کہ: ''سَلِّمُوْا عَلٰى عَلِيٍّ بِاِمْرَةِ الْمُؤْمِنِيْنَ...'' ''علی پر امیر المؤمنین کہہ کر سلام کرو!''

اصل روایت اصحابِ منتجبینِ رسول؛ بُریدۂ اسلمی اور حذیفۂ یمانی کے اسناد سے حدیث کے متعدد مستند مجموعوں میں موجود ہے۔

''وَوَصِيّ رَسُولِ رَبِّ العَالَمِينَ''

حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ علیہ السلام کی ''وِصایتِ پیغمبر''، صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا موضوع ہے جس پر صدرِ اسلام سے لے کر آج تک کئی اصحابِ علم و ایمان نے مستقل کتابیں تالیف کی ہیں۔

حضرت امیر المؤمنینؑ کے لیے لفظ ''وصی'' صرف اپنے لغوی معنی میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ یہ آپ کا ایک امتیازی لقب ہے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ''مکمل وصی'' تھے، ذاتی حیثیت سے بھی اور منصبی حیثیت سے بھی، ماسوائے نبوت، کہ وہ درِّ یتیم عبداللہ پر ختم تھی۔

جنابِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث صحت کے اُس درجہ پر ہے کہ اِس سے کوئی منکرِ نبوت ہی انکار کرسکتا ہے جسے علامہ ابنِ حجر مکّی نے ''الصواعق المحرقه'' میں اِن الفاظ میں نقل کیا ہے: ''قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَآلِهِ وسلم اَمَا تَرضیٰ اَنْ تَکُونَ مِنِّی بِمَنْزِلَةِ هَارُوْنَ مِنْ مُوْسیٰ غَیْرَ اَنَّهُ لَا نَبِیَّ بَعْدِي''

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: (اے علی) کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ تم مجھ سے اُسی منزلت پر ہو جو منزلت ہاروں کو موسیٰ سے تھی، سوائے اس کے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا!''

خاص لفظ ''وصی'' زبانِ پیغمبرؐ پر دعوت ذوالعشیرہ سے لے کر میدانِ غدیر تک اور روزِ غدیر سے روزِ وفات تک اتنی بار جاری ہوا ہے کہ ان تمام روایتوں کا ذکر و بیان ایک مجلسِ درس میں ممکن نہیں ہے۔ تاہم تبرکاً و تیمناً ایک روایت نقل کرنے کی سعادت ضرور حاصل کرتے ہیں:

امام اہلِ سنت والجماعت احمد بن حنبل نے یہ روایت جنابِ سلمانؓ سے اِن الفاظ میں نقل فرمائی ہے:

''قال رسولُ الله صلی الله علیه و آله وسلم: یا سلمان وَصِيِ وَوارِثي وَمُقضِي دیني و مُنجِزُ وعدِي علي ابن ابي طالب کرم الله وجهه''۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے سلمان میرے وصی، میرے وارث، میرے قرض ادا کرنے والے اور میرے وعدے کو پورا کرنے والے علی ابن ابی طالب ہیں''۔

تاریخ و روایات و ادبِ عربی کے صدرِ اسلام کے اصلی اور بنیادی مُتون کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے لیے لفظ و لقبِ ''وصی'' کا اختصاص اُس زمانہ میں اس قدر مشہور تھا کہ لوگ عموماً آپؑ کو صرف اسی لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ عربی کے معروف ادیب ابوالعباس المبرّدؒ نے الکامل میں حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی شہادت پر عربی کے بعض مراثی نقل کیے ہیں۔ جن میں کمیت اسدی کے بعض اشعار بھی شامل ہیں جن میں لفظِ وصی آیا ہے۔ مبّرد نے اس کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''الوصی، فهذا شیئ کانوا یقولون و یکثرون فیه''

(المبرد، الکامل ج ۳ ص ۲۰۳)

''الوصی یہ وہ بات (لقب) ہے جسے لوگ (امیر المؤمنین علی علیہ السلام کے بارے میں) کہا کرتے تھے اور کثرت سے کہتے تھے''۔

اس کے بعد ابن قیس اور بعض دوسرے شعرا کے کلام سے مبرد نے اس

کے مزید شواہد بھی پیش کیے ہیں۔

حوزۂ علمیہ قم کے استاذِ حکمت و عرفان، فقیہ ذیشان علامہ حسن حسن زادہ آملی نے ایک جگہ لکھا ہے:

این کہ بندہ جناب امیر المؤمنینؑ را بہ لقب وصی نام می برم جہتش این است کہ بہ شہادت مآخذِ روائیِ صحیح وشعرای زمان صدر اسلام و کتاب ہای اصیلِ اسلامیِ ما، حضرت امیر المؤمنینؑ در صدر اسلام بہ وصی شناختہ شدہ بود، من شواہد در این بارہ فراواں دارم۔ در جای از شرح نہج البلاغہ بہ عنوانِ ہدایت و ارشاد بسیاری از مآخذ را کہ ازہمان صدر اسلام کسانی او را بہ لقبِ وصی وصف کردہ اند، ودر اشعار وغیر اشعار نام بردہ اند، جمع آوری کردہ ام۔"

(عباس عزیزی، فضائل وسیرۂ چہاردہ معصومین در آثار استاد علامہ حسن زادۂ آملی ص ۱۶۲، بحوالۂ گفت وگو ص ۱۳۰)

لفظ ولقبِ وصی کے بارے میں بطورِ استشہاد اب صرف ایک روایت نقل کر کے آگے بڑھتے ہیں، یہ روایت اور بھی اہم امور سے متعلق کچھ بہ ایما اور کچھ بہ صراحت بیان کرتی ہے:

جناب ثابت ابن دینار، ابوحمزۂ ثمالی نے امام محمد باقر علیہ السلام کا یہ ارشادِ گرامی نقل کیا ہے:

"ما احد من هذه الأمة جمع القرآن اِلّا وَصِيّ محمد صلی الله علیه و آله وسلم"

(عبدالرزاق حرز الدین، تفسیر ابوحمزۂ ثمالی، ص ۱۰۳، بحوالۂ تفسیر قمی ج ۲ ص ۴۵۱)

"اس امت میں کسی نے قرآن کو جمع نہیں کیا سوائے وصیِ محمد صلی اللہ

وعلیہ وآلہ وسلم کے"۔

میر انیس نے ایک سلام میں اچھا شعر کہا ہے۔

علیؑ کو کہتے ہیں بے فصل جو وصیِ نبی
وہی نکاتِ حدیث و کتاب سمجھے ہیں!

☆☆☆

"عبدک"

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود وصلوٰت کے ضمن میں لفظ 'عبدک' آیا ہے اور یہاں وصیِ نبی علیہما الصلوٰۃ والسلام پر درود وصلوٰۃ کے فقرے میں بھی یہ لفظ موجود ہے۔ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں اور کیسے بندے ہیں اس کا اندازہ اس مشہور واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ جنگِ احد میں آپ کے بدنِ مبارک میں تیر پیوست ہو گیا جس میں اس قدر تکلیف تھی کہ اس کا نکالنا دشوار ہو رہا تھا، یہ صورتِ حال جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کی گئی تو آپؐ نے فرمایا جب علیؑ نماز میں مشغول ہوں تو تیر ان کے بدن سے نکال لینا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حالت نماز میں آپؑ کے بدنِ مبارک سے تیر نکال لیا گیا اور آپ کو اس وقت ذرا بھی احساس نہ ہوا"

اِس واقعہ کو مُفسّرِ عظیم الشان مُلّا فتح اللہ کاشانی نے تفسیر منہج الصادقین میں، سورۂ مبارکۂ مؤمنون کی آیت ﴿والّذِينَ هُم فِي صلوٰتِهِم خاشِعُونَ﴾ کی تفسیر میں معتبر اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔

شاعر معرفت حکیم سنائی غزنوی اور ملّا جامی وغیرہ نے اِسے نظم کیا ہے۔

جامی کے اشعار علامۂ بہائی نے کشکول میں بھی نقل کیے ہیں۔

آپؑ کی کثرتِ عبادت پر حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کا ارشاد روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے کہ:

''مَنْ یَقْدِرُ عَلٰی عِبَادَۃِ عَلِیِّ بْنِ اَبِي طَالِب''

''علی بن ابی طالب کے اتنی عبادت کون کرسکتا ہے؟''

ربِّ کریم نے قرآن مجید میں اپنی محبت اور بندگی کی شرط اپنے محبوب پیغمبرؐ کی اطاعت کو قرار دیا ہے:

''قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِي یُحْبِبْکُمُ اللّٰہ''

(سورۂ آل عمران، آیت ۳۱)

''(اے رسول کہیے) اگر تم اللہ سے مُحبّت کرتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا!''

حضرت امیر المؤمنینؑ نے محبتِ خدا اور پیرویِ رسولِ خدا کا کتنا حق ادا کیا، یہ بتا سکنا کسی کے لیے آسان نہیں ہے۔ ہمارے سامنے دو اقوال ہیں انہیں سے کوئی نتیجہ برآمد کیا جاسکتا ہے۔ ایک خود حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے:

''اَنَا عَبْدٌ مِنْ عَبِیدِ مُحَمَّدٍ''

''میں تو محمد کے غلاموں میں سے ایک غلام ہوں''

اور ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جو آپ نے غزوۂ خیبر میں فرمایا ہے:

''لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَداً رَجُلاً کَرَّاراً غَیْرَ فَرَّارٍ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ''

''میں کل پرچم ایسے بہادر کو دوں گا جو بڑھ کر حملہ کرنے والا ہے، بھاگنے

والا نہیں ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اُس سے محبت کرتے ہیں''۔

''وَلِیُّکَ''

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی ولایت بجائے خود بے انتہا وسیع موضوع ہے۔ وہ اللہ کے ولی ہیں! اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے مؤمنین و مسلمین کے ولی ہیں۔ آپؑ کی ولایت کے تشریعی اور تکوینی ابعاد پر کلام و عرفان کی کتابوں میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جاتا رہے گا۔ اہلِ تصوف الگ اس عنوان سے اپنے مطالب بیان کرتے ہیں، اور اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ مشہور ہے کہ تصوفِ اسلامی کے تمام یا بیشتر سلسلے حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام ہی کی ذات مبارک تک پہنچتے ہیں۔

ولایتِ مولا علی مرتضیٰ علیہ السلام کے باب میں اساسِ حق وحقیقت ربّ کریم کا یہ قولِ محکم ہے جو سورۂ مائدہ میں ''آیۂ ولایت'' کی شکل میں موجود ہے:

''اِنَّمَا وَلِیُّکُمُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلاۃَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّکَاۃَ وَھُمْ رَاکِعُوْن'' (سورۂ مائدہ ۵۵)

''تمہارا ''ولی'' (حاکم و سرپرست) بس اللہ ہے اور اس کا پیغمبرؐ اور وہ ایمان رکھنے والے جو نماز ادا کرتے ہیں اور خیرات دیتے ہیں اس حالت میں کہ وہ رکوع میں ہیں''

اس آیت کے الفاظ اور اس کی شانِ نزول کی روشنی کے پرتو میں علماء نے جس قدر مطالب بیان کیے ہیں اور جتنے احکام و نکات کا اس آیت سے استفادہ کیا ہے اُس کا احاطہ یہاں ممکن نہیں ہے خود اس ناچیز نے دس تقریریں صرف اسی آیت

کے ذیل میں کی ہیں جو علیحدہ کتابی شکل میں ترتیب دی گئی ہیں۔

اس آیت کے علاوہ، حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی ولایت کے باب میں حدیث غدیر کو بھلا کون فراموش کرسکتا ہے جس کا یہ فقرہ "مَنْ کُنتُ مَوْلَاہُ فَھٰذا علی مولاہ" تاریخ حدیث میں بے نظیر تواتر کے ساتھ نقل ہوتا آیا ہے اور جس کے بارے میں صدیق مرحوم مولانا ادیب الہندی صاحب نے اپنی کتاب الامام میں حضرت شاہ حسن جائسیؒ کا یہ شعر نقل فرمایا ہے

عبث در معنیِ من کُنتُ مولا می روی ہرسو
علی مولا بہ این معنیٰ کہ پیغمبرؐ بود مولا (الامام ص ۳۲)

☆☆☆

محقق دیلمیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث بھی جدا گانہ نقل فرمائی ہے:

"قال رسول الله صلى الله عليه وآله وسلم: (اِنَّ عَلِیّاً وَلِیُّکم بَعْدِی).

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بے شک میرے بعد علی تمہارے ولی ہیں!"

اگر اس حدیث میں "وَلی" کے معنی صرف دوست لیے جائیں تو میرے بعد کی قید کے کیا معنی ہوں گے؟ ظاہر ہے کہ یہاں حکومت و سرپرستی ہی مراد ہے جو کہ حینِ حیاتِ پیغمبرؐ کسی اور کے لیے ممکن نہ تھی اور آپؐ کے بعد ہی اِس ولایت کی منتقلی کوئی معنیٰ رکھتی ہے!

☆☆☆

"وَحُجَّتِکَ عَلٰی خَلْقِکَ"

اس میں کیا شک ہے کہ علی علیہ السلام حُجتِ خدا ہیں۔

دیلمی اور خطیب بغدادی کے حوالے سے مولانا ادیب الہندی مرحوم نے الامام میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"انا وَعَلِیٌّ حُجّة اللهِ علیٰ عبادِہٖ" (الامام ص ۳۲)

"میں اور علی اللہ کی حجت ہیں اُس کے بندوں پر!"

اللہ کے نبی اور اس کے ولی اس کی "آیت" بھی ہوتے ہیں اور حجت بھی، آیت کے معنی نشانی کے ہیں اُس میں بھی دلالت پائی جاتی ہے اور حُجت کے معنی بھی دلیل و برہان اور مستحکم استدلال کے ہیں! اردو میں "تو حُجت کرنا" تکرار کرنا اور جھگڑنے کے معنیٰ میں بولتے ہیں، جب دو آدمی حجت کر رہے ہوں تو وہ بات جو ان میں سے واقعاً حق پر ہونے والے کی حقانیت کو ثابت کرے اصلی حجت تو وہ ہوتی ہے! جو اپنے صفات سے اپنے افعال سے اور اپنے اقوال سے اللہ کے منکروں کا مُنہ بند کردیں ان کے ہوتے ہوئے کوئی اللہ کا انکار نہیں کرسکتا! جب تک اس دنیا میں جیتے ہیں ان کی ایک ایک سانس اللہ کے وجود پر "شہادت" دیتی ہے! اور جب اللہ کا انکار بڑھتا ہے تو یہ اپنی جان دے کر اُس کے وجود پر گواہ بن جاتے ہیں!

☆☆☆

"واَخِیْ رَسُوْلِکَ!"

حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ امیر المؤمنین علیہ السلام کی اُخوت، ابنِ عم ہونے کی حیثیت سے تو مسلم ہے ہی! یہاں یا دوسرے بہت سے مواقع پر اس خصوصی تذکرے کا سبب کچھ اور ہے۔

عربی کی ایک مثل ہے ''رُبَّ اَخٍ لَمْ تَلِدْہُ والدہ '' [1] ایسے بھائی بھی ہوتے ہیں جو ماں جائے نہیں ہوتے! یہ مثل ایسے سچے دوست کے لیے بولی جاتی ہے جو حقیقی بھائی ہی کی طرح یا اُس سے بھی زیادہ شفیق ہوتا ہے۔ اسی طرح کی ایک مثل اور ہے: ''اِنَّ اَخَاکَ مَنْ آسَاکَ '' حقیقت تو یہ ہے کہ تیرا بھائی وہ ہے جس سے تیری آس بندھی رہے، جو تیرا آسرا بنا رہا ہے!

معلوم ہے کہ دنیا میں کتنے ہی بھائی ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے لیے کسی ادیب کا یہ طنزیہ فقرہ صادق آتا ہے کہ بھائی تو مادرزاد دشمن ہوتے ہیں' پھر بھی ''بھائی کا رشتہ'' بجائے خود اپنی خالص شکل میں اپنی اہمیت اور تاثیر رکھتا ہے۔ اس کی اچھی بری مثالوں کے بارے میں، مختلف زبانوں میں بہت سے ضرب الامثال رائج ہیں۔ تاہم اِس رشتہ کی جو اہمیت دینی ثقافت، بالخصوص اسلامی تہذیب اور اس کے اثر سے مشرقی طرزِ معاشرت میں ہے وہ اہمیت اس کے علاوہ دوسری تہذیبوں خصوصاً مغربی تہذیت میں نظر نہیں آتی۔

مشرقی طرزِ معاشرت میں یہ ایک عام بات ہے کہ لوگ ''بھائی کا رشتہ'' کہہ کر بھی قائم کرتے ہیں۔ ان کا یہ عمل دراصل بے لوث محبت اور خلوص کا انسانیت نواز مظہر ہوتا ہے۔

حقیقی بھائیوں میں تفرقہ کا حال تو حضرتِ آدم کے بیٹوں ہابیل وقابیل کے زمانے سے معلوم ہے لیکن دو اجنبی افراد میں ''عقدِ مواخاۃ'' (یا بھائی بنانے کی

[1] کشکول بہائی کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضرب المثل حضرت سبطِ اکبر امام حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام کے ارشاداتِ مبارکہ سے مأخوذ ہے۔ آپؑ فرمایا کرتے تھے: ''کم من اخٍ لمْ تلِدْہُ اُمکَ''۔

(بہائی، کشکول، نسخۂ محمد مہدی خرسان ج۱ ص۴۵ ط: نجف اشرف ۱۹۷۳ء۔)

رسم) سب سے پہلے کس نے قائم کی اِس کا مطالعہ سماجیاتی نقطۂ نظر سے تاریخ انسانی کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک دلچسپ عنوانِ تحقیق ضرور ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنس ومحبت اور اخوت کی رشتہ سازی کے اِس خصوصی انسانی مظہر کو تاریخ تمدُّنِ انسانی میں انتہائی عظیم الشان تہذیبی، ثقافتی، معاشرتی اور سیاسی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اور اسی اخوت سازی کے ذریعہ ایک نئے پرامن وپرخلوص تمدُّن کی بنیاد رکھی۔

کتبِ تاریخ وحدیث میں یہ واقعہ بہ تواتر نقل کیا گیا ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو مرتبہ ''تقریبِ اخوت'' منعقد فرمائی۔ ایک مرتبہ مکۂ مکرمہ میں اور ایک مرتبہ مدینۂ منورہ میں۔ اس کی تفصیل متعلقہ مصادر میں موجود ہے۔ یہاں پر جو بات قابلِ ذکر ہے وہ یہ کہ دونوں مرتبہ آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا بھائی بنایا۔ استیعاب (ج۲ ص۴۷۳) میں ابنِ عبدالبر کے الفاظ یہ ہیں:

''آخىٰ رَسُولُ اللّٰهِ بين المهاجرِينَ ثُمَّ آخىٰ بَيْنَ المُهَاجِرِيْنَ والانصارِ وقَالَ فِي كُلِّ وَاحِدٍ منهُمَا لِعَلِيٍّ انتَ اخِي فِي الدُّنياَ والآخِرة''

''رسول اللہؐ نے مہاجرین کے درمیان بھائیوں کا رشتہ قائم کیا پھر مہاجرین اور انصار کے درمیان بھائیوں کا رشتہ قائم کیا اور دونوں مرتبہ حضرت علیؑ سے فرمایا تم میرے بھائی ہو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی''۔

''یاعلی انتَ اَخِي فِي الدُّنيا و الآخرة '' کا فقرہ صحیح ترمذی (ج۲ ص

۱۲۳) میں بھی ہے۔ اور اس رشتہ پر حضرت علی علیہ السلام کا خود فخر و مباہات فرمانا بھی تاریخوں میں درج ہے۔ مثلاً تاریخ ابو الفداء (ج ا ص ۱۲۷) میں ہے کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

''اَنَا عبدُ اللہِ وَ اَخُو رسُولِ اللّٰہِ'' ''میں اللہ کا بندہ ہوں اور اللہ کے رسول کا بھائی ہوں!''

ایک پہلو اور بے حد غور طلب ہے۔ دُعائے افتتاح کے اس فقرے ''واَخِي رَسُولِکَ'' میں بھی اضافت رسول اللہ کی جانب ہے! علی ابن ابی طالب، محمد بن عبداللہ کے بھائی تو ہیں ہی۔ یہاں ''اللہ کے رسول سے بحیثیت رسول کے بھائی کے رشتہ کا اعلان ہے اِس اضافت و نسبت ہی میں تو شرف پوشیدہ ہے اسی لیے میں نے عرض کیا ہے کہ ''اخی رسولک'' کی تعبیر حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی شخصیت کے تمام نَسبی و نَسبی فضائل و مناقب کا حسین ترین کنایہ ہے!

☆☆☆☆☆

(۲۲)

خنکیِ چشمِ رحمت

''...وَصَلِّ عَلَىٰ الصِّدِّيقَةِ الطَّاهِرَةِ فَاطِمَةَ الزَّهْرَآءِ سَيِّدَةِ نِسَاءِ الْعَالَمِين''

...اور رحمت فرما ''صدیقۂ طاہرہ'' فاطمہ (سلام اللہ علیہا) پر جو تمام جہانوں کی خواتین کی سردار ہیں!

اِس جُملے کا ہر لفظ بہت واضح بھی ہے اور بے انتہا غامض بھی!

صداقت اور صدیقہ کے الفاظ اپنے ظاہری معانی کے لحاظ سے بہت سامنے کے الفاظ ہیں، لیکن، بنتِ رسول سیدۂ کونین سلام اللہ علیہا کی شانِ صداقت اور آپ کے لقبِ صدیقہ سے ملقب ہونے کے اسرار کی مکمل شرح نہ آسان ہے اور نہ ہر کس و ناکس کے لیے قابلِ فہم و تحمّل!

یہی صورت لفظِ طاہرہ کی ہے۔ اِس لفظ میں کوئی غرابت نہیں ہے۔ لیکن خنکیِ چشمِ رحمت سلام اللہ علیہا کی نسبت سے کہ جو خود بھی گوہرِ عصمت ہیں اور صدفِ صد گوہرِ عصمت بھی، اس لقب کی معنویت بہ آسانی قابلِ درک نہیں ہے۔ صرف آپؑ کے نامِ نامی فاطمہؑ کے معانی کی تفسیر میں جو روایتیں وارد ہوئی ہیں، اُن میں سے ہر روایت اپنی جگہ پر ایک گنجینۂ اسرار ہے، اسی لیے جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے ایک سوانح نگار علامہ آیۃ اللہ سید محمد کاظم قزوینیؒ نے اپنی کتاب ''فاطمہ من المہد الی اللحد'' کا آغاز قرآنی اسلوبِ بلاغت سے استفادہ کرتے ہوئے اس جملے سے کیا ہے:

فاطمہ وَمَا ادراکَ فَاطِمہ!

(فاطمہ: اور تم کیا سمجھو کہ فاطمہ کون ہیں!!)

حقیقت یہ ہے کہ جناب زہرا سلام اللہ علیہا کے مرتبہ کا عرفان حاصل کرنا آسان نہیں ہے لیکن یہ ایک حد تک ضروری بھی ہے، اسی لیے خود بی بیؑ نے اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا:

اِعْلَمُوا اَنّی فَاطِمَه! (جان لو کہ میں فاطمہ ہوں!)

معلوم ہے کہ بی بی کی عمرِ مبارک بے حد مختصر تھی، لیکن آپ کی عملی سیرت کے دیرپا اثرات اس قدر زیادہ ہیں کہ قابلِ قیاس نہیں ہیں!

متعدد علماء نے ذکر کیا ہے کہ فخرِ رازی، جنہوں نے مبدأ سے معاد تک ہر ہر مسئلے میں تشکیک اور اعتراض پیدا کرنے میں ایسی ضرب المثل شہرت پائی کہ لوگ انہیں ''امام المشککین'' کے لقب سے نوازتے ہیں، لیکن وہ سیدۂ کونین حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ''عصمت'' کے بارے میں سر بسر تسلیم نظر آتے ہیں کہ ''آنجناب بلا مُدافع معصوم بودہ است و در عصمت و طہارتش جای شک و تردید نیست!''

(حسن زادہ آملی، ہزار و یک نکتہ، نکتہ ۷۴۸ ص ۶۰۳)

تاریخی لحاظ سے آپؑ کی حیاتِ طیبہ کے خط وخال، حسبِ عادت وروایتِ مؤرخین، اختلافِ بیانات سے بظاہر اُلجھے ہوئے سے لگتے ہیں۔ مثلاً آپ کی تاریخِ ولادت، تاریخِ شہادت اور نتیجۃً مدتِ عمرِ ظاہری میں بہت گفتگو کی گنجائش ہے! لیکن جن باتوں میں تاریخی لحاظ سے کسی اختلاف کی گنجائش نہیں وہی اتنی اور ایسی ہیں کہ جن سے دلوں اور دماغوں میں آپؑ کی اہمیت وعظمت کا ایک درخشاں اور ناقابلِ تشکیک تصور قائم ہو جاتا ہے۔

- آپ کا نامِ نامی فاطمہ تھا!
- آپؑ کے والد حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے!
- آپؑ کی والدۂ ماجدہ ملیکۃُ العرب، حبیبۃُ الرسول، اُمُّ المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؑ تھیں!
- آپؑ کی شادی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ سلم نے بہ امرِ الٰہی حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے ساتھ فرمائی!
- حضرتِ ربُّ العزت نے آپؑ کو حسنؑ اور حسینؑ جیسے فرزند عطا فرمائے

جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''جوانانِ جنت کے سرداروں کی حیثیت سے پہچنوایا!

● آپؑ نے تمام مُہِمّاتِ رسالت میں اپنی عظمت وحیثیت کے مطابق حصہ لیا، جنگِ اُحُد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر گیری اور آپؐ کی مدد و موانست کا تذکرہ تاریخوں میں نسبتاً زیادہ مشہور ہے، ورنہ واقعات اور بھی ہیں، لیکن سب سے بڑا واقعہ جس میں جناب سیّدہ سلام اللہ علیہا کا وجود اور آپؑ کے وجود مبارک کا تابناک اثر ظاہر ہوا ''واقعۂ مباہلہ'' ہے جس کا تذکرہ قرآنِ مجید کی آیتِ مباہلہ (سورۂ آلِ عمران آیت ۶۱) میں بھی موجود ہے![1]

● جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دارِ بقا میں قیام اختیار فرمایا تو آنحضرتؐ نے اس دارِ دنیا میں سوائے حضرت فاطمہؑ کے اور کوئی یادگار نہیں چھوڑی تھی!

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرزندانِ فاطمہؑ حضرات حسنین علیہما السلام کو اپنا فرزند قرار دیا اور آپؐ کی نسلِ مبارک انہیں سے باقی رہی! اسی لحاظ سے جناب فاطمہؑ کو ''مصداقِ کوثر'' کہا جاتا ہے!

● رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیاتِ مبارکہ ہی میں (۷ھ) آپؑ کو ''فدک'' عطا فرمادیا تھا جو ۷ھ سے وفاتِ پیغمبرؐ ۱۱ھ تک حضرت سیدہؑ ہی کے قبضہ اور تصرف میں رہا۔

● بعد وفاتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے والوں نے ''فدک'' غصب کرلیا تو حضرت سیّدہ سلام اللہ علیہا نے باقاعدہ احتجاج فرمایا۔

● قضیۂ فدک میں جب حضرت سیدہ سلام اللہ سے کہا گیا کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے: ''نَحنُ معاشرُ الانبیاءِ لا نورِثُ ما

[1] واقعۂ مباہلہ میں حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی شرکت سے متعلق حضرت اعلم العلماء مولانا سید سبطِ حسین صاحب قبلہ مرحوم نے اپنے ایک قصیدہ میں ارشاد فرمایا ہے:

شرف جہاد کا مخصوص گر علیؑ سے تھا — مباہلے میں علیؑ سے بڑھی رہیں زہراؑ
اس امتحاں میں خدا کے ولی سے آگے تھیں — رسولِ پاک کے پیچھے علیؑ سے آگے تھیں

تَرَكْنَاهُ صَدَقَه ''تو آپؑ نے قرآنِ مجید کی آیتوں سے استدلال فرما کر اس ''حدیث'' کا جعلی ہونا ثابت کیا، اور اپنے اس اقدام سے قرآن اور حدیثِ رسولؐ کی معنوی، علمی اور حُکمی وحدت کے ساتھ ''درایتِ حدیث'' کی بنیاد رکھی اور ''معیارِ صدقِ حدیثِ رسول'' کی وضاحت فرمائی۔ آپؑ کے لقبِ ''صدیقہ'' کے اسرار میں سے ایک بڑا ''سِرّ'' اسی واقعہ میں مضمر ہے!

● بی بی سلام اللہ علیہا نے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زمامِ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے والوں کی بیعت نہیں فرمائی۔ یہ ایسا واقعہ ہے جو صرف ایک سادہ سی تاریخی حقیقت نہیں بلکہ ''حدیثِ متواتر'':

''مَن ماتَ وَلَم يَعرِفْ اِمَامَ زَمانِه مَاتَ مِيتَةً جَاهِلِيَّةً'' کی روشنی میں یہ واقعہ دوسرے بہت سے نہایت پیچیدہ تاریخی واقعات اور بڑے کلامی مسائل کے ''حل'' و ''فتح'' کی کلید ہے!

● آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا نے صرف ۷۵ روز ہی اِس دُنیا میں گزارے، اپنی وفات تک مسلسل رحلتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غم میں نوحہ گر و نالہ کناں رہیں۔

ناہنجار و نابکار طالبانِ دنیا سے جو کچھ رنج آپؑ کو پہونچے اور جو مصیبتیں آپ پر پڑیں اُن کی دلخراش داستان الگ ہے۔ اور اس پر جو مسلمان آج تک طرح طرح کی تاویلیں کرتے ہیں اُس کی افسوس ناک بحثیں الگ ہیں۔ ہم اپنے قلم پر صبر و ضبط کا پہرہ بٹھا کر صرف اردو کے مشہور معروف ادیب مترجم قرآن شمس العلماء ڈپٹی نذیر احمد کے الفاظ نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں:

''سخت افسوس ہے کہ اہلبیتِ نبوی کو پیغمبرؐ کی وفات کے بعد ہی ایسے ناملائم اتفاق پیش آئے کہ ان کا وہ ادب ولحاظ جو ہونا چاہیے تھا، اس میں ضعف آگیا اور شدہ شدہ منجر ہوا اس ناقابلِ برداشت واقعۂ کربلا کی طرف جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ یہ ایسی نالائق حرکت مسلمانوں سے ہوئی ہے کہ اگر سچ پوچھو تو دنیا میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔''

چہ خوش فرمود شخصے ایں لطیفہ
کہ کشتہ شد حسین اندر سقیفہ"

● آپؑ کی شہادت ایک معتبر روایت کے مطابق ۳؍ جمادی الثانیہ ۱۱ھ ہجری کو ہوئی۔ اور اس امر پر تمام مستند تاریخ نویسوں، راویوں اور محدثوں کا اتفاق ہے کہ آپؑ کی تدفین پردۂ شب میں ہوئی۔ تاریخوں میں یہ بھی ہے کہ آپؑ کا نشانِ قبر بھی ظاہر نہ رکھا گیا تھا۔ اِن تمام حقائق کی تفصیل اور ان کے اسباب کا بیان اس وقت مقصود نہیں ہے۔ لیکن طالبانِ حقیقت کے لیے ابوابِ علم ضرور کھلے ہوئے ہیں۔ شعورِ تاریخ اور روحِ انسانیت کا نالہ بلند ہے۔

"وَلِاَیِّ الأمُـورِ تُـدفَـنُ لَیلاً
بـضعة الـمُصْطفیٰ وَیُعفیٰ ثراھا"

(ہائے آخر کن باتوں سے دل و جانِ مصطفیٰ پردۂ شب میں دفن کی گئی اور اس کا نشانِ قبر مٹا دیا گیا!)

● حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کے معنوی کمالات، مراتبِ فضل و شرف، مناقب، فیوضات، کرامات اور معجزات کا احصا کسی بھی طرح ممکن نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آپؑ کی تعظیم کے لیے اٹھنا اور اپنی جگہ پر بٹھانا صحیح ترمذی میں مذکور ہے۔ آپ کو "اُمِّ اَبیھا" کی کنیت سے مکنّیٰ فرمانا بھی استیعاب ابن عبد البر اور دوسری بہت سی مستند کتابوں میں موجود ہے۔

آپ کے حق میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد صحیح بخاری کے صفحات پر مرقوم ہے کہ:

"فَاطِمَۃُ بِضْعَۃٌ مِنّی فَمَنْ اَغْضَبَہَا فَقَدْ اَغْضَبَنِيْ"

"فاطمہ میرا جز ہے جس نے اُسے غضبناک کیا بس اس نے مجھے غضبناک کیا!"

سلام اللہ علیہا وعلی ابیہا وَ بَعْلِہَا وَ بَنِیہَا
وَ عِترَتِہَا و ذُرِّیّتِہَا سلاماً کثیراً۔

☆☆☆☆☆

(۲۳)

سبطینِ رحمت

"وَصَلِّ عَلٰی سِبْطَیِ الرَّحْمَۃِ وَ اِمَامَیِ الْھُدٰی الْحَسَنِ وَالْحُسَیْنِ سَیِّدَیْ شَبَابِ أَھْلِ الْجَنَّۃِ"

... اور رحمت فرما

سبطینِ رحمت

اور رہنمایانِ ہدایت،

جوانانِ اہلِ جنت کے سرداروں حسن اور حسین پر! (علیہما الصلاۃ والسلام)۔

حضرتِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت ولیِ حق وَصِیِ بَرحق علیِ مرتضیٰ علیہ السلام اور حضرتِ سیدۂ کونین فاطمۃ الزہراء سلام اللہ علیہا کے بعد حضراتِ حسنین علیہما السلام پر درود وسلام اور اس کے بعد اہلبیتِ پیغمبر صلوٰت اللہ وسلامہ علیہ و علیہم اجمعین سے ہونے والے ائمۂ دین اور اولیائے معصومین پر بہ تفصیل یعنی نام بہ نام درود وسلام اِس دعائے مبارکہ کے خصوصیات میں سے ہے۔ اور یہ ربّ کریم کے ارشاد وعمل اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان وفعل کی پیروی ہے۔

پروردگار نے قرآن مجید میں حضرت رسولؐ اور آلِ رسولؐ پر درود وسلام بھیجا ہے۔ سورۂ مبارکۂ احزاب کی آیتِ صلوٰت وتسلیم کا ذکر پہلے آچکا ہے یہاں پر سورۂ صافات کی اس آیت کی طرف متوجہ کرنے کا مقام ہے:

﴿سَلَامٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْن﴾

ائمۂ اہلبیت علیہم السلام سے اور بعض صحابہ سے مروی روایاتِ تفسیر میں اس آیت میں آلِ یٰسین (یعنی آلِ محمدؐ) ہی پر سلام نازل ہُوا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی صلوٰت بھیجنے کا طریقہ تعلیم

فرمایا ہے جیسا کہ مشہور حدیث میں آیا ہے اور علامۂ ابن حجر مکیؒ نے اس کے یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

"لَا تُصَلُّوْا عَلَیَّ الصَّلَاۃَ الْبَتْرَاءَ"

"مجھ پر ناتمام صلوٰۃ نہ بھیجا کرو"

جب آپؐ سے دریافت کیا گیا کہ کس طرح صلوٰۃ بھیجنا چاہیے تو آپؐ نے صلوٰۃ میں اپنے اہلبیت کی شمولیت کی تاکید فرمائی۔ یہ تمام مباحث مشہور ہیں اور تقریباً تمام مسلمان اس پر متفق بھی ہیں اور عمل پیرا بھی۔ فخر الدین الرازی نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اُن کے اہلبیت پانچ باتوں میں شریک قرار دیے گئے ہیں۔ تشہدِ نماز کے صلوٰۃ اور سلام میں، طہارت میں، صدقہ کی حرمت میں، اور محبت میں! اُن کے اصل الفاظ رسالۂ صبّان میں (حاشیۂ کتاب نور الابصار شبلنجی پر) اس طرح نقل کیے گئے ہیں:

"وذکر الفخر الرازی أن أھل بیتہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ساووہ فی خمسۃ أشیاء فی الصلاۃ علیہ و علیھم فی التشھد و فی السلام یقال فی التشھد... و فی الطھارۃ ... وفی تحریم الصدقۃ و المحبۃ"

ظاہر ہے یہ فخر الدین رازی کا بیان ہے، اُن کو یہی پانچ باتیں مشترک نظر آئیں، ورنہ مقامِ ختم نبوت اور خصوصیات نبوت کے علاوہ کونسی بات ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اُن کے اوصیائے ابرار اور ائمۂ اطہار تک نہ پہنچی ہو!

دعائے افتتاح کے اس فقرے میں کس قدر حسین اور معنی خیز ترکیبیں آئی ہیں، مثلاً ''سِبْطَيِ الرَّحْمَةِ'' ! ''سبطینِ رحمت'' کس قدر فکر انگیز ترکیب ہے۔ سبط کے معنی نواسے کے ہوتے ہیں۔ بے شک حسنین علیہما السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے تھے، لیکن یہاں پر آنحضرتؐ کے نامِ نامی کے بجائے صرف لفظِ رحمت ہے گویا اسی فقرے میں حضورؐ کی نعتِ مبارک کا بحرِ بے کراں بھی موج زن ہے کہ آپ کو عینِ رحمت کہا گیا ہے۔ حضرت رحمت للعلمینؐ کے لیے بغیر کسی قید و اضافت کے پورے عموم اور اطلاق کے ساتھ ''الرحمۃ'' کا استعمال جیسا کہ اس فقرے میں ہوا ہے اور برحق ہوا ہے، ''با شاید ہی کہیں اور ہوا ہو۔ آپؐ کی شانِ رحمت کے جتنے بھی قصیدے کہے گئے ہیں وہ اِس فقرے پر قربان کیے جاسکتے ہیں۔

لفظ ''سبط'' بھی ذرا اور غور طلب ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں بھی آیا ہے۔ اَسباط بنی اسرائیل کے ذکر میں، اور حدیث نبویؐ میں خصوصیت کے ساتھ امام حسین علیہ السلام کے لیے آیا ہے ''حُسَيْنٌ سِبْطٌ مِنَ الْاَسْبَاطِ'' اور امام سجادؑ علیہ السلام کے خطبۂ دمشق میں آیا ہے ''وَمِنَّا سِبْطَا هٰذِهِ الْاُمَّةِ'' یہ اور اسی طرح کے اور دینی، تاریخی اور ادبی مصادر میں لفظ ''سبط'' کا استعمال بے حد فکر انگیز ہے کہ یہ لفظ ہر نواسے کے لیے اس طرح استعمال نہیں ہوتا، بلکہ ایسے نواسوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو بجائے خود ایک ''امت'' ہوتے ہیں! اور تمام اُمتوں اور امتیوں کے لیے اسوۂ کامل اور قائدِ منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اسی طرح ''اِمَامَيِ الْهُدٰى'' ''ہدایت کے دونوں اماموں'' کی ترکیب کس قدر حسین اور پُرمعنی ہے۔ مجھے تو اس ترکیب و تعبیر پر ہمیشہ اردو کی ایک مختصر

جدید منقبتی نظم یا جدید سلام کے یہ مصرعے یاد آجاتے ہیں:

''ہدایت ان سے پاتی ہے ہدایت یہ محمد ہیں!
یہ حیدر ہیں
یہ زہرا ہیں
یہ شبّر ہیں، یہی سبطِ مُعظّم ہیں،
یہ سردارِ شہیداں یعنی شبیر مکرّم ہیں،
یہی سبطینِ رحمت ہیں!
ہدایت ان سے پاتی ہے ہدایت یہ محمدؐ ہیں
ہدایت ان سے چھٹ کر پھر ہدایت رہ نہیں جاتی
سیاست ہو، سفاہت ہو، سخافت ہو، شقاوت ہو،
وہ کچھ بھی ہو،
جدا ہو کر محمدؐ سے ہدایت رہ نہیں جاتی،
ہدایت صرف وہ ہے جس کا رشتہ ہو پیمبرؐ سے!
علیؑ سے!
فاطمہؑ سے
اور سبطینِ پیمبرؐ سے!''

حضرات حسنین علیہما السلام کی شان میں یہ حدیثِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعتبار و صحت اور شہرت کے لحاظ سے تمام ذخیرۂ حدیث میں بجائے خود منفرد اور امتیازی شان رکھتی ہے۔

"الحَسنُ و الحُسَینُ سیِّدا شَبابِ اھلِ الجَنَّة"

حسن اور حسین جوانانِ جنت کے سردار ہیں!

علمائے جمہور میں سے ''اس کی تخریج احمد بن حنبلؒ نے مرفوعاً ابوسعید خدری سے کی ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔ ابن حبان اور حاکم نے تصحیح کی ہے۔''

یہ اندراج ''امام عبدالرحمن الشیبانی الاثری'' صاحبِ ''تمیز الطیب من الخبیث فیما یدور علی السنۃ الناس من الحدیث'' کا ہے۔

اس عاجز وقاصر کا خیال ہے کہ صرف اِس حدیث کے مختلف سلسلوں اور راویوں کا شمار کیا جائے تو ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے بلکہ تعجب نہیں کہ اس عنوان پر کوئی کتاب یا کئی کتابیں تألیف ہو بھی چکی ہوں۔ میں نے اس وقت فہارس کتب پر خاص اس عنوان کے تحت نظر نہیں ڈالی ہے۔

سَنَدِ حدیث سے قطع نظر مَتن کے الفاظ میں سیّد شباب اور اہل کے کلمات خاص طور پر غور طلب ہیں جو معانی و مطالب اور فضائل و مناقب کے گنجینے ہیں۔ اور اس قدر متن میں جو اوپر درج کیا گیا ہے کوئی ذرا سا بھی اختلاف نہیں ہے! بہ تواتر یہی الفاظ نقل ہوتے چلے آئے ہیں۔

"الحَسنُ و الحُسَینُ سیِّدا شَبابِ اھلِ الجَنَّة"

☆☆☆

اگر اور کوئی ارشادِ نبویؐ یا دلیلِ خاص حضراتِ حسنین علیہما السلام کی امامت کے بارے میں نہ پائی جاتی تو بھی صرف یہی حدیث شریف اِن کی امامت کے

اثبات کے لیے کافی تھی اس لیے کہ ''سیادت'' سرداری، سربراہی یا ''امامت'' ہی کو تو کہتے ہیں، اور جو اہلِ جنت کے امام ہوں وہ بدرجۂ اَولیٰ اہلِ دنیا کے بھی امام ہوں گے۔ تاہم اس کے علاوہ بھی اِن کی امامتوں پر اتنی دلیلیں موجود ہیں جن کے احصا کے لیے جُداگانہ کتاب تحریر کرنے کی ضرورت ہوگی اس مقام پر یہ ایک حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور سماعت فرماتے جایئے جو غایت درجہ معتبر اسناد کے ساتھ نقل ہوتی آئی ہے:

"الحسن و الحسین امامانِ قاما أو قعدا"

''حسن اور حسین دونوں امام ہیں چاہے وہ کھڑے ہوں چاہے بیٹھیں''

یہ عجب ارشادِ پیغمبرؐ ہے جس کے الفاظ ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِن دونوں نواسوں کی بلا اِستثناء مکمل زندگی کا احاطہ کر رہے ہیں اور ان کے ہر ہر اقدام وعمل کو عین ہدایت و حجّت قرار دے رہے ہیں اور دوسری طرف دونوں حضرات کی زندگیوں کے خاص واقعات کی طرف بھی بطور تلمیح اشارہ کر رہے ہیں۔ قیام یا کھڑا ہونا ہماری زبان اور اکثر زبانوں میں کسی بڑے اقدام، کسی تحریک کے آغاز یا کسی انقلاب کے برپا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اسی طرح قُعُود یا بیٹھ جانا، بیٹھ رہنا کسی اقدام سے باز رہنے یا ماحول جنگ میں صلح کر لینے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس حدیث میں امام حسین علیہ السلام کے قیامِ عاشورا اور امام حسن علیہ السلام کی صُلح کی طرف واضح اشارہ موجود ہے کہ یہ دونوں بہ ہر حال امام ہیں، چاہے ان میں سے کوئی جہاد کرے چاہے صلح! نہ جہاد کرنے سے امامت ختم ہو جائے گی، نہ

صلح کر لینے سے امامت ساقط ہو جائے گی۔ یہ صلح کر کے بیٹھے رہیں گے تب بھی "امامِ ہدیٰ" ہی رہیں گے۔ دین کے اصول و فروع، آداب و اخلاق و شریعتِ الٰہی، سیر و سلوک الی اللہ کی طریقت اور حق و حقیقت غرض تمام معارف انہیں سے ملیں گے! چاہے یہ سریر آرائے حکومت و سلطنت ہوں اور چاہے عزلت گزین و بوریہ نشیں ہوں۔

تاریخ میں سبطِ اکبر حضرت حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے بارے میں بہت دھندلکا ہے۔ اس کتاب میں بھی کسی چیز کی پوری تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ اس لیے حقائق اور مطالب کا ذکر اجمالاً اور اشارۃً ہی ممکن ہے۔

☆☆☆☆☆

سبطِ اکبر حضرت امامِ حسن علیہ السلام

- حضرت امام حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام کی تاریخِ ولادت عموماً ۱۵ رمضان المبارک ۳ھ (مطابق ۲۸ فروری ۶۲۵ء بروز پنجشنبہ) بہ مقام مدینۂ منورہ بتائی جاتی ہے۔
- آپؑ کا شمار قرآنِ مجید کے مطابق خمسۂ نُجبا یعنی آلِ عبا و اصحابِ کسا میں اور ابنائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ہوتا ہے۔

اربابِ ایمان کی زبانوں پر جو "پنجتنِ پاک" کا ذکر رہتا ہے یہ کوئی عوام الناس کا عقیدت مندانہ تصور نہیں ہے بلکہ یہ آیتِ مُباہلہ اور آیتِ تطہیر سے مأخوذ اور مستند عقیدہ ہے۔ آیتِ مباہلہ یعنی سورۂ مبارکۂ آلِ عمران کی ۶۱ ویں آیت :

﴿فَمَنْ حَآجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَاجَآءَکَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَکُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَکُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَی الْکَافِرِیْنَ﴾

اس آیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا گیا ہے کہ توحیدِ باری تعالیٰ کے اثبات اور حضرتِ عیسیٰؑ کے تعلق سے مُشرکانہ شبہات کی رد کے لیے جو آپؐ پر آیتیں نازل ہو چکی ہیں اگر ان پر بھی کوئی قانع نہ ہو اور کٹ حجتی کرے تو آپؐ اُن سے فرما دیں کہ تم اپنے بیٹوں کو لے آؤ، ہم اپنے بیٹوں کو لے آئیں؛ تم اپنی عورتوں کو لے آؤ، ہم اپنی عورتوں کو لے آئیں اور تم اپنے نفسوں کو لے آؤ ہم اپنے نفسوں کو لے آئیں پھر ابتہال و التجا کریں (مباہلہ کریں) اور اللہ کی لعنت قرار دیں جھوٹوں پر۔

یہ آیت قرآنِ مجید میں موجود ہے اور اس کی شانِ نزول اور اس سے متعلق

واقعات حدیث وتاریخ کی مستند کتابوں میں موجود ہیں۔جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ واقعۂ مباہلہ نصارائے نجران کے ساتھ ۲۴رذی الحجہ ۱۰ ہجری میں پیش آیا تھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ہمراہ صرف حضرت علی مرتضیٰ، حضرت فاطمہ زہراء، حضرت حسن مجتبیٰ اور حضرت سید الشہداء امام حسین علیہم السلام کو بمنزلۂ نفس و نساء وابنا کے لے گئے تھے۔یہی واقعہ اور قرآنی سند ابنائے رسول کی حقیقتِ ذات و بلندیٔ شرف ومنزلت کو اور ''پنجتنِ پاک'' کے عقیدے کو سمجھنے کے لیے بہت کافی ہے۔

• حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے تقریباً آٹھ برس اپنے جدِ بزرگوار حضرت سرورِ کونین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آغوشِ رحمت ونور میں تربیت پائی آپ کے بارے میں آنحضرتؐ کے ارشادات اور واقعاتِ لطف وشفقت حدیث وسیرت کی کتابوں میں مندرج ہیں، خصوصیت کے ساتھ یہ حدیثِ نبویؐ بہت مشہور ہے کہ:

''اِنَّ ابْنِی هٰذا سَیِّدٌ وَ لَعَلَّ اللّٰهَ أنْ یُّصْلِحَ بِهِ بَیْنَ فِئَتَیْنِ مِنَ المُسْلِمِیْنَ'' (بخاری، الجامع الصحیح، کتاب الفتن)

''میرا یہ بیٹا سردار ہے، اُمید ہے کہ اللہ اس کے وسیلہ سے مسلمانوں کے دوگروہوں کے درمیان صُلح کرائے گا۔''

یہ حدیث جس قدر مشہور ہے اسی قدر اس کے راویوں اور اس کے متن کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہے کہ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصل الفاظ کیا تھے؟!

بعض معتبر محدثین نے صِرف یہ الفاظ نقل کیے ہیں:

''اِنَّ ابْنِی هٰذا سَیِّدٌ وَ سَیُصْلِحُ اللّٰهُ بِهِ''

''میرا یہ بیٹا سردار ہے اور عن قریب اللہ اس کے ذریعہ سے صلح وسازگاری فرمائے گا۔''

• آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امام حسن علیہ السلام اپنے پدرِ بزرگوار حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے ساتھ مُہماتِ دین میں منہمک رہے۔ لوگوں کو قرآنِ مجید اور سیرتِ نبویؐ کی تعلیم دینا، تزکیۂ نفس کے لیے کوشاں رہنا، معارفِ دین اور حکمتِ الٰہیہ کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ فرمانا اور اپنی ایک ایک سانس کو توحیدِ حقہ کے اثبات کے لیے وقف رکھنا آپؑ کا اور تمام ائمۂ اہلبیت کا شیوۂ زندگی تھا۔

• امام حسن علیہ السلام نے حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کتنی حدیثیں سنی ہوں گی اور نقل فرمائی ہوں گی؟ اسی طرح اخلاق وسیرتِ نبویؐ کے کتنے واقعات اور نکات آپ نے لوگوں کو تعلیم فرمائے ہوں گے؟ اس کا کوئی احصا نہیں کیا جاسکتا۔لیکن اِسے مسلمانوں کی بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ خاص آپؑ کے حوالے سے صرف چند ہی حدیثیں جمہورِ مسلمین کی کتبِ حدیث میں درج کی گئی ہیں۔جن میں سے ایک روایت یہ ہے:

''روی الحسن بن علی (علیهما السلام) قال سمعت جدّی رسول الله صلی الله علیه و آله وسلم یقول: یا مُسْلِم! اِضمن لي ثلاثاً أضمن لک الجنة؛ اِن عملتَ بما فرض الله علیک فی القرآن فانت أعبد الناس، وان اتقیتَ ما حرم الله علیک فی القرآن فانت أورع الناس، وان

قنعتَ بما رزقکَ الله فَأنت أغنى الناس"

امام حسنؑ نے فرمایا کہ میں نے اپنے نانا کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

اے مسلمان! مجھے تین باتوں کی ضمانت دے دے میں تیرے لیے جنت کا ضامن ہوں گا۔ اگر تو اللہ نے جو کچھ قرآن میں فرض کیا ہے اُس پر عمل کرے تو سب لوگوں سے زیادہ عبادت گزار ہوگا، اور اگر اللہ نے جو کچھ قرآن میں حرام قرار دیا ہے اُس سے بچے تو سب سے زیادہ پرہیز گار ہوگا، اور اگر اللہ نے جو کچھ رزق تجھے عطا کر دیا ہے اس پر قناعت کرے تو تُو سب سے زیادہ غنی ہوگا!

بلاغت کی قسم کیا جامع کلمات ہیں!

● امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کی زندگی میں روحانی اور علمی افادات کے ساتھ ساتھ عملی اور جہادی پہلو بھی بہت نمایاں ہے۔

آپؑ نے حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے ساتھ جنگِ جمل، جنگِ صفین اور جنگ نہروان میں یادگار کارنامے انجام دیے۔ سفارتی امور کے لحاظ سے بھی اور میدانِ جنگ میں شجاعانہ قیادت اور جرأت مندانہ محاربت کے لحاظ سے بھی۔ جس طرح آپ کے والد ماجد امیر المؤمنین علیہ السلام پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بدر واحد وغیرہ کے معرکوں میں قوتِ بازو بنے تھے اُسی طرح آپؑ جمل وصفین میں اپنے والد حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی طاقتِ دل بنے رہے۔

● حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپؑ مستقل طور پر امامت کے ذمہ دار ہوئے، ساتھ ہی تمام مسلمانوں نے آپؑ کے ہاتھوں پر بیعت

کی۔ اور آپؑ نے امرِ امامت کے ساتھ ساتھ کچھ دنوں کے لیے خلافتِ ظاہری بھی قبول فرمائی، لیکن "باغیِ شام"، جس کی ریشہ دوانیوں نے حضرت امیر المؤمنین کو چین سے بیٹھنے نہیں دیا تھا، آپ کے لیے بھی درپے آزار رہا۔

'باغیِ شام' کی ریشہ دوانیاں تاریخ میں نہایت درشت حرفوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ ایک طرف وہ، اور دوسری طرف اہلِ عراق کا بزدلانہ اور اکثریت کا دُنیا پرستانہ رویہ، نتیجۂ اسباب ایسے ہوئے کہ امام حسن مجتبیٰ نے چند شرطوں کے ساتھ "حکومتِ ظاہری" سے کنارہ کشی فرمالی۔ اور اپنے ساتھ بچے کھچے صلحائے امت کا خون بے موقع ضایع ہونے سے بچالیا۔ (ح)

● حکومت ظاہری سے کنارہ کشی فرمالینے کے بعد حضرت امام حسن علیہ السلام اپنے بھائی، اپنے بعد ہونے والے امام، حضرت امام حسین علیہ السلام اور اپنے پورے کنبہ کے ساتھ کوفہ سے اپنے جدِ حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوارِ مقدس مدینہ منورہ میں جاکر مقیم ہوگئے۔ اور اسی طرح لوگوں کی ہدایت وتربیت میں مشغول ومصروف رہے، جس طرح امیر المؤمنین علیہ السلام "حکومتِ ظاہری" پر متمکن ہونے سے پہلے اسی مدینہ منورہ میں وصیِ رسولؐ کی حیثیت سے امورِ دین اور تربیتِ مسلمین میں مشغول ومصروف رہتے تھے۔

● امامِ حسن مجتبیٰ علیہ السلام کو "باغیِ شام" کی طرف سے کئی مرتبہ زہر دیا گیا۔ یہاں تک کہ ماہِ صفر ۵۰ھ کی آخری تاریخ کو آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔ اور مدینۂ منورہ میں روزِ وفاتِ پیغمبرؐ کی طرح کہرام برپا ہوا۔ آپؑ کی آرزو

(ح) امام حسن علیہ السلام کا یہی اقدام تاریخ میں "صلحِ حسن" یا امام حسن کے معاہدۂ جنگ بندی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس صلح کے اسباب وعلل، پس منظر اور شرائط کے بیان میں مؤرخین کی عبارتیں مختلف ہیں پھر بھی حقیقتیں ظاہر وباہر ہیں۔ اس موضوع پر بہت سے علماء نے مستقل کتابیں تحریر فرمائی ہیں۔ جن میں اردو کی حد تک علامہ بے عدیل مولانا سید عدیل اختر صاحب مرحوم سابق پرنسپل مدرسۃ الواعظین لکھنؤ کا رسالہ "صلحِ حسن" بجا طور پر قابلِ حوالہ رسالہ ہے۔

تھی کہ اگر ہو سکے تو جدِ بزرگوار حبیبِ کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں دفن کیا جائے لیکن یہ بھی وصیت فرمائی تھی کہ اگر لوگ وہاں دفن کرنے سے منع کریں تو پھر بقیع میں سپردِ لحد کیا جائے۔ اور یہی ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہیتے نواسے، امام المسلمین، سید شبابِ اہلِ جنت حضرت امام حسنِ مجتبیٰ علیہ السلام کو جوارِ پیغمبرؐ میں دفن نہیں ہونے دیا گیا اور آپؑ بقیع میں دفن کیے گئے۔

رسولِ خدا اور آپؑ کے اہلِ بیت صلی اللہ علیہ وعلیہم اجمعین کے چاہنے والوں اور جاں نثاروں کے لیے قیامت تک یہ سوانح غم انگیز اور المناک جراحتوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان سوانح کے اسباب وعلل اور ان میں کار پرداز افراد سے بیزاری ہی تزکیۂ باطن اور قرب الی اللہ کا ذریعہ رہ جاتا ہے!

حضرتِ امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے مدائح میں بہت سے قابلِ حوالہ اور شایانِ ذکر قصائد، منقبتیں، سلام اور قطعات اردو، فارسی، عربی اور بعض دوسری زبانوں میں بڑے نامی شعرا نے تخلیق کیے ہیں لیکن مجھے مرحوم محسن نقوی کے یہ دو قطعات بہت پسند ہیں جنہیں یہاں نقل کر رہا ہوں:

چھٹے گی کذب کی گردِ کہن آہستہ آہستہ
مٹے گی فکرِ انساں کی تھکن آہستہ آہستہ
ابھی تاریخ کو بچپن کی سرحد سے گزرنے دو
کھلیں گے اس پہ اوصافِ حسنؑ آہستہ آہستہ

میزانِ عدل میں ہیں برابر کے دو امام
اک سرخرو چمن ہے مقدس چمن کے بعد
لوحِ جبینِ عظمتِ آدمؑ پہ حشر تک
نامِ حسینؑ ثبت ہے لیکن حسنؑ کے بعد

☆☆☆☆☆

سبطِ اصغر وشہیدِ اکبر حضرت سید الشہدا امامِ حسین علیہ السلام

سبطِ رسولؐ حضرت سید الشہدا امام حسین علیہ السلام اور آپ کے قیام وجہادِ عاشورا اور سانحۂ کربلا سے متعلق اتنا لکھا اور بولا گیا ہے کہ شاید ہی دُنیا کے کسی اور موضوع پر اس قدر لکھا اور بولا گیا ہوگا۔ لیکن پھر بھی یہ سلسلہ جاری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا۔ جو نامِ خدا کو باقی رکھنے کے لیے ایسی عظیم قربانیاں پیش کردے اُس کے ذکر کو باقی رکھنے کے لیے خود پروردگار کیا کچھ تدبیریں نہ فرمائے گا!

• مشہور ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی ولادت ۳ر شعبان المعظم ۴ہجری (مطابق ۷رجون ۶۲۶ء) کو مدینہ منورہ میں ہوئی۔

• آپ کے ابتدائی حالات برادرِ بزرگ سبطِ اکبر حضرت امام مجتبیٰ علیہ السلام کے حالات سے بڑی حد تک مشابہ بلکہ متحد ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ربّانی وملکوتی تربیت میں رہنا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امیر المؤمنین علیہ السلام اور اُن کے بعد امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ مہماتِ دین میں مُنہمک رہنا، قرآن وسیرت نبوی کے تحفظ کا ہر ممکن سروسامان کرنا اور دین وشریعت میں کسی بھی طرح کا رخنہ نہ پڑنے دینا، آپ کی حیاتِ طیبہ کے نمایاں ترین خصوصیات تھے۔

• معارفِ توحید اور تمام حقائق ومعالمِ دین کے بارے میں امام حسین علیہ السلام اور دوسرے ائمۂ اہلبیت علیہم السلام کے گرانبہا ارشادات واسباق تاریخ وحدیث کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ توحیدِ صمدی کے بیان میں ہم آپؑ کا ایک خط اسی کتاب میں نقل کر چکے ہیں۔

• خاص آپؑ کے متعلق حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد

حدیث وتاریخ کی دنیا میں ایک مستقل گونج رکھتا ہے:

''حُسَیْنُ مِنِّي وَ اَنَا مِن حُسَیْن''

اِسے ترمذی نے مُعلی بن مُرہ الثقفی سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، اور اسی طرح احمد بن حنبل اور ابن ماجہ وغیرہ نے بھی نقل کیا ہے۔

● جس طرح جناب سبطِ اکبر علیہ السلام کے تذکرے میں عرض کیا گیا کہ آپؑ نے کتنی ہی حدیثیں اپنے نانا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل فرمائی ہوں گی اور کتنے ہی واقعاتِ سیرت واخلاقِ نبویؐ اور نکاتِ علم ومعرفت لوگوں کو تعلیم فرمائے ہوں گے لیکن یہ جَورِ تاریخ ہے کہ رسولِ اکرم کے ایسے اہلبیتؑ کی زبانی روایت کرنے سے جمہورِ مسلمین نے اتنی ہی بے اعتنائی برتی کہ اُن کی کتابوں میں صرف چند، غالباً سات یا آٹھ ہی حدیثیں خاص ان کے حوالے سے جگہ پاسکیں۔ یہی صورت امامِ حسین علیہ السلام کے ساتھ ہے۔ آپؑ کی زبانی نقل شدہ ارشاداتِ پیغمبرؐ میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ اَلصَّبْرُ مِفْتَاحُ الْفَرَجِ وَالزُّهْدُ غِنَی الْاَبَدِ

''صبر (تحمل اور ثباتِ قدم) کشائش کی کلید ہے اور پرہیزگاری لازوال تونگری ہے۔''

اسے دیلمیؒ نے مرفوعاً نقل کیا ہے۔

۲۔ اَلْبَخِیْلُ مَنْ ذُکِرْتُ عِنْدَہُ فَلَمْ یُصَلِّ عَلَیَّ.

''بخیل وہ ہے جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے۔''

اسے احمد بن حنبل، نسائی، بیہقی اور طبرانی وغیرہ نے نقل کیا ہے اور ابن حبان وحاکم وغیرہ نے اس نقل کو صحیح قرار دیا ہے!

۳۔ طبرانی نے معجم کبیر میں یہ حدیثِ صحیح بھی امام حسین علیہ السلام سے مرفوعاً نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ مَعَالِیَ الْاُمورِ وَ اَشْرَافِها و یکرہُ سَفْسَافَها''

''پروردگار بلند اور بہترین امور کو پسند فرماتا ہے اور پست ورکیک باتوں کو ناپسند فرماتا ہے۔''

۴۔ اسی کتاب (چراغِ راہ) میں مباحثِ توحید میں امام حسینؑ کے ایک خط کا تذکرہ آچکا ہے جس میں آپؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث نقل فرمائی ہے۔

''مَنْ قَالَ فِي القرآنِ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہُ مِنَ النَّارِ''

''جس نے بھی قرآن مجید (کی تفسیر) کے بارے میں آگہی کے بغیر کلام کیا وہ دوزخی ہے''

۵۔ تحف العقول میں امام حسین علیہ السلام سے ''جہاد کے اقسام'' پر ایک موعظہ نقل کیا گیا ہے۔ اس میں بھی آپؑ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشادِ مبارک نقل فرمایا ہے:

وَقَدْ قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیه وآله وسلم:

''مَنْ سَنَّ سُنَّةً حَسَنَةً فَلَهُ أجرُها وَ اَجرُ مَنْ عَمِلَ بِها اِلیٰ یومِ الْقِیامه مِنْ غَیرِ أن یَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَیْئاً''

''جس نے بھی کسی اچھے طور طریق کی بنیاد ڈالی اسے اس کا اپنا اجر بھی ملے گا اور تا قیامت جتنے لوگ بھی اس پر عمل کریں گے اُن کے اجروں میں کسی کمی کے بغیر اُسے بھی اجر ملتا رہے گا۔''

• انبیاء اور ائمۂ دین علیہم السلام کا بنیادی کام انسانوں کو معبودِ برحق کی اِطاعت کا پابند بنانا اور سرکشوں کی بندگی سے بیزاری سکھانا ہے۔ جب جب معاشرۂ انسانی میں کوئی بڑا سرکش پیدا ہوا ہے انبیا اور ائمہ دین نے خدا کی اطاعت کا پرچم بلند رکھتے ہوئے اُس کا ہر طرح سے مقابلہ کیا ہے۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرتِ عیسیٰ اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہم اجمعین کے واقعاتِ سیرت اِس حقیقت کے لازوال، زندہ اور بولتے ہوئے ترجمان ہیں۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی زندگی میں بھی یہ حقیقت اپنی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ آپ نے اپنے پدرِ بزرگوار حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام اور ان کے بعد امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ تمام مہماتِ دین میں منہمک رہنے، نیز قرآن و سنتِ نبوی کی ترویج وحفاظت کا ہر ممکن سامان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کا سب سے بڑا مقصد یہ قرار دیا تھا کہ دین و شریعت میں کسی بھی طرح کا رخنہ نہ پڑنے پائے۔ چنانچہ جب ۲۲ر رجب ۶۰ھ کو ''باغیِ شام'' کی موت واقع ہوئی اور اس کی جگہ اس کا وہ بیٹا تختِ حکومت پر بیٹھا جس کی سرکشی اس کے باپ سے بھی بڑھی ہوئی تھی اور جس کے چہرے پر دین داری کی کوئی خفیف سی نقاب بھی نہ تھی، اس وقت امامِ حسین علیہ السلام نے حضرت موسیٰ کی طرح اس بدترین فرعونِ وقت سے مقابلہ میں حکمت ومشیت الٰہی اور ''تدبّرِ دینی'' کا کوئی تقاضہ فروگزاشت نہیں فرمایا۔

• حضرت امامِ حسین علیہ السلام ''طاغوتِ وقت'' سے مقابلے اور اس کے شر سے دین وشرافتِ انسانی کو بچانے کے لیے ۲۸ر رجب ۶۰ھ کو مدینہ منورہ سے نکلے۔ تاریخ، تذکرے اور مقاتل کی کتابوں میں حضرت امام حسین علیہ السلام کے سفر وقیام کی ایک ایک تفصیل موجود ہے۔ بیشتر تاریخوں نے لکھا ہے کہ جب آپؑ مدینہ سے

نکل رہے تھے تو آپؑ کی زبانِ مبارک پر قرآن مجید کی یہ آیت تھی جس میں حضرت موسیٰ کی وقتِ ہجرت کی دُعا نقل ہوئی ہے:

''فَخَرَجَ مِنْهَا خَائِفًا يَتَرَقَّبُ قَالَ رَبِّ نَجِّنِي مِنَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ.'' (سورۂ قصص آیت ۲۱)

• امام تین شعبان ۶۰ھ بروز جمعہ مکّہ میں وارد ہوئے۔ مکۂ مکرمہ میں داخلے کے وقت بھی آپؑ کی زبانِ مبارک پر یہ آیت قرآنی تھی جو حضرت موسیٰ کے ''مدین'' میں داخلے کی قرآنی محاکات ہے۔

﴿وَلَمَّا تَوَجَّهَ تِلْقَاءَ مَدْيَنَ قَالَ عَسَىٰ رَبِّي أَنْ يَهْدِيَنِي سَوَاءَ السَّبِيلِ﴾ (سورۂ قصص آیت ۲۲)

• ۳ر شعبان سے ۸ر ذی الحجہ تک امامِ حسین علیہ السلام نے مکۂ مکرمہ میں قیام فرمایا۔ اس عرصہ میں آپؑ نے ملّت اسلامیہ کے تمام طبقات اور مملکتِ مسلمین کے تمام اطراف واکناف میں امرِ حق کی اشاعت اور وضاحت فرمائی۔ اسی دوران جب اہلِ کوفہ کو یہ معلوم ہوا کہ آپ نے ''طاغوت'' کی بیعت سے انکار فرمادیا ہے اور مدینہ منورہ سے نکل مکہ مکرمہ میں اقامت فرما ہیں تو اُن میں سے بعض صالحین امت نے آپؑ کو پورے خلوص وجوشِ ایمانی کے ساتھ کوفہ تشریف لانے اور سیرت و سنت نبویؐ کے مطابق تدبیرِ نظام فرمانے کی درخواستیں بھیجیں۔ لیکن اسی کے ساتھ بے شمار خطوط ان لوگوں نے بھی روانہ کیے جو مخلص نہ تھے بلکہ مُغرِض تھے۔ بہرحال، امام علیہ السلام کے پاس فی الجملہ اہلِ کوفہ کے اتنے خطوط پہنچے کہ حسبِ ظاہر آپؑ پر ان کی ہدایت ودستگیری فرمانے کے لیے تشریف لانا ایک لازمی امر بن گیا۔ دوسری طرف ''حکومتِ شام'' نے ایامِ حج اور مراسم ومناسکِ حج کے دوران ہی امام علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ بنایا اور پیشہ ور قاتلوں کو حاجیوں کے لباس میں مکہ روانہ

کردیا۔ جس کے نتیجے میں ایک تو حُرمتِ حَرَمِ الٰہی کو بچانے اور دوسرے خود اپنے بے موقع قتل ہوجانے کے خطرے کو دفع کرنے کی غرض سے امامِ حسین علیہ السلام نے ۸ رذی الحجہ ہی کو، بنا بر مشہور، حج کو عمرے سے بدل کر مکۂ مکرمہ سے کوفہ کی جانب سفر اختیار فرمایا۔ (۱)

- مکہ ۔ دنہ تک کا سرنوشتِ اسلام اور تقدیرِ انسانیت بدل دینے والا یہ سفر ۱۶ رمنزلوں اور ۲۳ ریا ۲۴ ردنوں میں طے ہوا۔ (۲)

- ۲ رمحرم کو امامِ حسین علیہ السلام کربلا میں وارد ہوئے۔ جہاں صرف آٹھ روز کے قیام کے بعد ۱۰ رمحرم ۶۱ھ کو آپؑ نے چند جوانانِ بنی ہاشم اور اپنے منتخبِ روزگار اصحاب کے ساتھ تین دن کی بھوک اور پیاس میں وہ یادگار جہاد فرمایا جسے تاریخ قیامِ قیامت تک بھلا نہیں سکتی۔ بلکہ جس کی گونج عرصۂ محشر میں بھی سنائی دے گی۔ جب سیدۂ کونین سلام اللہ علیہا ربِّ اکبر سے اپنے فرزند پر ہونے والے ظلم وستم کی فریاد کریں گی۔ اور وہ عادل و کریم ظالمین کو دوزخ اور امام علیہ السلام کو اجرِ شہادت میں حقِ شفاعت عطا فرمائے گا!

---

(۱) مؤرخِ مسعودی نے مروج الذہب میں لکھا ہے کہ امام حسین علیہ السلام جب مکہ سے روانہ ہوئے ہیں تو آپؑ کے ساتھ پانچ سو افراد کا قافلہ تھا۔ جبکہ ابوطلحہ شافعی نے لکھا ہے کہ یہ قافلہ صرف ۸۲ مردوں پر مشتمل تھا۔

(۲) استاذ مکرم حضرت آیۃ اللہ سید ابراہیم زنجانی نے اپنی تالیف وسیلۃ الدارین فی انصار الحسینؑ میں منازل کی ترتیب اس طرح تحریر فرمائی ہے کہ امام علیہ السلام نے شہر مکہ سے نکل کر سب سے پہلے منزلِ تنعیم پر توقف فرمایا اس کے بعد منزل صفاح پر، جہاں مشہور شاعر فرزدق سے ملاقات ہوئی، صفاح کے بعد ذاتِ عرق میں یا وادیِ عقیق میں قیام ہوا اس کے بعد حاجز او بطن الرمہ میں، جہاں سے امامؑ نے اہلِ کوفہ کے نام ایک خط قیس بن مسہر صیداوی کے ہاتھوں روانہ فرمایا۔ اس کے بعد ایک چشمہ پر اترے جہاں عبداللہ بن مطیع سے ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد منزلِ خزعیہ پر زُہیر بن القین البَجَلی کو دعوتِ حق دے کر اپنے ہم رکاب و ہم منزل بناتے ہوئے زرود پر قیام کیا، اس کے بعد ثعلبیہ پر ٹھہرے۔ یہاں آپ کو اپنے سفیر باوفا اور برادرِ عم زاد حضرت مسلم بن عقیل کی شہادت کی خبر ملی۔ ثعلبیہ کے بعد زبالہ، بطنِ عقبہ، اور شراف میں منزلیں ہوئیں۔ اس کے بعد ذوحسم پہاڑی کے دامن میں قرار لیا جہاں حر ابن یزید ریاحی کے لشکر سے سامنا ہوا اور آپؑ نے اس تشنۂ آب و ایماں اور جاں بہ لب لشکر کو سیراب فرمایا۔ ذوحسم (یا ذوحشم) کے بعد عذیب الہجانات، قصرِ بنی مقاتل اور بیصہ کے مقامات و منازل سے گزرتے ہوئے کربلا وارد ہوئے!

آپ کے ساتھ شہید ہونے والوں کے اسمائے گرامی کسی بھی صحیفہ کی زینت بنیں تو وہ صحیفہ یقیناً صحیفۂ ہدایت و نور کہلانے کا مستحق ہوگا۔ اگرچہ اس کتاب میں خود مرکزِ دائرۂ امکان سید المرسلین خاتم النبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیتِ اطہار سے ہونے والے ائمۂ معصومین کا تذکرہ موجود ہے اور وہی شرفِ کتاب کے لیے کافی ہے تاہم تذکرۂ شہدا یقیناً نورٌ علیٰ نور کا مصداق ہوگا۔

مشہور ہے کہ روزِ عاشور امام حسین علیہ السلام کے ساتھ شہید ہونے والے اصحاب کی تعداد صرف ۷۲ تھی۔ لیکن نگاہِ تحقیق کو اس میں بہت تأمّل ہے۔ بعض علماء نے اس موضوع پر مستقل اور مفصل کتابیں تحریر فرمائیں ہیں اور (۲۰۰) دو سو سے زائد شہداء کا تذکرہ قلم بند فرمایا ہے۔ اس باب میں کوئی تحقیقی بیان یا قولِ فیصل پیش کرنا یہاں پر میرے موضوع اور مقصدِ کتاب سے خارج ہے۔ سردست صرف اُستاذِ مکرم علامہ آیۃ اللہ سید ابراہیم زنجانی ؒ کی کتاب وسیلۃ الدارین فی انصار الحسینؑ میں شامل شہداء کے نام نقل کرنے پر اکتفا کی جارہی ہے۔

ہاں! یہ وہی اصحاب باوفا ہیں جن کے متعلق امام حسین علیہ السلام کا یہ ارشادِ مبارک فوزِ عظیم اور سعادتِ کبریٰ کی سب سے بڑی سند ہے۔

"اِنّـِی لَا اَعْـلَـمُ اَصْحاباً اَوْفٰی وَلَا خَیْراً من اَصْحَابِیْ وَلَا اَهْلَ بَیْتٍ اَبَرَّ وَلَا اَوْصَلَ مِنْ اَهْلِ بَیْتِی فَجَزَاکُمُ اللّٰهُ عَنِّیْ خَیْرَ الْجَزَاءِ."

"یقیناً میں اپنے اصحاب سے زیادہ باوفا اور بہتر اصحاب کا علم نہیں رکھتا اور نہ اپنے اہلِ بیت سے زیادہ نیکی اور صلۂ رحم کرنے والے اہلِ بیت سے واقف ہوں، اللہ تمہیں میری طرف سے بہترین جزا کرامت فرمائے!"

اصحابِ امامِ حسین علیہ السلام کی اس فہرست میں سب سے مقدم اُن کا ذکر ہے جنہیں صُحبتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شرف بھی حاصل تھا۔ اس کے بعد

تمام اصحاب کے نام ان کے خاندانوں کے حوالوں کے ساتھ ثبت کیے جا رہے ہیں۔

● وہ اصحابِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کربلا میں شہید ہوئے:

حضرتِ انس بن الحرث اسدی۔ تاریخ ورجال کی تمام کتابوں میں ان کا ذکر موجود ہے۔ اور ان سے یہ حدیث نبوی بھی مروی ہے:

''اِنَّ ابنِي هٰذَا يُقتَلُ بِاَرْضٍ يُقَالُ لَهَا كَرْبَلَاءَ فَمَنْ شَهِدَ ذٰلِكَ مِنكُمْ فَلْيَنْصُرْهُ''

''میرا یہ بیٹا (حسینؑ) اس سرزمین پر قتل کیا جائے گا جسے کربلا کہتے ہیں، بس تم میں سے جو اس وقت موجود ہو وہ اس کی نصرت ضرور کرے!''

(اسد الغابۃ ج ۱ ص ۱۲۳ و ص ۳۴۹، اصابہ ج ۱ ص ۶۸، کنز العمال ج ۶ ص ۲۲۳، ذخائر العقبیٰ، محب طبری ص ۱۴۶!)

● حضرت حبیب بن مظاہر اسدی۔ (ابن حجر)

● حضرت مسلم بن عوسجہ اسدی۔ (ابن سعد طبقات)

● حضرت ہانی بن عروہ مرادی۔ (یہ حضرتِ امام حسینؑ ہی میں کوفہ میں شہید ہوئے)

● حضرت عبداللہ بن یقطر الحمیری۔ (ابن حجر)

● مجمع بن زیاد بن عمرو الجہینی۔ (استیعاب ابن عبدالبر)

یہ بدر و احد میں بھی شریکِ پیغمبرؐ رہے تھے۔

● شہدائے بنی ہاشم یا اولادِ حضرتِ ابو طالب علیہ السلام:

● خود سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے علاوہ مندرجہ ذیل شہدائے بنی ہاشم نے کربلا میں اپنی جانی قربانیاں پیش کیں۔

۱- حضرت علی اکبرؑ، ۲- حضرت علی اصغرؑ، ۳- حضرت عباسؑ، ۴- حضرت

عبداللہ بن علیؑ، ۵- حضرت عثمان بن علیؑ ۶- حضرت جعفر بن علیؑ، ۷- حضرت ابوبکر بن علیؑ، ۸- حضرت ابوبکر بن حسین بن علیؑ، ۹- حضرت قاسم بن حسینؑ، ۱۰- حضرت عبداللہ بن حسنؑ، ۱۱- حضرت عون و ۱۲- محمدؑ بن عبداللہ بن جعفرؑ، ۱۳- حضرت عبداللہ بن مسلم بن عقیلؑ، ۱۴- حضرت مسلم بن مسلمؑ، ۱۵- حضرت محمد بن سعید بن عقیلؑ، ۱۶- حضرت عبدالرحمٰن بن عقیلؑ، ۱۷- حضرت جعفر بن عقیل۔

● شہدائے بنی اسد:

۱۸- انس بن حرث اسدی، ۱۹- حبیب بن مظاہر اسدی، ۲۰- مسلم بن عوسجہ اسدی، ۲۱- قیس بن مسہر اسدی۔

● شہدائے آلِ ہمدان

۲۲- ابو ثمامہ عمرو بن عبداللہ، ۲۳- بُریر ہمدانی، ۲۴- عابس شاکری، ۲۵- حنظلہ بن اسد، ۲۶- عبدالرحمٰن رجبی، ۲۷- سیف بن حرث، ۲۸- عمرو بن عبداللہ ہمدانی۔

● مذحجی شہداء

۲۹- جنادہ بن حرث، ۳۰- مجمع بن عبداللہ، ۳۱- نافع بن ہلال، ۳۲- حجاج بن مسروق۔

● انصاری شہداء

۳۳- عمرو بن قرظہ، ۳۴- عبدالرحمٰن بن عبدِ رب، ۳۵- جنادہ بن کعب، ۳۶- عمرو بن جنادہ، ۳۷- نُعیم بن عجلان، ۳۸- سعد بن حرث۔

● بجلی اور خثعمی شہداء

۳۹- زہیر بن قین، ۴۰- سلمان بن مضارب، ۴۱- سدید بن عمر، ۴۲- عبداللہ بن بشیر۔

• کِندی اور غِفاری شہداء

۴۳-یزید بن زیاد کندی، ۴۴-حرب بن امرؤالقیس، ۴۵-زاہر بن عمر، ۴۶-بشر بن عمرو، ۴۷-عبداللہ بن عروہ غفاری، ۴۸-جون غلام ابوذر غفاری۔

• کلبی شہداء

۴۹-عبداللہ بن عمیر، ۵۰-عبدالاعلیٰ بن یزید۔ ۵۱-سالم بن عمرو۔

• ازدی شہداء

۵۲-قاسم بن حبیب ۵۳-زہیر بن سلیم، ۵۴-نعمان بن حسان طائی۔

• عبدی شہداء

۵۵-یزید بن ثبیط، ۵۶-عامر بن مسلم، ۵۷-سیف بن مالک

• تمیمی وطائی شہداء

۵۸-جابر بن حجاج، ۵۹-مسعود بن حجاج، ۶۰-عبد الرحمٰن بن مسعود، ۶۱-بکر بن حی، ۶۲-عمار بن حسان الطائی،

• تغلبی شہداء

۶۳-ضرغامہ بن مالک، ۶۴-کنانہ بن عتیق۔

• جہینی و تمیمی شہداء

۶۵-عقبہ بن صلت، ۶۶-حر بن یزید تمیمی، ۶۷-عقبہ بن صلت۔

متفرق شہداء

۶۸-جبلہ بن شیبانی، ۶۹-قعنب بن عمر، ۷۰-عبداللہ بن یقطر۔

☆☆☆☆☆

(۲۴)

کوثرِ تسلیم

وَصَلِّ عَلىٰ اَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ عَلِيِّ بْنِ الْحُسَيْنِ وَمُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ وَجَعْفَرِ بْنِ مُحَمَّدٍ وَمُوسَىٰ بْنِ جَعْفَرٍ وَعَلِيِّ بْنِ مُوسَىٰ وَمُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ وَعَلِيِّ بْنِ مُحَمَّدٍ وَالْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ وَالْخَلَفِ الْهَادِي الْمَهْدِيِّ.

اور رحمت فرما مُسلمانوں کے پیشواؤں علی بن الحسین (امام زین العابدین)، محمد بن علی (امام باقر)، جعفر بن محمد (امام صادق)، موسیٰ بن جعفر (امام کاظم)، علی بن موسیٰ (امام رضا)، محمد بن علی (امام تقی)، علی بن محمد (امام نقی)، حسن بن علی (امام عسکری)، اور فرزند ہادیِ مہدی (امام زمانہ، امام مہدیِ منتظر) پر۔

سبطین رحمت، سردارانِ جوانانِ جنّت، امامینِ ہمامین حضراتِ حسنین علیہما السلام پر درود وسلام کے بعد اب اہلِ بیتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہونے والے بقیہ ائمہؑ دین اور ہادیانِ اربابِ یقین پر شخصاً شخصاً، فرداً فرداً درود و سلام بھیجا جارہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی ائمہؑ دین، ائمہؑ کافّۂ مسلمین بلکہ ائمہ بشریت ہیں۔ ماننے نہ ماننے کی بات علیحدہ ہے۔ ائمہ دین یا اولیاء اللہ، خلفائے حق اور اوصیائے مرسلین کا فیض ہدایت اور فیضانِ لطف ورحمت سبھی انسانوں کے لیے عام ہوتا ہے۔ خود ساختہ رہنماؤں اور خُدا ساختہ اماموں میں ایک بڑا امتیاز یہی ہوتا ہے کہ خود ساختہ افراد صرف اپنے ہم خیال یا اپنے ماننے والوں کی فکر رکھتے ہیں بلکہ کبھی وہ بھی نہیں ہوتی، انہیں اپنی ہی فکر دامن گیر ہوتی ہے۔ جبکہ خدا کے نمائندے ہمیشہ ساری خلقتِ خدا کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔

ائمہؑ اہلِ بیت علیہم السلام کی اِمامتِ دینی اور امارتِ روحانی پر تو سبھی مسلمانوں کا اعتقاد مسلّم ہے۔ صرف چند خصوصیات کے بارے میں اختلاف یا تفرقہ واقع ہوا ہے۔ جس میں سب سے اہم خصوصیت عِصمت کی ہے اور دوسری

خصوصیت ۱۲ کی تعداد میں حصر کی ہے۔ ایک فرقہ کے لوگ اہلِ بیتِ پیغمبرؐ سے ہونے والے اماموں کو دوسرے ائمہ فِقہ وحدیث اور علماء وعباد یا مُجتہدین اور نسّاک کے زمرے میں قرار دیتے ہیں۔ ان کی عصمت اور کسی خصوصیت کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن دوسرا فرقہ اِن کی عصمت اور امتیازی خصوصیت کا قائل ہے۔

''ائمہ مُسلمین'' کی ترکیب بھی بے حد فکر انگیز اور معنیٰ خیز ہے۔ اس میں اگر لفظِ مُسلمین کے ظاہری اور اصطلاحی معنی مراد لیے جائیں تو بھی درست ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلبیت اور آپؐ کی ذریت وعترت سے ہونے والے یہ ائمہؑ دین ہی حقیقۃً ائمہؑ مسلمین ہیں۔ یہ بات بہت غور طلب ہے کہ جمہورِ مسلمین کے بیشتر محدثین اور مصنفین نے جو اہلبیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونے والے اُئمہ کی تاریخ وسوانح کے باب میں مستقل کتابیں تالیف کی ہیں تو اسی لیے کہ وہ سربراہانِ سیاست کی تاریخ سے ان سربراہانِ دین کو یقیناً ایک امتیازی حیثیت دیا کرتے تھے۔ یعنی اکثر مسلمان فکری، قلبی اور عملی اعتبار سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روحانی فیوض وبرکات کے حصول کا وسلیہ انہیں ائمہؑ اہلبیت کو قرار دیتے تھے۔ اس امر کی توضیح کے لیے اہلِ عرفان وتصوف کے سلسلوں پر بھی نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ اور مجامیعِ حدیث وکتبِ تفسیر وغیرہ کا دقیق مطالعہ بھی اسی نتیجہ تک رہنمائی کرتا ہے۔

لفظِ ''مُسلمین'' کے ظاہری اور اصطلاحی معنی مراد نہ لیے جائیں بلکہ صرف اس کے لغوی معنیٰ پر نظر رکھی جائے، جو کہ خلافِ ظاہر ہونے کے باوجود بھی ممکن ضرور ہے، تو اس فقرے کے معنی حقیقتِ امر کی ترجمانی کے لحاظ سے اور بھی رسا اور پردہ کشا نظر آئیں گے۔ ائمہؑ اہلِ بیت علیہم السلام عام کلمہ گویوں اور مسلمانوں کے

امام ہوں یا نہ ہوں، لیکن اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے عشق وعرفان کے تقاضوں اوراس کے جملہ احکام کے آگے مکمل خود سپردگی کو اپنا شعار بنانے والوں کے امام بے شک یہی اورصرف یہی ہیں! زیرِ خنجر سجدہ کرنے والوں، صلیب ودار پر ذکر کرنے والوں اور نوکِ نیزہ پر تلاوت کرنے والوں کی امامت صرف اورصرف اسی گھرانے میں منحصر رہی ہے کہ جسے ''خانوادۂ نبوت'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔

اصولی طور پر لفظ ''مسلمین'' کے دونوں ہی معانی اس ترکیب میں ملحوظ رکھے جائیں تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ اَنسب ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جن ائمۂ اثنا عشر کا ذکر یہاں پر درود وسلام کا جزو ہے، یہی ائمۂ اسلام اورائمۂ مسلمین ہیں!

اسلام کی طرف رہنمائی اور مسلمانوں کی پیشوائی انہیں نے فرمائی ہے۔

اگر کوئی نص، کوئی وصیت، کوئی دلیلِ نقلی ان کی امامت پر موجود نہ ہوتب بھی تاریخ ان کے علاوہ کسی اورکو پیش نہیں کرسکتی! تاریخ کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا جائے۔ تاریخی بیانات میں سے تضادات کو دور کیا جائے، اورتمام مجعولہ روایات کو حذف کردیا جائے تو یہ حقیقت اور بھی روشن ہوکر سامنے آئے گی۔ اور بحمد للہ رفتہ رفتہ دنیا اس منزل تک آرہی ہے!

یہ ائمۂ اثنا عشر (بارہ امام) جن میں سے تین اماموں کا تذکرہ گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے، یعنی امیر المؤمنین امام علی مرتضیٰ علیہ السلام، سبطِ رسولؐ حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام اور سبطِ رسولؐ وسید الشہداء امام حسین علیہ السلام اَب کے بقیہ ۹ اماموں کے مختصر مختصر تذکرے تحریر کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مقام پر اصلِ امامت سے متعلق بعض نکات کا ذکر بھی کردیا جائے۔

''امامت'' ایک فطری ضرورت اورانسان کی طبعِ حق شناسی وحقیقت جُو کا لازمی تقاضا ہے! اس کی قرآنی اساس ربِّ کریم کی جانب سے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو منصبِ امامت پر فائز کیے جانے کے واقعے کے ضمن میں بیان ہوئی ہے اس کے علاوہ بھی مختلف آیتوں میں ''حقیقتِ امامت'' پر حسبِ ضرورت روشنی ڈالی گئی ہے۔

امامت کی ضرورت اس کے شرائط پر عقلی ونقلی دونوں براہین اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں بہ تفصیل پیش کیے گئے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں نظریۂ امامت و رہبری کس قدر اہمیت وعظمت کا حامل ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا اِس کی اساس و برہان قرآنی ہے۔ قرآنِ حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پروردگار کی جانب سے عہدۂ امامت پر فائز کیے جانے کا تذکرہ موجود ہے اور اسی ضمن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس دُعا کا ذکر ہے کہ ''پروردگار یہ امرِ امامت میری ذریّت میں بھی قرار دے'' جس دُعا کی اجابت میں پروردگار کی جانب سے فرمایا گیا ہے کہ ''اے ابراہم یہ عہدہ آپ کی ذریت میں ہونے والے خطا کاروں کو نہیں ملے گا''۔ واضح مفہوم یہ ہے کہ ''البتہ جو معصوم ہوں گے انہیں ضرور یہ عہدہ عطا کیا جائے گا''۔ قرآنی بلاغت نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

﴿وَاِذِابْتَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾ (سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴)

''اور جب ابراہیم کا ان کے پروردگار نے چند باتوں میں امتحان لیا،

اور انہوں نے ان باتوں کو پورا کر دیا تو ارشاد ہوا کہ تمہیں تمام لوگوں کا امام بناتا ہوں۔ انہوں نے کہا ''میری اولاد میں سے؟'' ارشاد ہوا کہ میرا عہدہ ظالموں کو نہیں پہنچے گا''

اِس آیت کے علاوہ اور بھی متعدد آیتوں میں امامت کے موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور امامت کے لیے عدالت وعصمت کی بنیادی شرط بھی، جس طرح اس آیت سے ظاہر ہے اسی طرح اور آیتوں میں بھی موجود ہے۔

قرآنِ مجید کے علاوہ احادیثِ نبوی اور سیرت وسنّتِ مبارکہ سے امامت کی حقیقت پر مستند روایات کا بڑا ذخیرہ ہے جسے اس موضوع پر لکھی جانے والی مستقل کتابوں میں جمع کیا گیا ہے۔ یہاں پر ہم صرف ایک روایت کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہ حدیث صحیح بخاری، صحیح مسلم اور تقریباً دوسری تمام مشہور اور مستند عند الجمہور کتبِ حدیث میں درج ہے۔ صحیح مسلم میں کتابُ الامارہ کے تقریباً شروع ہی میں متعدد روایتیں ہیں جو سب کی سب جابر بن سمرہ پر منتہی ہوتی ہیں۔ اور مضمون کے اعتبار سے تمام کی تمام روایتیں تقریباً متحد ہیں۔ ہم ان میں سے صرف ایک روایت نقل کرتے ہیں:

''عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رضی الله تعالیٰ عنه قَالَ: قَالَ النَّبِیُّ صلی الله علیه و آله وسلم : لَا یَزَالُ هٰذَا الاَمْرُ عَزِیْزاً اِلیٰ اثنیٰ عَشَرَ خَلِیْفَةً، قَالَ ثُمَّ تَکَلَّمَ بِشَیْءٍ لَمْ اَفْهَمْهُ فَقُلْتُ لأَبِی مَا قَالَ؟ فَقَالَ کُلُّهُمْ مِنْ قُرَیْشٍ''

جابر بن سمرہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا: فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے، یہ امر بارہ خلفا تک سرفراز رہے گا، انہوں نے کہا، پھر آنحضرتؐ نے کچھ

فرمایا جسے میں سمجھ نہ سکا تو میں نے اپنے والد سے کہا، کیا فرمایا؟ انہوں نے کہا: فرمایا ''وہ سب کے سب قریش سے ہوں گے''!

اِس حدیث کی جتنی روایتیں ہم تک پہنچی ہیں اُن میں کہیں ''امیراً'' کا لفظ ہے کہیں ''خلیفۃً'' کا لفظ ہے، کہیں ''اماماً'' کا لفظ ہے اور کہیں ''رجلاً'' کا لفظ ہے۔ اسی طرح شروع کے الفاظ میں لا یزال ھٰذا الامر ہے، کہیں لا یزال ھٰذا الدین ہے کہیں لا یزال الاسلام ہے اور کہیں لا یزال امرُ الناس ہے۔ لیکن ''اثنا عشر'' کے الفاظ بلا استثناء تمام روایتوں میں موجود ہیں۔

اس طرح یہ حدیث بعدِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اماموں کو بارہ کی تعداد میں منحصر قرار دیتی ہے۔ اَب وہ بارہ امام کون ہیں۔ اس سلسلے میں دوسری مستند حدیثیں توضیح وتشریح کرتی ہیں ان میں اکثر حدیثیں محدثِ جلیل علامۂ حمویؒ نے فرائدالسمطین میں نقل فرمائی ہیں، لیکن قبل اس کے کہ ہم اُن احادیث کا تذکرہ کریں کشکول علامۂ بہائی سے ایک اہم اقتباس نقل کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے تحریر فرمایا ہے کہ بارہ اماموں کی طرف توریت میں بھی ارشارہ موجود ہے۔ توریت کی عبارت یہ ہے:

''ولیشمعئل شمعتیخا ھینہ برختی اوقودھفریتی اوتوھربیتی اوتو بمئید مند شنیم عاسارنسیئیم یولید ونتیتولغوی کادول'' (کشکول بہائی ج۳ص۲۷۲)

اس کا ترجمہ ہے کہ ''اے ابراہیم اسماعیل کے حق میں تمہاری فریاد اور تمہارا نالہ ہم نے سنا اور اسے برکت دی اور باوَر کیا اور اس کو اپنی عنایت سے بے انتہا بزرگواری اور بلندی مقام عطا کیا اور اس سے بارہ سردار پیدا کریں گے اور اسے عظیم امت قرار دیں گے۔''

توریت کی یہ آیت، قرآن مجید کی آیت سے کس قدر نزدیک مفہوم اور مضمون کی حامل ہے، یہ پوشیدہ نہیں۔

اب یہ روایت ملاحظہ فرمائیے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بعد ہونے والے بارہ اماموں کا نام بہ نام ذکر فرمایا ہے۔

عن جابر بن يزيد الجعفي قال سمعت جابر بن عبدالله الانصاری يقول قال لی رسول الله صلی الله عليه و آله وسلم يا جابر ان اوصيائی و ائمة المسلمين من بعدی اولهم عليٌّ ثم الحسنُ ثم الحسين ثم علی بن الحسين ثم محمد بن علی المعروف بالباقِرستدركهُ يا جابرفاذا لقيتهُ فاقرأهُ منی السلام ثم جعفربن محمد ثم موسیٰ بن جعفرثم علی بن موسیٰ ثم محمدبن علی ثم علی بن محمد ثم الحسن بن علی ثم القائم اسمه اسمی و كنيتهُ كنيتی ابن الحسين بن علی ذاک الذی يفتح الله تبارک وتعالیٰ علی يديهِ مَشَارق الارضِ و مغاربَها ذاک الذی يغيب عن اولياء ہ غيبة لا يثبت علی القول بامامَتِه الامن امتحن اللهُ قَلْبَهُ لِلايمان قالَ جابر فقلت يا رسول الله فهل للناس الانتفاع به فی غيبته فَقَالَ ای وَالذِیْ بعثنِي بالنبُوَّةِ انهم يَسْتَضِيئُونَ بنُورِهِ وِلاية فِي غَيبتهكانتفاع الناس بالشمس و ان سترها سحاب هذا من مكنون سرّ الله و مخزون عِلمِهِ فاكتمه الامن اهله.

"(بقدر الحاجہ) جابر بن یزید جعفی سے روایت ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ انصاری سے سنا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے

جابر میرے اوصیاء اور مسلمانوں کے ائمہ میرے بعد بارہ ہیں جن کے پہلے علی ہیں پھر حسن پھر حسین پھر علی بن حسین پھر محمد بن علی ہیں جو باقر کے لقب سے معروف ہوں گے۔ اے جابر تم انہیں دیکھو گے تو جب تمہاری ان سے ملاقات ہوتو میرا اسلام انہیں پہنچا دینا۔ پھر جعفر بن محمد ہیں پھر موسیٰ بن جعفر ہیں پھر علی بن موسیٰ ہیں پھر محمد بن علی ہیں پھر علی بن محمد ہیں پھر حسن بن علی ہیں پھر قائم ہیں۔ ان کا نام میرا نام اور ان کی کنیت میری کنیت ہوگی۔ وہ حسین بن علی کے بیٹے ہیں۔ یہ وہی ہیں کہ خداوندِ تبارک وتعالیٰ ان کے ہاتھ پر زمین کے مشارق ومغارب فتح کرے گا۔ یہ وہی ہیں کہ جو اپنے چاہنے والوں سے غائب ہوجائیں گے۔ جس کے دل کو خدا نے ایمان سے آزمایا ہوگا صرف وہی اس غیبت پر ثابت قدم رہے گا۔ جابر کہتے ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ کیا ان کی غیبت میں ان سے لوگوں کو کچھ فائدہ پہنچے گا؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں خدا کی قسم جس نے مجھے نبوت ۔ سے سرفراز کیا لوگ اس کے نورِ ولایت سے اس طرح مستفید ہوں گے جیسے بادل میں چھپے ہوئے سورج سے ہوتے ہیں، یہ اللہ کے چھپے ہوئے اسرار اور اللہ کے خزانۂ علم سے ہے۔ اسے اہل افراد کے علاوہ سب سے پوشیدہ رکھنا۔'' [1]

روایتیں اور بھی ہیں لیکن ہم اسی ایک روایت پر اکتفا کرتے ہیں اور اب اہلِ بیت نبویؐ سے ہونے والے بقیہ ائمہ اطہار علیہم السلام کے تذکرے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

[1] خلفائے اثناعشر از علامہ طالب جوہری ص ۲۷۱-۲۷۰، بحوالہ ینابیع المودۃ ج ۳ ص ۳۹۸۔

آدمِ آلِ عبا حضرت علی بن الحسین زین العابدین علیہ السلام

• آپ کا نامِ نامی 'علیؑ' تھا، کنیت ابو محمد اور ابو الحسن تھی، زین العابدین، سید العابدین، آدمِ آلِ عبا، سجاد، عابد، ذوالثفنات آپ کے مشہور القاب تھے۔

کفایۃ الطالب میں "امام حافظ ابوعبداللہ محمد بن یوسف بن محمد قریشی شافعی م ۶۵۸ھ" نے انتہائی معتبر سند کے ساتھ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے یہ حدیث روایت کی ہے:

"كُنتُ عندَ رسولِ اللهِ صلى الله عليه وآله وسلم فدخَلَ عليه الحسينُ بن علي عليه السلام فَضَمَّهُ الىٰ صدرِهِ وَ قَبَّلَهُ و أَقْعَدَهُ اِلىٰ جَنْبِهِ، ثُمَّ قَالَ: يُولَدُ لابْنِي هٰذا ابْنٌ يقَالُ لَهُ عَلِيٌّ اِذا كَانَ يَومَ القِيَامَةِ نادَىٰ مُنادٍ مِنْ بُطْنَانِ العرشِ لِيَقُمْ سَيِّدُ العَابِدِيْنَ فَيَقُومُ هُوَ" (کفایۃ الطالب ص ۴۴۸)

"میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں تھا کہ حسین بن علی علیہما السلام داخل ہوئے، آنحضرتؐ نے انہیں اپنے سینے سے لگایا، پیار کیا اور اپنے پہلو میں بٹھایا پھر فرمایا "میرے اس بیٹے کے یہاں ایک بیٹا ہوگا جس کا نام علی رکھا جائے گا جب روزِ قیامت ہوگا تو ایک آواز دینے والا عرش کی بلندیوں سے آواز دے گا کہ "سید العابدین" کھڑے ہو جائیں تو وہی اٹھے گا۔"

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ لقب خطابِ الٰہی ہے۔ جس کی خبر مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے۔

اسی طرح آپ کے اور القاب کے لیے مختلف روایتیں وارد ہوئی ہیں۔ جو آپ کی مفصل سوانح عمریوں میں مذکور ہیں۔

• معلوم ہے کہ آپ کی امامت کا پہلا دن وہ قیامت خیز دن تھا جسے روزِ

عاشور کہتے ہیں۔ بقولِ علامہ جمیل مظہری:

وہ گرجتا ہوا تپتا ہوا عاشور کا دن
غلبۂ نار کا دن خاتمۂ نور کا دن
نور کا مظہرِ مطلق جو دمِ عصر بجھا
ہو گیا ایک نمونہ شبِ دیجور کا دن
بحرِ آفاق میں تنویر کے دھارے ٹکرائیں
وقت وہ تھا کہ ستاروں سے ستارے ٹکرائیں

لیکن:

خیریت گذری کہ موجود تھا اِک نورِ ہدیٰ
جس کی آواز پہ زینب کا اٹھا ہاتھ گرا
ان کے منھ سے جو نکلتا کوئی حرف فریاد
ٹوٹ جاتا یہ نظامِ کششِ ارض و سما
نہ سحر پھر کوئی ہوتی نہ سویرا ہوتا!
تا ابد دہر میں اک گھور اندھیرا ہوتا!

تم کو اے عابدِ بیمار اَب و جد کا سلام
اُن کی امّت پہ کیا رحم محمدؐ کا سلام
تم کو اسلام کی ہر زندہ علامت کی دعا
مسجد و مدرسہ و منبر و مسند کا سلام
تم نہ ہوتے تو نہ مسجد نہ یہ منبر ہوتے
تم نہ ہوتے تو خدا خانوں میں پتھر ہوتے!

حقیقت بالکل یہی ہے۔

۱۰ محرم ۶۱ھ (۹/ اکتوبر ۶۷۹ء) کو حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد آپؑ کی امامت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ آپؑ نے جس صبر و استقامت کے ساتھ سانحۂ کربلا کے بعد ''اسیری'' کا زمانہ گزارا، کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک کا اذیت ناک سفر طے کیا، کوفہ اور شام کے قید خانوں کے آلام سہے، وہ تاریخ کا ایسا المناک باب ہے جس پر کسی بھی صاحبِ احساس کی آنکھیں خشک نہیں رہ سکتیں۔ مرزا غالب دہلوی کے چند شعر مجھے بہت اچھے لگتے ہیں، ربِّ کریم انہیں فرزدق کے ساتھ شریکِ اجر قرار دے!

ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اس کو
ہمارا مُنھ ہے کہ دیں اُس کے حسنِ صبر کی داد
مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اس کو
وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اس کو
امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد
پیادہ لے چلیں اور نا سزا کہیں اس کو

☆☆☆

• امامِ سجاد علیہ السلام نے اصول و فروعِ دین کے استحکام، اشاعتِ احکام، تعلیمِ فرائض، بیانِ اسرارِ قیامت، اور فی الجملہ امرِ امامت کا حق کس کس طرح سے اور کیسے کیسے حالات میں ادا کیا ہے تاریخ کے صفحات میں جلی حرفوں سے لکھا ہوا ہے۔

مثال کے طور پر یہ روایت ملاحظہ فرمائیے:

امام سجادؑ کربلا کے لٹے ہوئے قافلہ کی ساربانی فرماتے ہوئے اسیری کے عالم

میں دمشق میں لائے جا رہے ہیں۔ ابراہیم بن ابی طلحہ نامی شخص آپؑ سے مخاطب ہو کر یہ نشتر زنی کرتا ہے کہ علی بن حسین فتح کس کی ہوئی؟ امام نے بہ کمالِ صبر و متانت جواب دیا: ''ذرا ٹھہر جاؤ، ابھی اذان ہوگی تو معلوم ہو جائے گا کہ فتح کس کی ہوئی!'' اللہ اکبر! اِس مختصر سی روایت میں کتنی باتیں الم نشرح ہو رہی ہیں!

• یہ آپ کی ذاتِ گرامی تھی جس نے بعد حوادثِ کربلا، مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حُرمت و مَعنویت کو دوبارہ بحال فرمایا اور اپنے چونتیس برس کے عہدِ امامت میں ایسے اسلام شناس افراد کی تربیت فرمائی جنھوں نے قرآنِ مجید اور سنّتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق اصیل و رصین علوم و معارف اہلِ دنیا تک پہنچائے!

سوچا جا سکتا ہے کہ اگر اصولِ دین و احکامِ دین، آدابِ اسلامی و تہذیبِ محمدیؐ کی تعلیم و تربیت اور ترویج و اشاعت میں حضرتِ سید سجاد علیہ السلام کی محنتیں نہ ہوتیں تو آج دنیا کے دامن میں اسلام جیسی نعمت موجود نہ ہوتی۔ دربارِ سیاست و سرمایہ داری اور نظامِ جبر و ظلم سے وابستہ اصحابِ قول و قلم کیا بولتے اور کیا لکھتے؟ قرآن و سنت کے نام پر نہ جانے کیسی کتاب اور کیسے کردار کی ترویج ہوتی؟ جس طرح یہود و نصاریٰ کی تاریخوں میں ہوا! یہ تو صرف حضرت سید سجاد امام علی بن الحسین علیہ السلام کی ذاتِ گرامی تھی جنھوں نے واقعۂ کربلا کی حقیقت کو بھی اہلِ دُنیا کے سامنے پیش کیا اور حقیقتِ اسلام کو بھی محفوظ فرمایا!

• آپؑ کے علم و شجاعت کا اعجاز، وہ خطبہ جسے آپؑ نے دربارِ شام میں دیا تھا، تاریخ و ادب کی کتابوں میں بے نظیر شہرت رکھتا ہے اور اپنے دامن میں حقائق و معارف کا ایک عالم سمیٹے ہوئے ہے۔

• آپ سے مروی احادیثِ نبویؐ، اصولِ احکام و اخلاقِ اسلامی پر آپؑ

کے مواعظ اور مَلفوظات کے جواہر پارے تمام اسلامی مآخذ میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں۔

- آپ کی دعاؤں کا مجموعہ ''صحیفۂ کاملہ'' کے نام سے شہرت رکھتا ہے۔ جسے صحیفۂ سجادیہ، ''زبورِ آلِ محمدؐ'' اور ''انجیلِ اہلبیت'' کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بجائے خود الٰہیات واخلاقیات کا ایک دائرۃ المعارف ہے۔
- رسالۃ الحقوق کے نام سے ایک مستقل اور انتہائی اہم منشورِ حقوق بھی آپؑ سے روایت کیا گیا ہے۔ بعض علماء نے صحیفۂ مبارکہ سجادیہ اور رسالۃ الحقوق کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔ لیکن یہ علم وعرفان کے وہ سرچشمے ہیں جن سے مسلسل استفادہ کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔
- اگرچہ ہم نے آپؑ کے خطبۂ دمشق کی مفصل شرح، سند ومتن کی حتی الامکان تحقیق وتصحیح کے ساتھ، علیٰحدہ لکھی ہے۔ لیکن یہاں پر بغیر کسی شرح وبیان کے اسے اپنے اس صحیفہ کی زینت بنانا بھی اپنے لیے مزید سعادت سمجھتے ہیں۔

مختلف مصادر میں اس خطبے کے مختلف اجزا نقل کیے گئے ہیں۔ لیکن، بیشتر روایتوں میں جو کلمات مشترک ہیں اور جن کے تطابق اور تواتر سے فی الجملہ اُن کے امام علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے صادر ہونے کا یقین حاصل ہوتا ہے وہ بروایت ابنِ شہر آشوب یہ کلمات ہیں۔ آپ نے حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا:

مَعَاشِرَ النَّاس مَنْ عَرَفَنِي فَقَدْ عَرَفَنِي، وَ مَنْ لَمْ يَعْرِفْنِي أُعَرِّفُهُ نَفْسِيْ. أَنَا ابْنُ مَكَّةَ وَ مِنَا، أَنَا ابن زَمْزَمَ وَالصَّفَا، أَنَا ابْنُ محمدٍ الْمصطفىٰ. أَنَا ابْنُ مَنْ لَا يَخْفىٰ. أَنَا ابْنُ مَنْ عَلىٰ فَاسْتَعْلىٰ فَجَازَ سِدْرَةَ الْمُنْتَهىٰ. وَ كَانَ مِنْ رَبِّهِ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ اَدْنىٰ. أَنَا ابْنُ مَنْ صلى بِمَلَائِكَةِ السَّمَاءِ مَثْنىٰ مَثْنىٰ. أَنَا ابْنُ مَنْ أُسْرِىَ بِهِ مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى

الْمَسْجِدِ الْاَقْصىٰ.

أَنَا ابْنُ عَلِيِّ الْمُرْتَضىٰ، أَنَا ابْنُ فَاطِمَةَ الزَّهْرَاء، أَنَا ابْنُ خَدِيْجَةِ الْكُبْرىٰ، أَنَا ابْنُ الْمَقْتُوْلِ ظُلْماً، أَنَا ابْنُ الْمَقْطُوْعِ الرَّأْسَ مِنَ الْقَفَا. أَنَا ابْنُ الْعَطْشَانِ حَتّٰى قَضىٰ. أَنَا ابْنُ طَرِيْحِ كَرْبَلَاء. أَنَا ابْنُ الْمَسْلُوْبِ الْعَمَامَةِ وَ الرِّدَاءِ، أَنَا ابْنُ مَنْ بَكَتْ عَلَيْهِ مَلَائِكَةُ السَّمَاءِ، أَنَا ابْنُ مَنْ نَاحَتْ عَلَيْهِ الْجِنُّ فِي الْأَرْضِ وَالطَّيْرُ فِي الْهَوَاءِ. أَنَا ابْنُ مَنْ رَأْسُهُ عَلَى السِّنَانِ يُهْدىٰ أَنَا ابْنُ مَنْ حَرَمُهُ مِنَ الْعِرَاقِ إِلَى الشَّامِ تُسْبىٰ. أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ اللهَ تَعَالىٰ وَ لَهُ الْحَمْدُ ابْتَلَانَا أَهْلَ الْبَيْتِ بِبَلَاءٍ حَسَنٍ حَيْثُ جَعَلَ رَايَةَ الْهُدىٰ وَالْعَدْلِ وَالتُّقىٰ فِيْنَا وَجَعَلَ رَايَةَ الضَّلَالَةِ وَالرَّدىٰ فِيْ غَيْرِنَا وَ فَضَّلَنَا أَهْلَ الْبَيْتِ بِسِتَّةِ خِصَالٍ: فَضَّلَنَا بِالْعِلْمِ وَالْحِلْمِ وَالشَّجَاعَةِ وَالسَّمَاحَةِ وَ الْمَحَبَّةِ وَ الْمَحَلَّةِ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ وَآتَانَا مَالَمْ يُؤْتَ أَحَداً مِنَ الْعٰلَمِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا فِيْنَا نُزُوْلُ الْمَلَائِكَةِ وَ تَنْزِيْلُ الْكُتُبِ.

''لوگو! جس نے مجھے پہچان لیا، پہچان ہی لیا اور جس نے مجھے نہیں پہچانا اس کو میں اپنا تعارف کراتا ہوں۔ میں مکّہ اور مِنا کا فرزند ہوں، میں زمزم اور صفا کا فرزند ہوں۔ میں محمد مصطفیٰؐ کا فرزند ہوں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جو انتہائے شہرت سے محتاجِ تعارف نہیں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جو بلندی پر پہنچا تو اتنا بلند ہوا کہ سدرۃ المنتہیٰ سے گزر گیا۔ اور اپنے پروردگار سے اتنا قریب ہُوا کہ دو کمانوں یا اس سے بھی کمتر فاصلہ رہ گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس نے ملائکۂ سماوات کو دو دو بار نماز پڑھائی، میں اس کا بیٹا ہوں جسے مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک سیر کرائی گئی، میں علی

مرتضیٰ کا بیٹا ہوں۔ میں فاطمہ زہرا کا بیٹا ہوں۔ میں خدیجۂ کبریٰ کا بیٹا ہوں۔ میں اس کا بیٹا ہوں جسے ظلم سے شہید کیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا سر پسِ گردن سے کاٹا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جسے مرتے مرتے پانی نہ دیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کی لاش کربلا میں بے گور وکفن پڑی رہی۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا عمامہ اور کمر کا پٹکا تک (لاشے سے) اتار لیا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جسے آسمان کے فرشتے روے۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کے لیے زمین پر جنوں نے اور فضا میں پرندوں نے گریا کیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کا سر نوکِ نیزہ پر شہر بہ شہر پھرایا گیا۔ میں اس کا بیٹا ہوں جس کے حرم عراق سے شام تک قیدی بنا کر لائے گئے۔

لوگو! اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے ہم اہلِ بیت کو اَچھی آزمائش میں مبتلا کیا، کیوں کہ اس نے ہدایت، انصاف اور تقویٰ کا پرچم ہمیں میں بلند کیا ہے اور گمراہی اور ہلاکت کا جھنڈا ہمارے حریفوں سے مختص کیا ہے۔ اور اُس نے ہم اہلِ بیت کو چھ خصلتوں کے باعث فضیلت عطا فرمائی ہے۔ یعنی علم، بردباری، شجاعت، سخاوت اور مومنین کے دلوں میں محبت اور مقام اور ہم کو وہ (مرتبہ) دیا جو کائنات میں ہم سے پہلے کسی کو نہیں دیا۔ ہم ہی پر ملائکہ اور آسمانی کتابیں نازل ہوئیں۔

روایتوں میں ہے کہ حضرت سجاد علیہ السلام کا یہ خطبہ مکمل نہ ہو سکا۔ حقیقتوں کے انکشاف کی بنا پر دربار میں تلاطم پیدا ہو گیا اور کفر وستم شعار حاکم نے اذان کا سہارا لے کر امام کے سلسلۂ کلام کو منقطع کر دیا۔

☆☆☆☆☆

حضرت امام باقر علیہ السلام

• آپ کا نامِ نامی محمد، کنیت ابوجعفر اور مشہور ترین لقب الباقر ہے۔ اس کے علاوہ شاکر اور ہادی بھی آپ کے القاب تھے۔

• اشاعتِ علومِ دین آپ کا اور آپ کے فرزند و جانشین امام جعفر صادق علیہ السلام کا خاص کارنامہ ہے۔

اردو کے نامور مصنفین میں مولانا ابوالکلام آزاد نے، جو ہندوستان کے بڑے سیاسی رہنماؤں میں بھی شمار ہوتے ہیں اور بڑے مفکرین، علماء اور ادباء میں بھی، اپنی مشہور کتاب ''تذکرہ'' میں ایک مقام پر لکھا ہے:

''آج قرآن وعلومِ انبیائے کرام کے خلاف کوئی ایک چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ایسی نہیں کہی جاتی اور نہیں کہی جا سکتی، جو اصولاً پہلے نہیں کہی جا چکی ہو، بلکہ عین قرآنِ حکیم کے نزول اور اُس کے ۲۳/سالہ زمانے میں نہ کہی گئی ہو اور خود قرآن وسنت نے اس کا جواب نہ دے دیا ہو...... علی الخصوص جن اربابِ نظر نے صرف حضرات ائمۂ اربعہ ہی کے مناظرات مُسکِتہ اور ائمۂ اہلِ بیت کرام علی الخصوص حضرت امام باقر و امام جعفر الصادق علیہما وعلیٰ آبائہما واجدادھما الصلوٰۃ والسلام کی احادیثِ مُفصلہ حِکَمِیّہ بمقابلۂ مشککینِ ملاحدہ وزندقہ مطالعہ کی ہیں، جن کا گھر وحی و نبوت کا گھر اور جن کا دروازہ بابِ مدینۂ علم، اور جن کے اطفال واحداث تک علمِ نبوت و فیضانِ رسالت کی گود میں پرورش پانے والے تھے، وہ بھلا آج کل کے غلغلۂ اِلحاد کو کب خاطر میں لا سکتے ہیں،...''

(ابوالکلام آزاد، تذکرہ، صفحات ۲۲۸ و ۲۲۹)

حضرت امام باقر علیہ السلام کا ایک خصوصی شرف و امتیاز حضرت جابر بن عبداللہ انصاری کی اس روایت سے سامنے آتا ہے جسے اکثر محدثین نے قابلِ

وثوق اسناد کے ساتھ نقل کیا ہے۔

ہم یہاں پر امالیِ صدوقؒ کی وہ روایت نقل کرنے کی سعادت حاصل کررہے ہیں جسے علامہ مجلسیؒ نے بحارالانوار میں بھی نقل فرمایا ہے:

[ابن الولیدِ، عن الحمیریُ، عَنْ ابنِ یَزِیدٍ، عن ابن أبیٰ عمیرٍ عنْ اَبانٍ بن عُثمانٍ، عن الصادقِ جعفربن محمدٍ علیهماالسلام قال: اِنَّ رسولَ اللّٰهِ صلی الله علیه و آله وسلم قال ذاتَ یومٍ لجابرٍ بن عبد الله الانصاری: اِنَّکَ سَتَبْقیٰ حتّیٰ تلْقی وَلدِیْ محمدَ بن عليّ بن الحسینِ بن علی بنِ ابیْ طالبِ المعروفِ فِی التَّوْراتِ بالبَاقِرِ فَاِذا لَقِیْتَهُ فاقْرأْهُ منّی السَّلامَ فدَخلَ جابرالِیٰ علی بن الحسین علیه السلام فَوَجدَ محمدَبنَ عَلِیٍّ (علیهماالسلام) عندَهُ غُلاماً فَقالَ لَهُ :یَاغُلام أَقْبِلْ فَأَقْبَلَ ثُمَّ قَالَ لَهُ أَدْبِرْ فَأَدْبَرَ فَقَالَ جَابِرٌ : شَمَایِلُ رسُولِ اللهِ صلی الله علیه و آله وسلم وَرَبِّ الکَعْبَةِ. ثُمَّ علیٰ علی بنُ الحسَیْنِ فَقَالَ لَهُ : مَنْ هٰذا؟ قَالَ هٰذا اِبْنِیْ و صَاحِبُ الاَمْرِ بَعْدِیْ محمدٌ البَاقِرِ. فَقَامَ جَابِرٌ فَوَقَعَ عَلیٰ قَدَمَیْهِ یُقَبِّلُهَا وَیَقُوْلُ نَفْسِیْ لِنَفْسِکَ الفِداء یَاابن رسولِ اللهِ، اِقْبَلْ سَلامَ أَبِیْکَ، اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی الله علیه و آله وسلم یُقْرِءُ عَلَیْکَ السَّلامَ، قَالَ: فَدَمَعَتْ عَیْنَا أَبِیْ جعفرٍ علیه السلام ثمَّ قَالَ: یَاجَابِر عَلَیٰ أَبِیْ السَّلامُ مَادَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَ الاَرْضُ وَعَلَیْکَ یَاجَابِر بِمَا بَلَّغْتَ السَّلامَ"

(بحار، ج ۴۶، ص ۲۲۴، بحوالہ امالی ص ۳۵۳)

اس روایت کی کئی لحاظ سے اہمیت ہے۔ اوّلاً سند قابلِ اعتبار ہے۔ ثانیاً اس کے متن سے کئی اہم نکات منکشف ہوتے ہیں۔

- سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ ان روایتوں کے زمرے میں آتی ہے جن میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ائمہ اثنا عشر کی تعداد اور ان کے اسماء کی نشاندہی اور تعیین فرمائی ہے۔
- ایک لحاظ سے یہ روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزاتِ اخبار بالمغیّبات سے متعلق روایتوں میں بھی شمار کی جاسکتی ہے۔
- یہ نکتہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ پانچویں امام حضرت ابوجعفر محمد بن علی بن الحسین علیہ السلام کو "الباقر" کا لقب ربِّ کریم ہی کی جانب سے عطا ہوا ہے اور اسی بنا پر اس کا ذکر توراۃ میں پایا جاتا ہے۔

تہذیبی نقطۂ نظر سے یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ مجالسِ ائمہ اطہار علیہم السلام میں اُن کے صحابہ کی حاضری کا انداز، گفتگو کا سلیقہ، اُن کے آدابِ محبت اور مراتبِ احترام کیا ہوا کرتے تھے۔ مثلاً حضرت جابر بن عبداللہ جیسے بزرگ صحابیِ رسول کا حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے قدموں کو چومنا اور "اے فرزندِ رسول" کہہ کر مخاطب کرنا۔

عرصہ ہوا میں نے اس روایت کو ذہن میں رکھ کر ایک رباعی کہی تھی اسے یہاں نقل کرنا بے محل نہ ہوگا:

حق نے جسے تا حدِّ وصیؑ پہنچایا
تا مسند و منبرِ علیؑ پہنچایا
میرا بھی سلامِ شوق پہنچے جس کو
جابرؓ نے سلامِ نبویؐ پہنچایا

٣٠١

- حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے زمانے میں تاریخِ دنیوی سے متعلق بھی ایک اہم واقعہ قابلِ ذکر ہے کہ آپؑ ہی کے مشورے سے مسلمانوں کی حکومت کا ''سکہ'' تیار ہوا۔ ورنہ اس وقت تک رومی سکّے مسلمانوں کی معیشت واقتصاد کی بنیاد بنے ہوئے تھے۔
- حضرت امام باقر علیہ السلام سے مروی اصول وفروعِ دین سے متعلق علوم ومعارف کے بارے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا اجمالی اعتراف تو اوپر نقل کیا گیا، لیکن اس کی تفصیل کے لیے صدہا جلدوں پر مشتمل دائرۃ المعارف کی تالیف درکار ہوگی۔ یہاں پر ہم آپؑ کا صرف ایک ارشادِ گرامی نقل کرنے پر اکتفا کررہے ہیں۔

بحارالانوار، کتاب العلم (ج ۱، باب ۷، ص ۲۲۲ حدیث نمبر ۵) میں ارشاد باقریؑ ہے:

''اِذَا جَلَسْتَ اِلٰی عَالِمٍ فَکُنْ عَلٰی اَنْ تَسْمَعَ اَحْرَصَ مِنْکَ عَلٰی اَنْ تَقُوْلَ، وَتَعَلَّمْ حُسْنَ الْاِسْتِمَاعِ کَمَا تَتَعَلَّمُ حُسْنَ الْقَوْلِ، وَلَا تَقْطَعْ عَلٰی اَحَدٍ حَدِیْثَہٗ''۔

تعلیم یہ ہے کہ ''جب تم کسی عالم کی مجلس میں بیٹھو تو اُس کے سامنے زیادہ بولنے کے بجائے زیادہ سُننے کی کوشش کرو۔ اور جس طرح حسنِ تقریر وتکلم سیکھتے ہو اُسی طرح ''حُسنِ سَماعَت'' بھی سیکھو۔ اور کبھی کسی کی بات نہ کاٹو۔''

- حضرت امام باقر علیہ السلام کی تاریخ ولادت وشہادت بنا بر مشہور درج ذیل ہے:

ولادت: ۱؍رجب ۵۷ھ مطابق ۹؍مئی ۶۷۷ء بروز شنبہ بمقام مدینہ منورہ۔

شہادت: ۷؍ذی الحجہ ۱۱۴ھ مطابق ۲۸؍جنوری ۷۳۳ء بروز چہارشنبہ بمقام مدینہ منورہ۔

☆☆☆☆☆

حضرت امامِ صادق علیہ السلام

بارہ اماموں میں سے چھٹے امام حضرت جعفر صادق علیہ السلام تھے۔ آپ کا نامِ نامی جعفر، مشہور ترین کنیت ابوعبداللہ، اور معروف ترین لقب صادق ہے۔

آپ کی ولادت ۱۷؍ربیع الاول ۸۳ھ مطابق ۲۰؍اپریل ۷۰۲ء مدینہ منورہ میں ہوئی۔ روایاتِ اہلِ بیتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق ۱۷؍ربیع الاول ہی خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخِ ولادت بھی ہے۔ یہ ذکر گزشتہ اوراق میں گزر چکا ہے۔ اسی مناسبت سے اس روز کا بڑا شرف ہے، اصحابِ ذکر وعبادات نے اس روز خصوصی اعمال، اوراد، وظائف اور عبادت وزیارت کا تذکرہ کیا ہے۔ اس تاریخ کو روزہ رکھنے کا ثواب ایک سال کے روزوں کے برابر نقل کیا گیا ہے۔

آپؑ کے بارے میں حضرت امام باقر علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ ''میرا یہ فرزند اُن چند مخصوص افراد میں سے ہے جن کے وجود سے خدا نے اپنے بندوں پر احسان فرمایا ہے اور یہی میرا جانشین ہوگا۔''

آپ کی شہادت حاکمِ جور وطاغوتِ وقت کی جانب سے زہرخورانی کے سبب واقع ہوئی۔ تاریخ وصال ۱۵؍شوال ۱۴۸ھ اور (بقولے ۲۵؍شوال ۱۴۸ھ) مطابق ۳ دسمبر ۷۶۵ء بروز سہ شنبہ یا ۱۳ دسمبر ۷۶۵ء بروز جمعہ ہے۔

حضرت امامِ باقر علیہ السلام کی تاریخ وفات ۷؍ذی الحجہ ۱۱۴ھ سے آپ کا عہدِ امامت شروع ہوتا ہے۔ آپ کے تقریباً ۳۴؍برس کے عہدِ امامت میں آپ کی زیرِ سرپرستی بہت سے علوم وفنون پر بہت گراں قدر کام ہوا۔ آپ کے شاگردوں کی تعداد بطورِ محاورہ چار ہزار مشہور ہے۔ مُراد یہ ہے کہ ہزارہا تشنہ گانِ علم آپ کے

فیضانِ ہدایت وحکمت سے سیر و سیراب ہوئے اور آپ کے اصحاب و تلامذہ کے ہاتھوں بکثرت کتابیں تالیف ہوئیں۔ جنہیں کتبِ رجال و فہارس میں اصولِ اَربعمائۃ (چارسو اُصلوں یا کتابوں) کے نام سے ذکر کیا جاتا ہے۔

عہدِ حاضر میں آپ کے حالاتِ زندگی اور آپ سے مروی علوم و معارف کی تدوین کے سلسلہ میں کچھ عرصہ قبل علامہ سید کاظم قزوینیؒ نے ''موسوعۃ الامام الصادقؑ'' (امام صادق انسائکلوپیڈیا) کی تالیف کی داغ بیل ڈالی تھی۔ جس کی کچھ جلدیں اُن کی زندگی میں شایع ہوئیں، اب اس منصوبہ پر اُن کے فرزند اور تلامذہ کام کررہے ہیں اور ابھی بہت کام باقی ہے۔

- امام صادق علیہ السلام کے خصوصیات میں جو معجزات وکرامات نقل کیے جاتے ہیں، وہ بھی بے شمار ہیں۔ لیکن ہم عصرِ حاضر کے اذہان کو آپ کے اور دیگر ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے صرف عِلمی اور قولی معجزات کی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہی سبیلِ علم بھی ہے سلسبیلِ نجات بھی!
- امام صادقؑ سے مروی علوم اور آداب میں جنہیں آپ کے اصحاب اور تلامذہ نے مدون فرمایا خصوصیت کے ساتھ علمِ فقہ، اصولِ فقہ، علومِ تفسیر، علوم و آدابِ عرفانِ اسلامی یا تصوف اسلامی، علومِ حدیث و درایت اور علمِ کیمیا وغیرہ کا بطورِ خاص تذکرہ کیا جاسکتا ہے کہ ان علوم کی کوئی بھی تاریخ آپؑ کے نام نامی کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتی۔ لیکن امامِ صادق علیہ السلام کے زندہ علمی معجزات میں جتنے بھی علوم کا تذکرہ کیا جاسکتا ہے ان سب کے درمیان اس مقام پر ہم بطورِ خاص علمِ فقہ کا تذکرہ قدرے وضاحت کے ساتھ کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس لیے کہ یہ علم عالمِ بشریت کی عظمت وسعادتِ دائمی اور انسانیت کے معیارِ شرافت کا بنیادی قاعدہ، اصولی ضابطہ اور عملی دستور فراہم کرتا ہے۔

علمِ فقہ(۱) اور اسی طرح علم اصولِ فقہ کو دینِ اسلام اور ملتِ اسلامیہ کی علمی اور تہذیبی میراث کے اہم ترین خصوصیات میں شمار کیا جانا چاہیے۔ کسی مذہب میں ''قانون سازی'' پر اصولاً اور عملاً اتنا زور نہیں دیا گیا جتنا اسلام نے اس کا اہتمام کیا اور اس سے بہت کچھ براہِ راست اور بہت کچھ بالواسطہ تمام انسانیت کو فائدہ پہنچا اور آج بھی پہنچ رہا ہے۔ اسی لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ ''فقہ'' وہ علم ہے جس میں ''ختم نبوت'' کا ایک تہائی راز پوشیدہ سمجھا جاسکتا ہے۔ دوسرے تمام علومِ اسلامی کی نسبت سے اسے ''جوہرِ علم'' بھی کہا جاسکتا ہے۔ کیونکہ تمام علومِ قرآن وحدیث اور علومِ ادب کو علمِ فقہ کی نسبت سے مبادی ومقدمات کی حیثیت حاصل ہے۔ عرفانی زاویۂ نظر سے عارفِ الٰہی شیخ محمد بہاری کا یہ جملہ بہت معنی خیز ہے کہ ''فقہ مقدمۂ تہذیبِ اخلاق ہے اور تہذیبِ اخلاق مقدمۂ توحید ہے!''

---

(۱) فنی اعتبار سے فقہ کی اصطلاحی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ یہ احکامِ دین کو ان کے دلائل سے تفصیلی استدلال کے ساتھ حاصل کرنے کا علم ہے۔

علمِ فقہ کے بنیادی مآخذ صرف دو ہیں: قرآن اور سنت۔ البتہ فنی تقاضوں کے تحت ادلۂ فقہیہ کو چار قسموں پر منقسم کیا جاتا ہے۔(۱) قرآن (۲) سنت (۳) اجماع (۴) عقل۔

مکاتبِ اہلِ سنت والجماعت میں عقل کے بجائے قیاس کو ادلۂ فقہیہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ وہ بھی قیاس منطقی نہیں بلکہ وہ قیاس جسے منطق کی اصطلاح میں تمثیل کہا جاتا ہے۔

فقہ جعفری کی چند بنیادی کتابوں میں تبصرۃ المتعلمین، لمعہ، شرح لمعہ، شرائع الاسلام، عروۃ الوثقیٰ، منہاج الصالحین اور تحریر الوسیلہ چند متداول اور قابلِ حوالہ کتابیں ہیں۔ یہ تمام کتابیں فقہ ساذج کی ہیں۔ فقہ استدلالی کی کتابوں میں شرح لمعہ، مکاسب، مصباح الفقیہ، ریاض، مستمسک عروۃ الوثقیٰ، التنقیح اور الفقہ وغیرہ کا نام لیا جاسکتا ہے۔

ابوابِ فقہ کا دائرہ ابوابِ زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ بعض ماہرین نے اسے دو بڑے حصوں میں منقسم کیا ہے: (۱) عبادات (۲) معاملات۔

بعض ماہرین نے چار قسموں پر منقسم کیا ہے: (۱) عبادات (۲) احکام (۳) عقود (۴) ایقاعات۔

فی الجملہ علمِ فقہ کے مشہور ابواب وکتب حسب ذیل ہیں:

۱۔ کتاب الطہارۃ، صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کے احکام۔ (۲)۔ کتاب الصلاۃ، نماز کے احکام (۳) کتاب الزکاۃ، زکاۃ کے احکام۔ (۴) کتاب الخمس، خمس کے احکام (۵) کتاب الصوم، روزہ کے احکام۔ (۶) کتاب الاعتکاف، اعتکاف کے احکام (۷) کتاب الحج۔ (۸) کتاب العمرہ۔ (۹) کتاب الجہاد (۱۰) کتاب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر (۱۱) کتاب التجارۃ (۱۲) کتاب الرہن (۱۳) کتاب الضمان (۱۴) کتاب الصلح (۱۵) کتاب الشرکۃ (۱۶) کتاب المضاربۃ (۱۷) کتاب المزارعۃ (۱۸) کتاب المساقاۃ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

حضرت امامِ جعفرِ صادق علیہ السلام کا فیضانِ علم و عصمت علم فقہ کے استحکام، اس کی ترقی اور توسیع میں کس قدر کارفرما رہا اس کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ آج فقہ اسلامی یا ''فقہ مصطفویؐ'' کے لیے فقہ جعفری کا نام بھی رائج ہو چکا ہے۔ یوں تو فقہ حنفی، فقہ مالکی، فقہ شافعی اور فقہ حنبلی کے مکاتب بھی موجود ہیں لیکن ان تمام مکاتب کے سربراہان یا تو براہِ راست یا ایک دو واسطوں سے حضرت امامِ جعفرِ صادق علیہ السلام کے تلامذہ ہی میں شمار ہوتے ہیں۔ اس تاریخی حقیقت کے پیشِ نظر بھی کہ دوسرے تمام مکاتبِ فقہ و کلام کے سرگزاران امام صادق علیہ السلام کے شاگردوں یا شاگردوں کے شاگردوں میں ہی قرار پاتے ہیں اور خود امام جعفر صادق علیہ السلام کے مخصوص امتیازات کے پیشِ نظر بھی فقہ جعفری کی اہمیت اپنی جگہ ہر دور میں مسلم رہی ہے۔

فقہ جعفری کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ اس میں عقل کی اہمیت، اصالت اور ''حُجِیَّت''، یعنی عقل کی آئین و قانون ساز حیثیت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل جن مکاتب کو پروان چڑھایا گیا ان میں ''عقل'' کی جگہ ''قیاس'' کو دی گئی، اور قیاس بھی قیاسِ منطقی یا قیاسِ برہانی نہیں، بلکہ ''قیاسِ شعری'' یا ''تمثیل''! اسی

(بقیہ صفحۂ گزشتہ) (۱۹) کتاب الودیعہ (۲۰) کتاب العاریۃ (۲۱) کتاب الاجارۃ (۲۲) کتاب الوکالۃ (۲۳) کتاب الوقف (۳۴) کتاب الصدقات (۳۵) کتاب السکنیٰ والحبس (۳۶) کتاب الھبات (۳۷) کتاب السبق والرمایۃ (۳۸) کتاب الوصایا (۳۹) کتاب النکاح (۴۰) کتاب الطلاق (۴۱) کتاب الخلع والمباراۃ (۴۲) کتاب الظہار (۴۳) کتاب الایلاء (۴۴) کتاب اللعان (۴۵) کتاب العتق (۴۶) کتاب التدبیر (۴۷) کتاب المکاتبۃ (۴۸) کتاب الاستیلاد (۴۹) کتاب الاقرار (۵۰) کتاب الجعالۃ (۵۱) کتاب الایمان (۵۲) کتاب النذر (۵۳) کتاب الصید (۵۴) کتاب الذباحۃ (۵۵) کتاب الاطعمۃ والاشربۃ (۵۶) کتاب الغصب (۵۷) کتاب الشفعۃ (۵۸) کتاب الِاحیاء الموات (۵۹) کتاب اللقطۃ (۶۰) کتاب الفرائض (۶۱) کتاب الفرائض (۶۲) کتاب القضاء (۶۳) کتاب الشہادات (۶۴) کتاب الحدود و التعزیرات (۶۵) کتاب القصاص (۶۶) کتاب الدیات۔

طرح ''حسن و قبح عقلی'' کے انکار کے باوصف ''استحسان'' کا طریق کار بھی داخل کیا گیا، جو کوئی منطقی یا علمی قانونی اساس ہونے کے بجائے صرف ایک ''ذوقی پیمانۂ تجویز و تجاوز'' کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

''قانون سازی'' کے بنیادی قاعدے میں اگر منطقی اور علمی لحاظ سے خلل واقع ہو جائے اور اس کے عملی اطلاقات اور نفاذ کے مراحل میں بھی صرف ظاہری مماثلتوں اور ذوقی ترجیحات کا دخل ہو جائے تو پھر نظامِ قانون کی کیا صورت بن سکتی ہے؟! اس کا اندازہ کوئی بھی سنجیدہ ذہن بخوبی کر سکتا ہے۔ پھر جب ماٰخذِ قانون میں سماعی دلیلوں اور نظیروں کو پیش کرنے والے بھی ''دربار و سرکار و خزانہ'' کی سیاستوں اور دنیوی مصلحتوں کے پاسدار ہوں تو اس نظام میں مزید کتنی خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں اس کا شمار بھی کسی عدل و انصاف پسند اور خدا ترس انسان کو لرزہ براندام کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے آج بھی دُنیا میں فقہ جعفری کی ساکھ قائم ہے کہ اُس کے بنیادی قواعد علم و عقل و منطق کے ناقابلِ تزلزل اَرکان پر قائم ہیں اور اس کے ''سماعی دلائل'' اہلِ بیتِ رسالت کے معصوم اماموں اور اُن اصحابِ ابرار کے سلسلوں سے نقل ہوتے آئے ہیں جو کبھی بھی سیاستِ وقت یا دربار و سرکار سے وابستہ نہ ہوئے بلکہ ہر دور میں اور ہمیشہ صرف اور صرف کتابِ خدا اور میراثِ نبوت کی پاسداری ہی جن کا واحد، والہانہ اور سرفروشانہ شوق و شغف رہا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرتِ امامِ جعفرِ صادق علیہ السلام کی مدح میں یہ رباعی شاعری نہیں خالص حقیقت نگاری کی ایک مثال ہے:

تہذیبِ الٰہی کا قرینہ بخشا
مِلّت کو معارف کا سَفینہ بخشا
تھا شرح طلب فقہ و شریعت کا باب
اِس باب کو جعفرؑ نے مدینہ بخشا!

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام

بخشا چمنِ خُلق کو اِک رنگِ ثبات
تلخی کو گوارہ کیا مانندِ نبات
دُنیا کے ستم سہ کے دیا حق کو فروغ
اعجاز ہے خود آپ کی پاکیزہ حیات

☆☆☆

الطاف و عنایات کا محور بھی رہے
فیضانِ رُبوبیت کا مظہر بھی رہے
برسوں رہے زندانِ ستم میں لیکن
احرارِ حق آگاہ کے سَروَر بھی رہے

● ساتویں امام حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام تھے۔ نام نامی موسیٰ، کاظم لقب ہے، حدیث و روایات میں آپ کی زیادہ مشہور کنیتیں ابوالحسن اور ابو ابراہیم ہیں۔ کہیں کہیں 'العبد الصالح'' یا صرف 'العالم' کے لقب سے بھی آپ سے روایتوں کا استناد کیا گیا ہے!

آپ کی تاریخ ولادت ۷/صفر ۱۳۸ھ مطابق ۶ /نومبر ۷۴۵ء اور تاریخ شہادت، ۲۵/رجب ۱۸۳ھ مطابق ۳۱ /اگست ۷۹۹ء ہے۔ اس لحاظ سے آپ کی کل عمرِ ظاہری ۵۴ برس کی قرار پاتی ہے جس میں ۲۵ برس آپ کے عہدِ امامت کے ہیں۔ اور اسی میں ۱۴/برس ہارون الرشید کے زندانِ ستم میں گزرے ہیں۔ اردو کے عظیم المرتبت مرثیہ نگار مرزا دبیرؔ نے ایک مرثیے میں کہا ہے ۔

مولا! یہ انتہائے اسیری گزر گئی
زندان میں جوانی و پیری گزر گئی!

لیکن اس کے باوجود آپ نے علم وعرفان وفقہ اسلامی کی جو خدمت انجام دی وہ تاریخ علومِ اسلامی میں زرّیں حرفوں سے لکھی ہوئی ہے۔

● آپ کی شخصیت میں جمال وجلالِ انبیاء واوصیاء اس قدر پُر فروغ تھا کہ ذاتِ گرامی سراپا سرِ طور تھی! اربابِ معرفت نے آپ سے طریقت وحقیقت کی راہیں پائیں۔ دوسری طرف جمہورِ مسلمین میں بھی آپ کی محبوبیت اِس قدر تھی کہ حکومتِ وقت ہر لحظہ آپ کی توہین اور اذیت میں کوشاں رہتی تھی۔ متعدد بار قید وبند کا سبب بھی یہی تھا۔ اور جب زہر دلوا کر آپ کو شہید کر دیا گیا تو آپ کی نعش مبارک کی جو بے حرمتی کی گئی اس کا بھی یہی سبب تھا۔ قُرآنِ عظیم کا فرمان برحق ہے:

﴿سَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَىَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُوْنَ﴾

''ظلم کرنے والے بہت جلد جان لیں گے کہ وہ کس ٹھکانہ پر پہنچنے والے ہیں!''

● آپ کے عہدِ امامت میں حاکمِ جور نے حج کیا اور مدینۂ منورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی تو اپنے حواشی اور اطرافیوں کے درمیان مفاخرت کی غرض سے قبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑے ہو کر اس طرح خطاب کیا: السلام علیک یا رسول اللہ یا ابن عم!''سلام ہو آپ پر اے اللہ کے رسول اے میرے چچا کے فرزند!'' اس وقت امام موسیٰ الکاظم علیہ السلام بھی قبرِ رسولؐ کے پاس ہی موجود تھے۔ آپؑ نے قبرِ کے نزدیک جا کر فرمایا: السلام علیک یا ابہ''سلام ہو آپ پر اے بابا! حاکم نے سن کر کہا کہ ''اے ابوالحسن حق یہ ہے کہ یہ آپ ہی کا شرف ہے!''

● امام علیہ السلام کے تعلیمات سے اصحابِ علم وار بابِ معرفت کے دفتر بھرے ہوے ہیں۔ اُن سب کو مدون کرنا اور اس کی ترجمانی کا حق ادا کرنا ایک بڑا

۳۰۹

کام ہے جو اصحابِ قول وقلم پر فرض بھی ہے اور قرض بھی۔ ہم یہاں پر ''بابِ توحید'' میں آپؑ کا ایک انتہائی مختصر لیکن معنی ومحتویٰ کے لحاظ سے انتہائی پُر اثر و پر ثمر قول نقل کرتے ہیں۔

میدانِ علم وعرفان کے مشہور یکّہ تاز ابن اَبی عمیر کہتے ہیں کہ میں حضرتِ امام موسیٰ بن جعفر علیہما السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجھے توحید تعلیم فرمایئے!

آپ نے فرمایا ''اے ابو احمد توحید کے بارے میں جو کچھ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں بیان فرمایا ہے اُس سے تجاوُز نہ کرو ورنہ ہلاک ہوجاؤ گے!''

- فرزندانِ سیر وسلوک کے درمیان آپؑ کا ایک ''ذکرِ سجدہ'' بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے:''عظم الذنب من عبدِکَ فَلْیَحْسُنِ العَفْوُ مِنْ عِنْدِکَ یَا اَهْلَ التَّقْوٰی یَا اَهْلَ الْمَغْفِرَةِ!''

حضرت امام علی بن موسیٰ الرضا علیہ السلام

حضرت علی بن موسیٰ علیہ السلام سلسلۂ اہلِ بیتِ عصمت سے ہونے والے آٹھویں امام تھے۔ آپ کا مشہور ترین لقب ''الرضا'' تھا۔

بروایتے آپ کی ولادت ١١/ذی القعدہ ١٥٣ھ (مطابق ٤/نومبر ٧٧٠ء بروز یکشنبہ) اور وفات ٢٣/ذیقعدہ ٢٠٣ھ (مطابق ٢١/مئی ٨١٩ء) بروز شنبہ ہوئی اور آپ نے کُل ٤٩/برس اِس دنیا میں زندگی بسر فرمائی۔ جس وقت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت ہوئی (٢٥/رجب ١٨٣ھ) آپ کا سن مبارک ٣٠/برس تھا۔ چنانچہ آپ کی امامت کا کل عرصہ تقریباً ١٩/برسوں کو محیط ہوتا ہے۔

آپ کے عہدِ امامت کا عظیم ترین واقعہ ''امرِ ولایت'' سے متعلق ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سے مسلمانوں میں جس سیاست کی بنیاد پڑ گئی تھی اُس میں اَمرِ خلافت یا ادارہ حکومت وسلطنت کو اہلبیتِ پیغمبرؐ سے دُور رکھنا سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ چنانچہ حضرت علی علیہ السلام سے لے کر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام تک اور اُن کے بعد سے گیارہویں امام حضرت حسن عسکری علیہ السلام تک، ہر امام کو امرِ خلافت سے دُور رکھنے کے لیے جو جو طریقے اختیار کیے گئے وہ تاریخ کے صفحات پر نہایت دُرشت الفاظ میں تحریر ہیں۔ خود امیر المؤمنین علیہ السلام کو پہلے سقیفہ بنوساعدہ میں خلافت سے محروم رکھا گیا۔ پھر استخلاف اور شوریٰ کے طریقوں کو اختیار کرکے آپؑ کا حق ضایع اور پامال کیا گیا، خلیفۂ سوم نے اپنے دَورِ اقتدار میں حضرت علیؑ کو دو مرتبہ مدینۂ منورہ چھوڑ دینے کا حکم صادر کیا۔

حضرت امامِ حسن علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ میں اگر چہ قید یا جلاوطنی کا کوئی واقعہ نظر نہیں آتا، لیکن ''باغیِ شام'' کے مکمل تسلط واقتدار کے بعد آپؑ کی بقیہ زندگی مکمل طور

پر حکومتِ وقت کی نگرانی ہی میں بسر ہوئی۔ امام حسین علیہ السلام کے سوانحِ حیات سے کون باخبر نہیں کہ آپ کو کن حالات میں مدینۃ الرسولؐ سے ہجرت کرنی پڑی اور میدانِ کربلا میں شہادت تک آپ پر کیا کیا قیامتیں گزریں اور شہادتِ عظمیٰ کے بعد بھی آپ کے اہلِ بیت کرام کے ساتھ حکومتِ وقت نے کیا کیا ظلم و ستم روا رکھے۔ حضرت امام زین العابدین علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ سے لے کر امام جعفر صادق علیہ السلام تک ہر امام کے ساتھ سیاست کارانِ وقت کی براہِ راست نگرانی، نظر بندی، تفتیش و تفحص، ظالمین کے دارالخلافہ میں بار بار طلبی، توہین اور سخت گیری غرض اسائتِ ادب کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا گیا تاکہ عوام الناس اِن رہنمایانِ معصوم سے آزادانہ طور پر استفادہ نہ کرسکیں، یہ ائمۂ دین امورِ سیاست میں داخل نہ ہوں اور اقتدار سے دور رہیں۔ اسی سلسلہ میں گزشتہ اوراق میں تذکرہ آچکا ہے کہ امام موسیٰ الکاظم علیہ السلام کی زندگی کے ۱۴ر برس قید و بند میں گزرے۔ لیکن یہ ائمۂ اہلبیت علیہم السلام کے معصومانہ کردار، عوام الناس خصوصاً محروم و مقہور طبقوں کے ساتھ اُن کی سچی ہمدردی اور حسنِ سلوک، اُن کے علم اور اُن کی خداداد وراثتِ نبوت، ولایت و عصمت کا کرشمہ اور دوسری طرف سیاہ کاران سیاست کے مسلسل ظلم و ستم، سرمایہ پرستی، عیش کوشی، صاحبانِ حقوق کی حق تلفیوں اور فرائض حکومت سے چشم پوشیوں کا قہری نتیجہ تھا کہ ائمہ اہل بیت کے لیے ساری مملکت اسلامی میں عزت و احترام اور محبت و میلان بڑھتا جا رہا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ امام رضا علیہ السلام کے عہدِ حیات و دورِ امامت میں، حکومتِ وقت مجبور ہوئی کہ آپؑ کے حق کو تسلیم کرے اور آپؑ کو ''ولی عہدِ حکومت'' نامزد کر کے عوام الناس کی خوشنودی حاصل کرے اور پھر زہر دلوا کر اپنے راستے سے ہٹائے۔ چنانچہ سیاست کارانِ وقت نے یہی طریقہ

اختیار کیا۔ اُن کی سیاست کا اہلِ بیت پیغمبر کو حکومت سے علیحدہ رکھنے کا بنیادی فارمولا بھی محفوظ رہا اور بظاہر امام کی ولی عہدی کا اعلان کر کے حکومت نے اپنی پیشانی پر محبت و مودتِ آلِ محمدؐ کا سہرا بھی سجالیا!

- امام رضا علیہ السلام کے بعض علمی ترشحات جو زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ گئے انہیں علامۂ صدوق نے ''عیونِ اخبار الرضا'' کے نام سے ایک مجموعے میں جمع فرمایا ہے۔ جس میں آپؑ کے مختلف مناظرات، مواعظ، ملفوظات اور آپؑ کی زبان مبارک سے مروی آپؑ کے جدِّ بزرگوار حضرتِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم کے احادیث و ارشادات شامل ہیں۔
- امام رضا علیہ السلام سے منسوب ایک رسالہ بعض مسائلِ طب و صحت کے بارے میں بھی پایا جاتا ہے جو ''الرسالۃ الذہبیہ'' (نامۂ زرّیں) کے نام سے شہرت رکھتا ہے اور بعض اہلِ فن حضرات نے اس کی شرحیں بھی لکھی ہیں۔

☆☆☆☆☆

حضرت امامِ جواد علیہ السلام

سلسلۂ امامتِ اہلِ بیتؑ کی نویں کڑی حضرت امام رضا علیہ السلام کے فرزند امام محمد تقی علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ جن کا ایک لقب جواد بھی ہے۔

آپ کی ولادت بنا بر مشہور ۱۰/رجب ۱۹۵ھ (مطابق ۸/اپریل ۸۱۱ء بروز سہ شنبہ۔ بمقام مدینہ منورہ) اور وفات ۲۹/ذیقعدہ ۲۲۰ھ (مطابق ۲۴/نومبر ۸۳۵ء بروز چہارشنبہ) بمقام کاظمین (بغداد) عراق ہوئی۔ اور اِس دارِ فانی میں آپ کی کل مدت زندگانی صرف ۲۵/برس قرار پائی۔

● آپ کے ذاتی احوال وکوائف میں سیاست مدارِ وقت کی بیٹی سے آپ کا عقد اربابِ تاریخ نے خصوصی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ جس کا سبب یہ ہے کہ یہ عقد آپ کے مرتبۂ امامت اور مقامِ علم وعصمت کی ایک بڑی دنیوی آزمائش کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ جس سے آپ بکمالِ متانت کامیابی کے ساتھ گزرے۔

● جو امور براہِ راست شانِ امامت وامرِ ہدایت سے تعلق رکھتے ہیں ان میں نہایت کم سنی میں کمالِ علم وجلال وجمالِ عصمت کا اظہار خاص طور پر شایانِ ذکر ہے۔ اس سلسلے میں حاکمِ وقت کے دربار میں منعقد ہونے والے مُناظروں کی روداد یں معتبر سندوں کے ساتھ کتب عامہ وخاصہ میں بہ تفصیل پائی جاتی ہیں۔ ان مناظروں میں آپ کے جوابات اور ان کے علاوہ آپ کے اقوال وارشادات کی شرح ابوابِ علم میں اضافوں کا سرچشمہ ہوسکتی ہے۔ تبرکاً اس مقام پر ہم آپ کے چند ارشادات نقل کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

آپ نے فرمایا:

ـ بعض روایات میں تاریخ ولادت کے ساتھ روزِ جمعہ کی صراحت بھی پائی جاتی ہے ظاہر ہے کہ اس لحاظ سے ۸/اپریل درست نہ ہوگی۔

اَلدِّیْنُ عِزٌ وَالْعِلْمُ کَنْزٌ وَالصَّمْتُ نُورٌ

''دین عزت ہے اور علم خزانہ ہے اور ایسی خاموشی جس سے باطل کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے نور ہے۔''(۱)

''مَنْ اسْتَغْنیٰ بِاللّٰہِ اِفْتَقَرَ النَّاسُ اِلَیْہِ وَمَنْ اِتَّقی اللّٰہَ اَحَبَّہُ النَّاسُ''

''جو معبودِ برحق کے سہارے پر غنی ہوگا سب لوگ اس کے محتاج ہوں گے، اور جو تقوائے الٰہی رکھے گا لوگ اس سے محبت رکھیں گے۔''

''عِزُّ الْمُؤْمِنِ فِیْ غِنَاہُ عَنِ النَّاسِ''

''مومن کی عزت، عام لوگوں سے اس کی بے نیازی میں ہے۔''

اور حضرتِ امامِ جواد علیہ السلام کا یہ جملہ بھی حرزِ جان بنانے کے قابل ہے کہ آج ساری دنیا میں جو وحشت خیزیاں اور دہشت گردیاں ہیں اس کا راز یہی ہے، آپؑ نے فرمایا:

''مَنْ عَمِلَ عَلیٰ غَیْرِ عِلْمٍ ، مَا یُفْسِدُ اَکْثَرَ مِمَّا یُصْلِحُ''

''جو علم کے بغیر عمل کرے گا وہ اصلاح کرنے سے زیادہ تباہی مچائے گا۔''

☆☆☆☆☆

---

(۱) دقیقہ سنج ورقیقہ شناسِ زبانِ تازی امین ناصری (الامیر امین آل ناصرالدین) نے ''دقائق العربیہ'' میں لکھا ہے:

''الصمت و السکوت: ترک التکلمِ مع القدرَۃِ علیہِ ... وَ قِیْلَ اِنَّ السکوتَ اِمساکٌ عَنْ قَوْلِ الحَقِ و الصمتُ اِمساکٌ عَنْ قَوْلِ البَاطِلِ'' (ص۲۵)

حضرت امام ہادی علیہ السلام

دسویں امام حضرت امام علی نقی علیہ السلام تھے۔ جن کا ایک لقب الہادی بھی ہے۔

● آپ کی ولادت اور شہادت کی تاریخیں معتبر مآخذ کے مطابق درج ذیل ہیں:

ولادت: ۵؍رجب ۲۱۴ھ مطابق ۷؍ستمبر ۸۲۹ء بروزِ سہ شنبہ

شہادت: ۳؍رجب ۲۵۴ھ مطابق ۲۷؍جون ۸۶۸ء بروز یکشنبہ بمقام سامراء۔

● آپ کی عمر مبارک تقریباً ۴۰؍برس ہوئی اور عہد امامتِ ظاہری طور پر ۳۴؍برسوں پر محیط رہا، یعنی صرف چھ یا سات برس کی عمر میں آپ نے امرِ امامت و بارِ امانت سنبھالا۔

● اپنے والد بزرگوار کی طرح آپؑ کی حیاتِ طیبہ کا بھی سب سے نمایاں وصف نہایت کم سنی میں علم و آگہی کا ظہور تھا۔ جس کے بہت سے واقعات تذکروں اور تاریخوں میں درج ہیں۔

● آپ کے عہدِ امامت میں عملاً غیر حکومتی سطح پر محروم اور مقہور عوام کی خبر گیری اور ان کی رفاہ کا کام بہت منظم ہوا۔

● آپ نے مختلف شہروں میں اپنے ''وکیل'' معین فرمائے جو آپ کی طرف سے ''امورِ حسبیہ'' کو انجام دیتے، زکاۃ و خمس وصدقات جمع کر کے امام تک پہنچاتے یا امام کے فرمان کے بموجب ان اموال کو دین و ملّت کے کاموں میں خرچ کرتے۔

● آپ سے منقول دین و حکمت کا ادب بہت وافر اور وقیع ہے خصوصاً آپ سے مروی ''زیارت جامعہ'' عرفانِ امرِ امامت کا ایک مکمل نصاب ہے!

حضرت امامِ حسن عسکری علیہ السلام

گیارہویں امام حضرت حسن بن علی العسکری تھے۔

آپ کے اسمِ گرامی کی دوسرے امام جناب سبطِ اکبر حضرت حسن بن علی علیہما السلام کے نامِ نامی سے مطابقت کی وجہ سے آپؑ کے فرزند حضرت امام مہدیِ منتظر علیہ السلام کے بارے میں وارِد احادیث کی تطبیق میں علمائے اسلام میں سے ایک گروہ کو خاصا اشتباہ لاحق ہوا جس کی وضاحت آئندہ صفحات میں آئے گی۔

گیارہویں امام کی ولادت مشہور تذکرہ نگاروں کے مطابق: ۱۰؍ربیع الثانی ۲۳۲ھ مطابق ۴؍دسمبر ۸۴۶ء بروز شنبہ بمقام مدینہ منورہ، اور وفات، ۸؍ربیع الاول ۲۶۰ھ مطابق ۱؍جنوری بروز جمعہ ۸۷۴ء بمقام سامراء ہوئی۔ یعنی آپؑ کی کل عمر مبارک صرف ۲۸؍برس ہوئی اور مدّتِ امامتِ ظاہری کل ۶؍برس رہی۔ لیکن اصولِ کافی کی ایک روایت سے جسے شیخ مفید نے ارشاد میں بھی نقل فرمایا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ کے والد ماجد نے جب آپ کی عمر چار ماہ کی تھی تبھی آپ کے حق میں وصیت فرمادی تھی اور اپنے اصحاب سے آپ کی امامت کا تذکرہ فرمادیا تھا۔

● کم سنی میں علم و اعجاز، عبادت و عصمت اور حکمت و ہدایت کے مظاہر ائمہ دین کے مشترک خصوصیات میں شمار ہوتے ہیں۔ چنانچہ امام حسن عسکری علیہ السلام کی حیاتِ طیبہ سے متعلق روایات میں بھی ایسے متعدد واقعات نقل کیے جاتے ہیں۔

● آپ سے مروی احکام و آدابِ اسلامی علمی مآخذ میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں جنہیں یکجا کرنے اور ان کی تشریح و تفسیر کرنے کی ضرورت باقی ہے۔

● آپؑ کی عملی سیرت میں محروم اور ستم رسیدہ عوام الناس کے لیے رفاہی امور کی تدبیر و تنظیم بہت اہمیت رکھتی ہے۔ آپؑ نے محروم طبقوں کے لیے فلاحی کاموں کے طریق کار کو اپنے آبائے کرام خصوصاً اپنے والد بزگوار کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے مزید استحکام بخشا۔ مختلف شہروں میں اپنے نمائندے مقرر فرمائے۔ انہیں اخذ و صرفِ اموال کی ہدایتیں دیں اور آئندہ کا لائحۂ عمل بھی عطا فرمایا۔

● آپؑ نے اپنے فرزند اور اپنے بعد ہونے والے امام، حضرت مہدیِ منتظر علیہ السلام کے کوائف، اُن کی غیبت اور زمانۂ غیبت میں امورِ دین کے نظم و نسق سے متعلق بھی اپنے اصحاب کو باخبر فرمایا۔ اس سلسلے کی ایک روایت جس کے باعتبار سند معتبر ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے یہاں درج کی جا رہی ہے:

علامہ مجلسی نے بحارالانوار (ج۱ص۱۶۰) میں نقل فرمایا ہے:

[الطالقانی، عن ابی علی بن الهمام قال: سمعت محمد بن عثمان العمری قدس الله روحه يقول: سمعت ابی يقول: سئل ابو محمد الحسن بن علی عليه السلام وأنا عنده عند الخبر الذی روی عن آبائه عليهم عليهم السلام أن الارض لاتخلو من حجة الاسلام خلقه اِلی يوم القيامة وأن من مات ولم يعرف امام زمانه مات ميتة جاهلية. فقال عليه السلام: اِنّ هذا حق كما اَنَّ النهارَ حقٌّ. فقيل له: يابن رسول اللهِ فمن الحجة و الامام بعدک؟ فقال ابنی محمد وهو الامام و الحجةُ بعدي مَن مَاتَ ولم يعرِفْهُ ماتَ ميتَةً جاهلية. أما اِنَّ له غيبة يحار فيها الجاهلون و يهلک فيها المبطلون ويكون فيها الوقاتون ثم يخرج فكانّی انظر الیٰ الاَعلام البيض تخفق فوق رأسه بنجف الكوفة]

خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ امام حسن عسکری علیہ السلام سے اُن کے آبائے معصومین علیہم السلام کی اس حدیث کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ زمین حجتِ خدا سے کبھی خالی نہیں رہ سکتی اور یہ کہ جو اپنے امام زمانہ کی معرفت حاصل کیے بغیر

مر جائے وہ جاہلیت یا کفر کی موت مرتا ہے۔ تو آپ نے فرمایا: یہ حدیث روزِ روشن کی طرح برحق ہے! آپؑ سے پوچھا گیا کہ پھر آپؑ کے بعد حجت و امام کون ہے؟ آپؑ نے فرمایا میرا بیٹا محمد وہی میرے بعد امام اور حجت ہے۔ جو اس کی معرفت حاصل کیے بغیر مر جائے وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔ ہاں! اس کے لیے غیبت ہے! جس میں جاہل مبتلائے حیرت رہیں گے، باطل پرست ہلاک ہوں گے، اس کے ظہور کا وقت معین کرنے والے جھوٹے ہوں گے۔ پھر وہ ظاہر ہوگا۔ جیسے میں نجفِ کوفہ میں اس کے سر پر سفید پرچموں کو دیکھ رہا ہوں۔

اپنے بعد ہونے والے امام، اس دنیا میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی آخری حجت اور حضرتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری وصی وخلیفہ حضرت امامِ مہدیِ منتظر علیہ السلام کی غیبت کے زمانے میں امتِ مسلمہ کا عملی وظیفہ بیان کرتے ہوئے امام حسن عسکری علیہ السلام نے فرمایا:

"فَامّا مَنْ كَانَ مِنَ الفُقَهَاءِ صَائِناً لِنَفْسِهٖ ، حَافِظاً لِدِيْنِهٖ ، مُخَالِفاً عَلیٰ هَوَاهُ، مُطِيْعاً لِاَمْرِ مَوْلَاه فَلِلْعَوَامِ اَنْ يُّقَلِّدُوْهُ" (وسائل، باب۱۰ حدیث۲۰/۳۳۳۸۵)

اور فقہا میں سے جو اپنے نفس کو بچانے والا، اپنے دین کی حفاظت کرنے والا، اپنی ہوا و ہوس کی مخالفت کرنے والا اور اپنے رب کی اطاعت کرنے والا ہو تو عوام کے لیے اُس کی تقلید جائز ہے"۔

یہیں سے نظام اجتہاد و تفقہ کی بنیاد استوار ہوئی اور عام افرادِ امت کے لیے جہالت کی تاریکیوں میں اپنی قوتِ عمل کو برباد کرنے کی بجائے "علمائے دین" یا فقہائے مجتہدین کی تقلید کا سلسلہ شروع ہوا۔

حضرت امام مہدی علیہ السلام

...والخلف الهادی المهدی...

حضرات ائمہ اثنا عشر علیہم السلام میں پہلے امام حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اور آخری امام حضرت مہدیِ منتظر علیہ السلام ہیں ۔ جنہیں دعائے افتتاح کے اس فقرے میں ''والخلف الهادی المهدی'' کے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔

باب امامت وخلافت میں حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی متعدد روایتوں میں عدد اثنا عشر (بارہ) کے حصر کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ اُن میں کے پہلے علیؑ اور آخری مہدی ہوں گے! اس مضمون کی ایک روایت صاحبِ فرائد السمطین نے اِن الفاظ میں نقل کی ہے:

عن عبد الله بن عباس قال قال رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم انا سيد المرسلين و على بن ابى طالب سيد الوصيين وان اوصيائى بعدى اثنا عشر اولهم على ابن ابى طالب وآخرهم القائم المهدى''

(فرائد السمطین ج۲ باب ۶۱ ص ۳۱۳)

''حضرت عبداللہ بن عباس نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں رسولوں کا سردار ہوں اور علی بن ابی طالب وصیّوں کے سردار ہیں اور میرے بعد میرے بارہ وصی ہیں جن کے پہلے علی بن ابی طالب اور آخری قائم

مہدی ہیں!''

حضرت امام مہدی علیہ السلام کی ولادت پر تاریخ کی شہادت موجود ہے۔ اور آپ کی غیبت پر زمانہ چشمِ حیرت بنا ہوا ہے۔ آپ کی ولادت کی تاریخ ۱۵ر شعبان المعظم ۲۵۵ھ (مطابق ۲۸ر جولائی ۸۶۹ء) بتائی جاتی ہے بعض روایتوں میں یہ تاریخ ۱۵ر شعبان ۲۵۶ھ ذکر کی گئی ہے۔ اور لفظ نور کے اعداد کو اس سے تطبیق دی گئی ہے۔

گزشتہ صفحات میں آپ کے والدِ بزرگوار حضرتِ امام حسن عسکری علیہ السلام کے تذکرے میں اِس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ بارہویں امام حضرت مہدیِ منتظر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے بارے میں منقول احادیثِ نبویہ کی تطبیق یا تشریح وتوضیح میں علمائے اسلام کے ایک گروہ کو خاصا اشتباہ صرف آپ کے والد کے اسم گرامی ''حسن بن علی'' ہونے کی بنا پر ہوا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یوں تو آپ کی ذات مبارک پر یقین بلا ریب ضروریاتِ دین میں سے ہے۔ اور یہ عقیدہ تمام ملتِ اسلامیہ کا مشترکہ اور قطعاً غیر مختلف فیہ عقیدہ ہے کہ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسل مبارک سے ایک ''امام'' آخری زمانہ میں یعنی قُربِ قیامت قیام فرمائیں گے، جو ظلم وجور سے پُر اس دنیا کو عدل وانصاف کی دنیا سے بدل دیں گے۔ اور بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں یہ ''ایقان'' ایک عظیم اعتقادی اور ایمانی

قوت ہے۔ پھر بھی علمائے اسلام کے درمیان اِن احادیث کی تطبیق میں دو اہم نقاط پر اختلاف واقع ہوا ہے۔

ایک اس امر میں کہ یہ حضرت امام مہدی سبط اکبر حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام (حسن بن علی بن ابی طالب) کی ذریت سے ہوں گے یا سبطِ اصغر حضرت امام حسین علیہ السلام کی نسل مبارک سے۔

دوسرے اس امر میں کہ آیا آپؑ متولد ہو چکے ہیں حکمِ خدا سے نظروں سے غائب ہیں اور باذنِ خدا قربِ قیامت قیام فرمائیں گے یا آپ قربِ قیامت ہی متولد ہوں گے؟

ان دونوں امور پر بالاستیعاب اور بہت تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے تو بجائے خود ایک مُستقل تالیف وجود میں آجائے گی۔ لیکن اصحابِ فکر ونظر کے لیے حسبِ ذیل مختصر سی بحث ہی انشا اللہ درکِ حقیقت اور واقعیت تک رسائی کے لیے کافی ہوگی۔

پہلا امر کہ حضرت قائم آلِ محمدؐ یعنی امام مہدی منتظرؑ حضرت امام حسنؑ کی ذُرّیت سے ہوں گے یا حضرت امام حسینؑ کی؟ اس بنا پر کوئی مابہ النزاع امر نہیں رہ جاتا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ سلم سے مروی صحیح روایات میں پوری صراحت موجود ہے کہ آپؑ امام حسین علیہ السلام ہی کی نسل مبارک سے ہوں گے۔ البتہ آپ کے والدِ بزرگوار کا نامِ نامی ''حسن بن علی'' ہوگا، یعنی محض تھوڑے سے غور و

تامل اور تفحص کے بعد یہ حقیقت مُنکشف ہو سکتی ہے اور اس اشتباہ یا نزاع کو مکمل طور پر برطرف کیا جا سکتا ہے کہ بعض علما کے حضرت ''ابوالقاسم محمد (المہدی) بن حسن بن علی بن محمد تقی ...... بن حسین بن علی بن ابی طالب'' کو ''ابوالقاسم محمد (المہدی) بن حسن بن علی بن ابی طالب'' سمجھ لینے کے نتیجہ میں یہ اشتباہ ہوا ہے۔

اس باب میں وارد روایات کو بہت سے علمائے اعلام نے جمع فرمایا ہے۔ لیکن اس سلسلۂ تالیفات میں ''القول المختصر فی علامات المہدی المنتظر'' مؤلفہ ''ابی العباس احمد بن محمد بن حجر المکی الہیتمی'' اور کتاب ''البیان فی اخبار صاحب الزمان'' مولفہ امام الحافظ ابی عبداللہ محمد بن یوسف القرشی الگنجی الشافعی بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

دوسرے اُمر میں بھی ___ کہ آنجناب متولد ہو چکے ہیں یا قربِ قیامت متولد ہوں گے ___ محض بعض اہم روایات کو نظر انداز کر دینے یا بعض الفاظ کی تفہیم میں کوتاہی واقع ہو جانے کی بنا پر اختلاف ونزاع کی صورت بن گئی ہے۔ اس لیے کہ صریح احادیث مبارکہ میں ''وقوعِ غیبت'' کی صریح پیشین گوئی موجود ہے۔ اور ''طولِ غیبت'' کی کیفیت بھی بیان کی گئی ہے۔ منجملہ ان روایات کے وہ بھی ہے جسے ہم ائمہ مسلمین کی بارہ کی تعداد اور ان کے ناموں کی تعیین کے سلسلے میں حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے گزشتہ فصل میں نقل کر چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ذاک الذي يغيبُ عَنْ اوليَائه غيبة لَا يثبت على القولِ بامَامته الا من امتحن اللهُ قلبَهُ للايمانِ''

"یہ وہی ہیں جو اپنے چاہنے والوں سے غائب ہو جائیں گے اور
جس کے دل کو خدا نے ایمان کے لیے آزمایا ہوگا صرف وہی اس غیبت
میں ان کی امامت کے قول پر ثابت قدم رہے گا۔"

اس امر کے تصفیہ کے لیے یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جن حدیثوں میں صراحۃً غیبت کی پیشین گوئی نہیں پائی جاتی اُن میں بھی "حتّیٰ یملک" ___ "حتّیٰ یبعث اللہ" ___ حتی یخرج ___ کے الفاظ ہی مکرر آئے ہیں جو سب کے سب ظہور و قیام پر دلالت کرتے ہیں نہ کہ ولادت پر۔

اب چونکہ بارہویں امام حضرت ولیِ عصر علیہ السلام پر ایک مستقل فقرے میں بھی صلوٰۃ وسلام وارد ہوا ہے اس لیے آپؑ سے متعلق بعض نکات اس فقرے کے ذیل میں بھی ذکر کیے جائیں گے۔

☆☆☆

گزشتہ سطور وصفحات میں حضراتِ ائمۂ اہلبیت علیہم السلام کے بارے میں محض تبرکاً و تیمناً چند نکات تحریر کر دیے گئے ہیں۔ وقت اور کتاب کی محدودیّت کے تقاضے کچھ ایسے ہی تھے۔ کسی ایک معصوم کے بارے میں بھی کوئی سیر حاصل بحث ممکن نہ ہو سکی۔ جس کے لیے اظہارِ ندامت، اعترافِ قصور اور طلبِ عفو کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔

یہی ائمۂ اثناعشر، اللہ کے بندوں پر اس کی حجت اور اس کے احکام و اسرار

کے امانت دار ہیں۔ اس موضوع پر آیات واحادیث کی روشنی میں گفتگو کی جائے تو یہ ظرفِ زندگی ناکافی ہوگا۔

ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام کی معصومانہ، ربّانی اور پیمبرانہ زندگیوں کی ایک ایک بات، ایک ایک جزئیات ہمارے لیے قابلِ غور اور سرچشمۂ ہدایت و نور ہے۔

اُتنا ہی سعادت مند ہے وہ جو اُن کے ارشادات اور واقعاتِ سیرت سے جتنا زیادہ مستفید ہو سکے!

ہاں! اس مقام پر جب کہ رسولِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلبیت سے ہونے والے حضراتِ ائمہ اثنا عشر علیہم السلام کا یہ مختصر تذکرہ ایک لحاظ سے اختتام تک پہنچ رہا ہے۔ اِس نکتہ کی وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ نبی خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فوراً بعد ایک طرف پیغام وآثارِ نبوت کو مٹانے یا بدل ڈالنے کا شیطانی اور طاغوتی مکر و منصوبہ پورے زور وشور کے ساتھ شروع ہوا تو دوسری طرف اِن حضرات ائمہ اثنا عشر کی شکل میں ایک کے بعد ایک محافظینِ کتاب وسنت اور بہ اصطلاحِ قرآنی "علمائے قائمین بالقسط" یعنی معارفِ توحید ومعالمِ نبوت ومقامِ ختمِ نبوت اور دین وشریعت کے معصوم امانت داروں کا سلسلہ قائم رہا۔ ۱۱ ہجری سے لے کر ۲۶۰ھ تک اِن بارہ اماموں نے ہر طرح کی قربانیاں دے کر دین وشریعت کے خلاف اٹھنے والے ہر ہر فتنے کو کچل ڈالا۔ اَب کتاب اور دین و شریعت محفوظ ہے۔ اِسے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لیے ظاہری طور پر امامت کا

سلسلہ ختم ہو گیا۔ لیکن ابھی اُس کے عالم گیر نفاذ کا کام باقی ہے اسی لیے ایک امام بھی پردۂ غیب میں ''مہدی منتظر'' کی شکل میں باقی ہے جس کا فیض وجود بادلوں کی اوٹ میں چُھپے ہوئے سورج کی ضیا پاشیوں اور فیض رسانیوں کی طرح جاری و ساری ہے اور جس کا ظہور و قیام اِعلائے کلمہ اور دینِ کے ظہورِ اکمل و اتم کا باعث ہو گا۔

﴿وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ﴾

''اور اللہ اپنے نور کو 'پورا پھیلا کر رہے گا'

خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو!''

(سورۂ صف ٦١، آیت ٨)

ہماری زبان میں چھوٹی بڑی بہت سی کتابیں سیرت و سوانحِ معصومین علیہم السلام کے موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ جن میں واقعات اور حوالوں کی جامعیت اور کثرت کے باوجود ایجاز و اختصار کے لحاظ سے مولانا سید نجم الحسن صاحب قبلہ کراروی مرحوم کی کتاب چودہ ستارے عمومی فائدے کے لحاظ سے بجا طور پر شہرت اور مقبولیت رکھتی ہے۔ لیکن حق و انصاف کی بات یہ ہے کہ رہنمایانِ الٰہی کی لامتناہی زندگیوں کے احوال و آثار کو سمیٹنے کے لیے اور ساتھ ہی ساتھ نگاہِ تحقیق کی خیر گیوں کو دور کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے بلکہ اس باب میں مسلسل لکھا جانا حیات و نجات کی ناگزیر ضرورت ہے!

(۲۵)

عدلِ مُنتظر

اَللّٰھُمَّ وَ صَلِّ عَلٰی وَلِیِّ اَمْرِکَ الْقَائِمِ الْمُؤَمَّلِ وَ الْعَدْلِ الْمُنْتَظِرِ وَ حُفَّهُ بِمَلَائِكَتِكَ الْمُقَرَّبِيْنَ وَ اَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ يَارَبَّ الْعٰالَمِيْنَ۔

''اے معبود! رحمت فرما اپنے ''ذمہ دارِ نظام'' پر (جو اس وقت اپنے منصب پر) قائم (کارفرما، حاجت روا) اور امید گاہِ خلائق ہیں! وہی عادلِ زمانہ جن کا انتظار ہو رہا ہے!! اور انہیں مقرب فرشتوں کی جھرمٹ میں رکھ اور ''روح القدس'' کے ذریعہ ان کی تائید فرما! اے تمام جہانوں کے پروردگار! اے معبود!''

اِس فقرے کو بیت الغزل سمجھنا چاہیے۔ حقیقۃً یہی خلاصۂ دعا اور حرفِ مدعا ہے۔ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپؐ کے اہلبیت سے ہونے والے ائمۂ دین پر فرداً فرداً صلوٰت وسلام کا سلسلہ اَب اُس ذات تک پہنچا ہے جسے استعارۂ قرآنی میں ''بقیۃُ اللہ الاعظم'' اور احادیث نبویہ کی صراحت کے بموجب ''مہدیِ منتظر'' کے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آج اس پندرھویں صدی ہجری یا اکیسویں صدی عیسوی میں، جبکہ مقامِ ختمِ نبوت کے ظہور کو پندرہ صدیاں گزر چکی ہیں، اور حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہلبیت سے ہونے والے بارہ اماموں میں سے گیارہ کا زمانہ بھی گزر چکا ہے، اس لحاظ سے کہ گیارہ امام ظاہری طور پر اس دنیا میں حقیقتِ توحید اور ختمِ نبوت پر اپنی اپنی شہادتیں قائم کر کے وفات پا چکے ہیں، ورنہ یہ بات عرض کی جا چکی ہے کہ اِن میں سے ہر ایک بالکل یکساں حیثیت سے اِس امت کے امام ہیں اور حجت ہیں! اُن کے گزر جانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جیسے آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے پر گزشتہ تمام انبیاء کی شریعتیں منسوخ ہو گئیں، اُسی طرح اِن اماموں کے احکامات منسوخ ہو گئے، تاہم یہ تو ہے ہی

کہ ظاہری طور پر یہ اپنا اپنا عہد پورا کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ بہر حال اب آج کے اُمتی کے لیے مرکزِ امّید، رسولِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری فرزندِ معصوم یعنی بنت رسولؐ حضرت زہرائے مَرضیہ سلام اللہ علیہا کی خنکیِ چشم ___ جُملہ انبیاء و ائمہ کے آخری وارث ___ الخلف الهادی المهدی ___ الخلف الصالح ___ مہدیِ موعود و مہدیِ برحق ___ امام منتظر ___ بقیۃ اللہ الاعظم ___ حضرت ابوالقاسم م ح م د بن الحسن ___ ابن الحسین ___ ابن علی بن ابی طالب ___ عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف ہی کی ذاتِ گرامی ہے! اور اس فقرے میں انہیں کی ذاتِ بابرکات پر افاضۂ رحمت کی درخواست ہے۔

اس فقرے کی شرح یا حضرت مہدیِ منتظر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے تعلق سے کچھ بھی عرض کرنے سے پہلے یہ صراحت پھر ضروری معلوم ہوتی ہے کہ حقیقۃً آپ کی ذات مبارک پر یقینِ بلا ریب ضروریاتِ دین میں سے ہے اور یہ عقیدہ تمام ملتِ اسلامیہ کا مشترک اور قطعاً غیر مختلف فیہ عقیدہ ہے اور ایک عظیم اعتقادی اور ایمانی قوت ہے، جسے اَب ادھر بعض سیاسی اور مادّی اغراض کے تحت کچھ لوگ اختلافی بنا رہے ہیں اور اسے صرف ایک مسلک سے وابستہ لوگوں کا عقیدہ قرار دے رہے ہیں۔

آپؑ کی ذات وہ مرکزِ امید، موعودِ مشیّت اور امانت دارِ عدلِ الٰہی ہے جس کے متعلق قرآنِ مجید میں بھی متعدد مقامات پر واضح اشارات پائے جاتے ہیں۔ اَحادیثِ صحیحہ اور روایاتِ معتبرہ میں بھی صریح پیشین گوئیاں موجود ہیں اور تاریخ بھی اپنے مشاہدہ کی بنا پر اس وجودِ مقدس کی تصدیق پر مجبور ہے۔ اس سلسلے میں تفصیلی مباحث اور دلائل، اِس عاجز و قاصر نے ''الباب الثانی عشر'' کے عنوان سے

علیحدہ کتابی صورت میں تحریر کیے ہیں۔ اس مقام پر صرف چند آیات و روایات کے تذکرے پر اکتفا مناسب معلوم ہوتی ہے۔

قرآنِ مجید میں حضرت مہدیِ آخرالزماں یا قائم آلِ محمد علیہ وعلیہم الصلاۃ والسلام کے وجودِ مبارک، غیبت، طولِ عمر، ظہور اور قیامِ سلطنت وغیرہ مباحث پر کہیں تشبیہ و تمثیل و تنظیر کے پیرایہ میں اور کہیں استعاراتی اسلوب میں جو قرآنِ مجید کے مخصوص اسالیب ہیں، کافی و وافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بعض علماء نے اِس موضوع پر مستقل رسالے تالیف فرمائے ہیں۔ مثلاً حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید صادق الحسینی الشیرازی کا مشہور رسالہ ہے ''المہدی فی القرآن'' اسی طرح اور بھی متعدد تالیفات ہیں جن کے نام کتبِ فہارس میں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔

اس باب میں تمام تفسیری روایات اور ''تاویلاتِ ماثورہ'' پر نظر ڈالنے کے بعد راقم کا معروضہ یہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق جتنی آیتوں کی نشاندھی روایتوں میں پائی جاتی ہے ان کو تین قسموں میں منقسم کرسکتے ہیں۔

۱۔ وہ آیتیں جو براہِ راست اِس موضوع پر روشنی ڈالتی ہیں۔

۲۔ وہ آیتیں جو بطورِ التزام یا تضمّن اس موضوع پر روشنی ڈالتی ہیں۔

۳۔ وہ آیتیں جو کسی نہ کسی جہت سے واقعاتی ربط و مناسبت رکھتی ہیں۔

مثلاً :

(۱) سورۂ مبارکۂ زخرف (۴۳ویں سورہ) کی اکسٹھویں آیت اپنے مضمون کے لحاظ سے براہِ راست اِس موضوع پر روشنی ڈالتی :

﴿وَ اِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَ اتَّبِعُوْنِ هٰذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيْمٌ﴾

''اور وہ یقیناً قیامت کی نشانی ہیں، تم ان میں ہرگز شک نہ کرو اور میری پیروی کرو، یہی صراطِ مستقیم ہے۔''

سورے میں اس آیت سے قبل حضرت عیسیٰؑ کا تذکرہ ہے۔ اس لیے اس آیت میں بھی ''قیامت کی نشانی'' اُنہیں کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ صحیح بخاری کی یہ حدیث شریف بھی سامنے رکھنی چاہیے جس میں حضورؐ نے فرمایا ہے:

''وَ كَيْفَ اَنْتُمْ اِذَا نَزَلَ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ فِيْكُمْ وَ اِمَامُكُمْ مِنْكُمْ''

''اور تمہارا حال کیا ہوگا جب تمہارے درمیان عیسیٰؑ بن مریم نازل ہوں گے اور تمہارا امام تمہیں میں سے ہوگا!''

یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام نازل تو ہوں گے۔ مگر ''امرِ امامت'' حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ''اُمّتی'' کے ہاتھوں میں ہوگا۔ اور دوسری ''صدہا'' صحیح السند احادیث کی روشنی میں یہ بھی ثابت ہے کہ وہ ''اُمّتی'' کوئی عامی نہیں بلکہ عترت و ذریّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی سے ہوگا۔ مثلاً علامہ ابنِ حجر مکّی صواعق محرقہ (ص ۹۶) میں اسی آیت کریمہ ﴿وَ اِنَّهُ لَعِلْمٌ لِلسَّاعَةِ﴾ کے بارے میں مقاتل بن سلیمان وغیرہ سے نقل کرتے ہیں کہ یہ آیت حضرت مہدیؑ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یا فرائد السمطین (ص ۴۴۷) میں شیخ ابو اسحاق ابراہیم بن یعقوب کی سند سے حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے یہ ارشاد پیغمبرؐ نقل ہوا ہے :

''مَنْ اَنْكَرَ خُرُوْجَ الْمَهْدِي فَقَدْ كَفَرَ بِمَا اُنْزِلَ عَلٰى محمد وَ مَنْ اَنْكَرَ نُزُوْلَ عِيْسٰى فَقَدْ كَفَرَ''

''جو مہدی کے خروج کا انکار کرے وہ منکر، کافر ہے اس بات کا جو محمدؐ پر نازل ہوئی، اور جو نزولِ عیسیٰ کا انکار کرے وہ بھی کافر ہے۔''

اس کے علاوہ اِن الفاظ میں وارِد ارشادِ نبویؐ کے سلاسل وطُرُقِ روایت کا اِحصا کرنے کے لیے تو ایک دفتر درکار ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''لَا تَقُوْمُ السَّاعَةُ حَتّٰى يَمْلِكَ رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ بَيْتِي''

''اس وقت تک قیامت برپا نہیں ہوگی جب تک کہ میرے اہلِ بیت میں سے ایک مرد سلطنت قائم نہ کرلے گا۔''

''لَوْ لَمْ يَبْقَ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا يَوْمٌ لَبَعَثَ اللّٰهُ تَعَالٰى رَجُلٌ مِنْ اَهْلِ بَيْتِي''

''اگر اس دنیا کی مدت میں کچھ بھی باقی نہ رہے سوائے ایک روز کے تب بھی یقیناً اللہ تعالیٰ میرے اہلِ بیت میں سے ایک فرد کو ضرور مبعوث فرمائے گا۔''

(۲) سورۂ مبارکہ قصص (۲۸ویں سورے) کی پانچویں آیت بھی اس موضوع پر خوب روشنی ڈالتی ہے۔ تأویلی جہت سے تو یہ آیت براہِ راست اسی موضوع سے متعلق ہے ہی۔ اگر ''تأویلِ مأثور'' ___ یعنی امام معصوم سے مروی تفسیر وتاویل موجود نہ ہو تب بھی التزامی طور پر یہ آیت ''قیامِ قائم آلِ محمدؐ'' کے عقیدے کی ہر لحاظ سے تأئید کرتی ہے۔

﴿وَنُرِيْدُ اَنْ نَمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً وَ نَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِيْنَ﴾

''اور ہم ارادہ رکھتے ہیں کہ جو لوگ روے زمین پر کمزور بنادیے گئے ہیں ان پر احسان کریں اور انہیں کو امام بنائیں اور انہیں کو (اس زمین کا) وارث قرار دیں''۔

اہلِ فقہ وفہم کے لیے تو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ یہاں کمالِ صراحت وحسن بیان بھی قابلِ توجہ ہے، بہ شہادتِ کربلا، حضرات آلِ محمد علیہم السلام سے زیادہ اس روے زمین پر کسے کمزور بنایا گیا اور کس کی حق تلفی ہوئی۔ چنانچہ جب ارادۂ الٰہیہ یہی ہے کہ جنہیں روے زمین پر کمزور بنایا گیا ہو اُنہیں کو امامت یا امارت اور زمین کی وراثت عطا فرمائی جائے تو پھر اس ارداہ کا اپنے نمایاں ترین اور قطعاً غیر مشتبہ مصداق کے شامل حال ہونا کیا لازمی نہ ہوگا؟ جو کہ حضرات آلِ محمد علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ ہیں۔ اور جن کی حق تلفیوں کا مداوا حضرتِ قائم آلِ محمد کی سلطنت کے قیام کے علاوہ کسی اور صورت سے متصور نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ ائمہ دین علیہم السلام سے مأثور تفسیر میں اس آیت کو حضرتِ ''مہدیِ منتظر'' عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف ہی سے متعلق قرار دیا گیا ہے۔

(۳) سورۂ مبارکہ ق کی یہ آیت کریمہ: ﴿بَقِيَّةُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ﴾ حضرت ''مہدیِ منتظر'' علیہ السلام کے ظہور سے واقعاتی مناسبت رکھتی ہے۔ روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جب آپؑ کا ظہور ہوگا تو آپ لوگوں کے سامنے خطاب کرتے ہوے اس آیت کی تلاوت فرمائیں گے۔ اس ''شانِ تلاوت'' میں ''بقیّۃُ اللہ'' کے قرآنی الفاظ میں پائے جانے والے مفہوم کا روشن ترین مصداق آپؑ کی ذاتِ گرامی قرار پائے گی!

☆☆☆

دُعائے افتتاح کے زیرِ غور فقرے میں ایک ایک لفظ ابوابِ معرفت کی کلید ہے۔

ولیِ اَمرِ کَ ، القائم المؤمَّل، العدل المنتظَر ، یہ تمام القاب امام مہدیِ آخرالزماں علیہ السلام کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔اور ساتھ ہی بہت سے اسرارِ مشیت سے بھی پردے اٹھاتے ہیں۔

"ولیِ اَمرِکَ" کا فقرہ کس قدر معنی خیز اور اسرار کشا ہے اس کا کچھ اندازہ اس کی ترکیب پر غور کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے۔یعنی غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس میں اُمر کی اضافت مؤمنین، مسلمین یا انسانوں کی طرف نہیں ہے، یعنی ولیِ امرِ مؤمنین یا ولیِ امرِ مسلمین یا ولیِ امرِ عالمین نہیں کہا جا رہا ہے، "ولیِ امرِ کَ" یعنی "ولیِ امرِ خدا" _ ذمہ دارِ کار بشر نہیں ذمہ دارِ کار خدا!!! اللہ اکبر!

یہ فقرہ قرآنِ مجید کی آیت ﴿وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ﴾ کی وضاحت بھی کردیتا ہے۔کہ وہاں بھی اُولِي اَمرکُمْ نہیں "اُولِي الاَمرِ مِنکمْ" ہے۔تم میں سے جو "اس خاص امر کے حامل ہیں" نہ کہ جنہیں تم اپنا امر سپرد کردو ___ یہ امرِ الٰہی ہے امانتِ الٰہی ہے، خلافتِ ناس نہیں خلافتِ الٰہیہ ہے!!

"القائم المؤمّل"

مہدیِ آخرالزماں، خلیفۃُ الرحمان، امام مُنتظَر علیہ السلام کا یہ لقب (القائم المؤمّل) بھی بجائے خود حشر بداماں، جہانِ اسرار و معانی کا حامل وصف و لقب ہے!

مشہور فلسفی، عارف اور فقیہ ملا ہادی سبزواری نے لفظ و لقبِ قائم سے متعلق ایک اہم نکتہ "اسرارِ الحکم" میں تحریر فرمایا ہے جو قابلِ نقل و بیان ہے۔

"صیغِ قیوم و قائم و قیامہ از یک مادہ مأخوذ ند، و قیوم مُبالغۂ قائم است

وقائم اسمِ فاعل است و قیامہ مصدرِ قائم است، و چوں مبدأ غنی باشد خود علتِ غائیۂ فعلِ خود است! و قیامہ قیام عنداللہ است بعد از آنکہ قیام عندالنفس بودہ، پس قیامتِ کبریٰ کہ نہایتِ سلسلۂ طولیۂ صعود یہ غایتِ ظہورِ قائم باشد و تا قیام قائم بالحق نشود قیامت قیام نکند۔"

حضرت مولانا سبزواریؒ نے جو کچھ فرمایا اس کی تشریح و توضیح ایک مستقل دفتر کی طلب گار ہے۔فہمِ عوام کے لیے اِس کا خلاصہ بس اسی قدر عرض کیا جا سکتا ہے کہ لفظی اعتبار سے بھی قیام، قیامت، قیوم اور قائم وغیرہ کلمات ایک ہی مادّے سے ہیں۔اور معنوی لحاظ سے بھی، واقعاتی حقائق کے اعتبار سے بھی اور اسرارِ مشیت کے تعلق سے بھی حضرت قائم آلِ محمدؑ کے وجود و ظہور میں اور قیامِ قیامت میں ایک گہرا تعلق ہے جسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معروف حدیث شریف میں بھی بیان کیا گیا ہے کہ:

"لَا تَقُوْمُ السَّاعَۃُ حَتّٰی یَمْلِکَ رَجُلٌ مِنْ اَھْلِ بَیْتِیْ"

"اس وقت تک قیامت برپا نہیں ہوگی جب تک کہ میرے اہلِ بیت میں سے ایک مرد سلطنت قائم نہ کرلے گا۔"

اسی مقام پر جی چاہتا ہے کہ ملا ہادی سبزواریؒ کا یہ گرانبہا جملہ بھی نقل کردیا جائے انہوں نے لکھا ہے:

"شهودُهُ لِلّٰهِ ذِکریٰ وَ قِیامُهُ لِلقیامَهِ بُشریٰ"۔

"ان کا شہود اللہ کی یاد دلاتا ہے اور ان کا قیام قیامت کی بشارت دیتا ہے"۔

اس جملہ کی لطافتِ ظاہری و باطنی کے پیشِ نظر اسے "احادیثِ برزخیہ" میں شمار کرنا تجاوز نہ ہوگا۔جس طرح محقق طوسیؒ کا یہ جملہ کلامی نقطۂ نظر سے ایک

دیوانِ مطالب ہے کہ:

"وجودہُ لطفٌ وَ تصرفُہُ لطفٌ آخر و عَدَمُہُ مِنّا"۔

''ان کا وجود سراسر لطفِ ربّانی ہے، ان کا فیضانِ تصرف یا لطفِ ہدایت، لطفِ مزید ہے اوران کا عالمِ شہود میں نہ ہونا ہماری ہی بے بصری کی بنا پر ہے۔''

اسی طرح ملا ھادیؒ کا یہ جملہ عرفانی زاویۂ نظر سے ایک مکمل دفترِ دل سمیٹے ہوے ہے۔

☆☆☆

''والعدل المنتظر'' کا جملہ واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس مشہور ارشادِ گرامی کی طرف ناظر ہے:

''وَیَمْلأُ الارْضَ قِسْطاً وَ عَدْلاً کَمَا مُلِئَتْ ظُلْماً وَجَوْراً''

''اور وہ زمین کو عدل و انصاف سے اُسی طرح پُر کر دے گا جس طرح وہ ظلم و جور سے پُر ہو چکی ہوگی!

اس کے بعد جو دعا کے جملے ہیں وہ گویا حضرت قائمِ آلِ محمدؑ سے وفاداری کے عہد و پیمان ہیں، اُن سے وابستگی کا اعلان ہیں!

☆☆☆☆☆

(۲۶)

کتابِ رحمت

قرآن کریم یا آئینِ دین و دستورِ خلافت

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْہُ الدَّاعِیَ اِلیٰ کِتَابِکَ وَالْقَائِمَ بِدِیْنِکَ اِسْتَخْلِفْہُ فِي الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفْتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہٖ مَکِّنْ لَہٗ دِیْنَہُ الَّذِي ارْتَضَیْتَہٗ لَہٗ اَبْدِلْہُ مِنْ بَعْدِ خَوْفِہٖ اَمْناً یَعْبُدُکَ وَلَایُشْرِکُ بِکَ شَیْئاً۔

''اے معبود! انہیں اپنی کتاب کی طرف بلانے والا، اور اپنے دین کے ساتھ ''قیام'' کرنے والا قرار دے! اور انہیں زمین پر اسی طرح خلافت عطا فرما جس طرح ان سے پہلے والوں کو عطا فرمائی، اور ان کے لیے اسی دین کو مقتدر بنا دے جس کو تو نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے! تو ان کے خوف کو امن سے بدل دے کہ وہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کسی شے کو وہ تیرا شریک نہیں بناتے!!''

دُعائے افتتاح کا یہ فقرہ کئی مطالب اور موضوعات کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جن میں سے پہلا موضوع کتابِ رحمت و کتابِ حق کی عظمت و اہمیت یعنی قرآن شناسی کا موضوع ہے۔

• قرآن کریم جورب اکبر کا لطفِ عمیم اور احسانِ عظیم ہے، جو سراسر کتابِ رحمت ہے اور حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سَنَدِ نبوت ونشانِ خاتمیت ہونے کی حیثیت سے زندۂ جاوید معجزہ ہے۔ یہی وہ دستورِ حیات ہے جو انسان کو فردوسِ نجات اور ابدیت و بقاعطا کرنے والا ہے۔ چنانچہ یہی حضرت مہدیِ منتظر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کا دستورِ حکومت ہوگا۔ ایک مسلمان کی مقامِ دعا میں اس سے بڑی سعادت مندی نہیں ہوسکتی کہ وہ ربِ کریم سے قرآن کریم کی طرف دعوت دینے والے رہبرِ معصوم کے قیام وظہور کی دُعا کرے اور خود قرآنِ کریم پر مکمل ایمان اور اس کے احکام و آداب پر بہ کمالِ رغبت وشوق عمل پیرا ہونے کی استعداد پیدا کرے۔

• یہی قرآن شرفِ انسانی کا سب سے بڑا ضامن ہے۔ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں یہ سب سے بڑا معجزہ ہے۔ عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ آپ کا ''قولی معجزہ'' ہے۔ لیکن یہ ناچیز عرض کرتا ہے کہ آپ کا یہی قولی معجزہ اپنی بقا کے لحاظ سے آپ کا عظیم ترین ''فعلی معجزہ'' بھی ہے۔

• یہی قرآن ہے جس سے تمسک کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور ائمہ دین علیہم السلام نے طرح طرح سے وصیتیں فرمائی ہیں۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک مشہور وصیت تو وہ ہے جو حدیثِ ثقلین کے نام سے جانی جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

''اِنی تارکٌ فیکم الثقلین کتَابَ اللهِ و عترتی اهل بیتی''

''میں تمہارے درمیان اللہ کی کتاب اور اپنی عترت اپنے اہلِ بیت کو چھوڑ رہا ہوں!''

یہ حدیث سند ومتن سے متعلق تمام فنی مباحث اور اپنے دامنِ معنی میں سمٹی ہوئی تمام عرفانی حقیقتوں سے عُہدہ برا ہونے کے لیے مستقل توجہ کی طلب گار ہے۔ آخر خاتم الانبیاء کی ''وصیت'' ہے!!

• علامہ بہائی نے نَاطِق و صامت کے معانی بیان کرنے کے ضمن میں اپنی کشکول میں ایک اور حدیث نقل فرمائی ہے جو ان الفاظ میں ہے:

''اِنِّی تَرَکْتُ فِیْکُمْ وَاعِظَیْنِ صَامِتاً وَ نَاطِقاً، فَالصَّامِتُ الْمَوْتُ وَالنَّاطِقُ الْقُرآن''

(کشکول بہائی نسخۂ خراسان، طبع نجف ج ٣ ص ٣٢)

''میں نے تمہارے درمیان موعظہ کرنے والی دو چیزیں چھوڑی ہیں ایک صامت ہے اور ایک ناطق، صامت موت ہے اور ناطق قرآن!''

اس مقام پر لفظِ صامِت اور ساکِت کا ایک دقیق فرق قابلِ ذکر ہے اربابِ لغت نے بیان کیا ہے کہ صامت اُسے کہتے ہیں جس سے کسی باطِل مُراد و معنی کا استفادہ نہ کیا جا سکے اور ساکت محض خموش یا بے حرکت و بے آواز شے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور جو شے کسی شے کی رہنمائی کرے وہ اس پر ناطق کہلاتی ہے چاہے وہ اس پر سُنائی دینے والی آواز کے ذریعہ رہنمائی نہ کرے۔[1]

• یہی قرآن ہے جو اپنے مستحکم براہین، روشن معانی، محفوظ آیات اور حقائقِ حیات و کائنات پر بے شائبۂ خطا دلالت و رہنمائی اور ہر طرح کی تحریف و تشکیک سے مأمون و مصون ہونے کی وجہ سے قیامِ قیامت تک انسانی مسائل کے حل و فصل کا سب سے بڑا سرچشمہ اور ہر لحاظ سے ''حُجّت'' ہے!

• بلاشبہ یہی قرآن تمام اصولِ قوانین کا سب سے بڑا مآخذ ہے۔ اور

ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَارَیْبَ فِیْهِ هُدیً لِلْمُتَّقِیْنَ ! (البقرہ/۲)

''یہ وہ مجموعۂ کلامِ الٰہی ہے جس میں کسی بھی تشکیک کا گزر نہیں ہے، ہدایت ہے پرہیزگاروں کے لیے...''

اِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ وَ یُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِیْنَ... (بنی اسرائیل/۹)

''بے شک یہ قرآن اُس راستے کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے مُحْکَم ہے، اور بشارت دیتا ہے اہلِ ایمان کو...''

﴿لَایَاتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ﴾ (فصلت/۴۲)

[1] ''کل ما دل علیٰ شیئ فهو ناطق علیه و ان لم یکن بالصوت المسموع'' (کشکول ج۱ص۴۱)

''اس میں کہیں باطل کی سمائی نہیں ہے، نہ اس کے سطور میں نہ بین السطور میں۔''

﴿تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ﴾ (سورۂ فصلت ۴۱/۴۲)

''یہ وحی ہے صاحبِ حکمت اور شایانِ مدحت پروردگار کی!!''

☆☆☆

• حقائق ناشناس افراد قرآن کریم میں تحریف کے شبہات کا ذکر کرتے ہیں۔ جبکہ قرآن کریم ہر طرح کی تحریف سے محفوظ رہا۔ حوزۂ علمیہ قم کے عصرِ حاضر کے عظیم استاذ حکمت و عرفان اور فقیہ ذیشان علامہ ذوفنون آیۃ اللہ حسن حسن زادہ آملی اس باب میں یہاں تک فرماتے ہیں کہ:

''در قرآنِ کریم بہ ہیچ وجہ و ہیچ نحو تحریفی نشدہ این قرآن بین دفتین کہ اول آن فاتحہ و آخر آن ناس است ہمانی است کہ بر خاتم (ص) اِنزالاً و تنزیلاً وحی شدہ است و ترتیبِ سور و آیات ہمہ بفرمان حق سبحانہ است و اگر کسی خلاف این حکم را مدعی است علاوہ این کہ رسالہ ای در ردِّ آن نوشتہ ام و براہین قاطعہ آوردم، با چنان کس بمباہلہ حاضرم!''

(حسن زادہ آملی، ہزار و یک نکتہ، نکتہ ۱۰۹ ص ۱۰۲ ط ۳ ۱۳۷۲ھ ش)

خلاصۂ تقریر یہ ہے کہ یہ قرآن آج جس کمیت و کیفیت کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے، اِنزالاً و تنزیلاً یہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی فرمایا گیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ استاذ حسن زادہ آملی کے نزدیک اِس پر براہینِ قاطعہ موجود ہیں بلکہ وہ اس حقیقت کے منکر سے مباہلہ بھی کرنے کے لیے تیار ہیں!

اِس مختصر سی تقریر سے بحث و تحقیق کے بہت سے دروازے کھلتے ہیں۔

سب سے پہلے قرآن کریم کی جمع آوری کے بارے میں نقل کی جانے والی وہ روایتیں زیرِ سوال آتی ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد زید بن ثابت کے ذریعہ جمع وتالیفِ قرآن کی سرکاری کوششوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے تحقیق کرنے پر اس سلسلے کی تمام روایتیں بے سروپا افسانہ سے زیادہ وقعت کی حامل نظر نہیں آتیں! ہاں یہ ضرور ہے کہ وصیِ رسول حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے اشاراتِ وحی کے تابع فرامین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق قرآن مجید کے منتشر ٹکڑوں کو یکجا کر کے دو دفتیوں کے درمیان جمع فرمایا۔ اربابِ سیاست، دشمنانِ دین، منافقین، یہود ومشرکین اور نہ جانے کتنے عاقبت ناشناسوں، باطل پرستوں، خدا بیزاروں نے قُرآن کریم میں تحریف کی کوششیں کی ہوں گی، بلکہ تاریخی کوائف اور بیانات کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے تحریفِ کتاب کی کوششوں میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا لیکن اُن کی کوششیں وصی برحق حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ہوتے ہوئے کسی بھی صورت بار آور نہ ہوسکیں! انہوں نے قرآن پر آنے والی تمام آفتوں کو اپنی جان پر لے لیا مگر اسے ہر طرح محفوظ رکھا! ۲

☆☆☆

دُعائے افتتاح کے زیرِ غور فقرے میں دوسرا موضوع استخلاف ہے! یہ بھی توجہ طلب ہے کہ دعا کا یہ جملہ اور اس کے بعد کا جملہ سورۂ مبارکۂ نور کی ۵۵ ویں آیت سے ماخوذ ہے:

"وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ

اس صفحہ کے حواشی صفحہ ۳۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں۔

دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا يَعْبُدُوْنَنِيْ لَايُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْئًا"

آیتِ مبارکہ میں کہا گیا ہے کہ اللہ نے ایمان لانے والوں اور عملِ صالح کرنے والوں سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اُنہیں روے زمین پر یقیناً اپنا خلیفہ بنائے گا جس طرح پہلے والوں کو بنایا، اور ان کے لیے اس دین کو جسے ان کے لیے پسندیدہ قرار دیا ہے، اقتدار ونفوذ کامل عطا فرمائے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا وہ صرف معبودِ برحق ہی کی عبادت کریں گے اور کسی طرح کا شرک نہیں کریں گے۔"

دعا کے جملوں میں اور اس آیت کے مضمون میں جو مطابقت پائی جاتی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ تاہم اصل مضمون کی وضاحت مزید چند آیات واحادیث پر نظر ڈالنے کی متقاضی ہے۔ جن میں آیتِ اکمال دین (سورۂ مائدہ آیت ۳) آیتِ خلافتِ آدمؑ (۲/۳۰)، آیتِ خلافتِ داوٗدؑ (۳۸/۲۶) آیتِ استخلافِ ہارون (سورۂ اعراف ۷/۱۴۲) خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔ اور ان تمام آیات کا ربط موضوعِ خلافت سے واضح ہے لیکن ایک خصوصی تعلق خلافتِ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی ہے، جس کی وضاحت بعض روایتوں سے ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پروردگار کی خالص ترین عبادت جسے مطلقاً اور حقیقۃً عبادت ہی کہا جاسکے انبیاء اور ائمہ کے علاوہ کسی سے ممکن نہیں ہے اور اسی طرح پروردگار کی وحدانیتِ حقیقیہ اور وحدتِ مُطلقہ کا واقعی ادراک اور کامل علمی اور عملی اعتراف واقرار بھی کسی نبی، رسول یا امام معصوم ہی سے ممکن ہے۔ اُن کے علاوہ کوئی بھی اس شانِ عبادت واقرارِ توحید ونفیِ شرک کا حق ادا نہیں کرسکتا۔ اور اسی لیے ہم گواہی دیتے ہیں کہ:

"یعبدکَ و لا یشرک بِکَ شیئاً"

"وہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور کسی شئی کو وہ تیرا شریک نہیں بناتے!"

یہ اِن کے مقامِ عصمت کبریٰ کی گواہی کے مترادف بھی ہے!

۱؎ ان روایات کی تحقیق میں سب سے مستند اور غالباً سب سے بڑا کام حضرت آیۃ اللہ العظمیٰ سید ابو القاسم الخوئی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کی کتاب البیان فی تفسیر القرآن ہے۔ جس کا اردو ترجمہ حبیبِ مکرم حجۃ الاسلام والمسلمین مولانا شفا نجفی صاحب مدرس جامعہ اہلِ بیت اسلام آباد پاکستان نے فرمایا ہے۔

۲؎ چونکہ اس فصل میں قرآن شناسی کا عنوان قائم ہوگیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ علوم القرآن کے متعلق بھی چند نکات یہاں پر ذکر کردیے جائیں۔

"علومِ قرآن" کے ضمن میں کتنے اور کون کون سے علوم شمار کیے جاسکتے ہیں یہ بحث بھی بہت پیچیدہ ہے۔ اس لیے کہ اولاً "علوم القرآن" کی تعریف ہی میں بحث کی گنجائش ہے کہ یہ عنوان آیا اُن علوم کے لیے مخصوص رکھا جائے جو تلاوت وفہمِ قرآن میں مددگار ہوتے ہیں یا اُن علوم کے لیے جن کا سرچشمہ ہی قرآن مجید ہے یعنی جن علوم کا سراغ نزولِ قرآن سے پہلے نہیں ملتا اور وہ قرآن مجید ہی کے بطون سے پیدا ہوئے ہیں! پھر اگر یہی معیار قرار دیا جائے، جواب تک بیشتر مصنفین نے اختیار کیا ہے کہ علوم القرآن میں وہ علوم آتے ہیں جو مسلمانوں نے تلاوت وفہم کے مشکلات حل کرنے کے لیے مدون کیے ہیں تو علمِ نحوِ عربی کو بھی اسی عنوان کے تحت شمار کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ اس کی ابتدا حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کے حکم سے آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت میں غلطیوں سے بچنے ہی کے لیے ہوئی تھی۔

● یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بیشتر بلکہ تمام تر علوم قرآن کی تدوین کا آغاز حضرت امیر المؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام اور دیگر ائمہ اہلبیت علیہم السلام نے فرمایا۔ اور انہیں ائمۂ اطہار سے وابستہ صحابہ وتابعین وتبع تابعین نے اِن علوم کو فروغ بخشا۔ بالخصوص:

(۱) علمِ تجویدِ قرآن:

متفق علیہ اور مسلمہ حقیقت ہے کہ قرآن مجید کی تجوید اور تلاوت کے فن کی اَساس حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کا یہ ارشادِ گرامی ہے:

"الترتیل هو حفظ الوقوف و بیان الحروف"

"ترتیل کے معنیٰ اوقاف کی پابندی اور حروف کی صحیح ادائیگی کے ہیں۔"

اس کے بعد توغل وتفنن بڑھتا رہا اور لوگ اس فن میں کتابیں لکھتے رہے۔

(۲) علمِ اعراب القرآن:

یہ بھی ایک متفق علیہ اور مسلم حقیقت ہے، جس کی طرف ابھی ذرا ہی قبل اشارہ کیا گیا کہ اعراب القرآن کی اساس حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام ہی نے رکھی اور ابو الاسود دُئیلی کو علم الاعراب یا علم النحو کی مستقل تدوین وتألیف پر مأمور فرمایا جو کلمات آپ نے اساسِ فن کے طور پر ارشاد فرمائے وہ یہ تھے:

"الکلام کله ثلاثة اشیاء، اسم و فعل و حرف، فالاسم ما انبأ عن المسمیٰ والفعل ما انبئ عن حرکة المسمیٰ به والحرف ما اوجد معنیً فی غیره وان الاسماء ثلاثه، ظاهر و مضمر و اسم لا ظاهر ولا مضمر.

والفاعل مرفوع و ماسواه فرع علیه والمفعول منصوب وماسواه فرع علیه والمضاف الیه مجرور و ماسواه فرع علیه"

اسی طرح علم القرآت، علم غریب القرآن، معانی القرآن، مجاز القرآن، احکام القرآن، فضائل القرآن، اسباب النزول، تفسیر القرآن، تاویل الآیات غرض قرآن مجید سے متعلق مختلف علوم وفنون دست ائمہ و اصحابِ ائمہ سے مدون ہوئے، جن میں حضرت اُبی بن کعب (فضائل القرآن) حضرت جابر بن عبداللہ انصاری، حضرت عبداللہ بن عباس، ابان بن تغلب، یحیٰی بن زیاد الفراء، محمد بن السائب وغیرہ کو تدوین وتالیف میں اولیت کا شرف حاصل ہوا۔ ان کے بعد عہد بہ عہد مختلف علماء، عرفاء اور مشتغلین تنویع وتفریع وتدوین وتالیف میں اضافہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ انتہائی ضخیم کتابیں تالیف ہوئیں جن میں "الاتقان فی علوم القرآن" (تالیف علامہ جلال الدین سیوطی) کو یقیناً ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔

ہمارے عہد میں علوم القرآن کے مباحث میں بعض نئے ابواب جدید تجرباتی علوم کے بعض ماہرین نے اضافہ کیے ہیں۔ ان میں بھی بطورِ خاص وہ ماہرین قابلِ ذکر ہیں جو قرآن مجید ہی کے فیضانِ ہدایت سے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے ہیں مثلاً فرانس کے مشہور سائنس داں موریس بوسیل (Mouries Bucille) یا بعض ترکی کے علماء مثلاً ڈاکٹر ہلوک نور باقی وغیرہ۔

● علامۂ بہائی شیخ الاسلام ابو الفضائل بہاء الدین محمد بن الفقیہ الشیخ حسین العاملیؒ معروف بہ شیخ بہائیؒ صاحبِ کشکول نے "بیان ما اشتمل علیہ القرآن المجید" کے عنوان سے یہ تفصیل فراہم کی ہے کہ قرآن مجید میں کل کتنے الفاظ، کتنے حروف اور حروفِ ہجا میں سے کون کون سے حرف کتنی بار استعمال ہوئے ہیں۔ اس باب میں خاصا اختلاف ہے کہ "قرآن مجید میں حرف شماری" کا کام سب سے پہلے کس نے انجام دیا۔

بیان ما اشتمل علیه القرآن المجید:

الکلمات	الحروف	الالفات	الباآت	التاآت
۷۶۴۳۰	۷۲۲۳۳۲	۴۰۷۹۲	۱۱۴۰	۱۲۹۹

الثاآت	الجیمات	الحاآت	الخاآت	الدالات
۱۲۹۱	۳۲۹۳	۱۱۷۹	۲۴۱۹	۴۳۹۸
الذالات	الراآت	الزاآت	السینات	الشینات
۴۸۴۰	۱۰۹۰۳	۹۵۸۳	۴۵۹۱	۲۵۱۳۳
الصادات	الضادات	الطاآت	الظاآت	العینات
۱۲۸۴	۱۲۰۰	۸۴۰	۹۳۲۰	۲۰۱۰
الغینات	الفاآت	القافات	الکافات	اللامات
۷۴۹۹	۲۵۰۰	۵۲۴۰	۲۲۰۰۰	۱۴۵۹۱
المیمات	النونات	الواوات	الہاآت	الیاآت
۲۰۵۶۰	۲۰۳۶	۱۳۷۰۰	۷۰۰	۵۰۲

(علامۂ بہائی کشکول ج ۱ ص ۴۳۴)

علامہ بہائی نے اس مقام پر حرکات، سکونات، آیات اور اوقاف وغیرہ کی تفصیل نہیں دی ہے۔ یہ تفصیل پیش کرنا ہمارا بھی مطمحِ نظر نہیں ہے بلکہ صرف یہ مثال پیش کرنا مقصود تھا کہ مسلمانوں نے قرآن مجید کے ساتھ کس قدر اہتمام واعتنا کیا ہے۔

بلاشبہ حضرت امیر علیہ السلام اور آپ کے بعد ہونے والے ائمۂ اہلِ بیت طاہرین علیہم السلام کے علاوہ بہت سے اصحاب اخیار اور سیاست مداروں کے علاوہ امتِ مسلمہ کے بیشتر افراد نے بھی اس عظیم نعمتِ الٰہی کی حفاظت وقدردانی وقدرشناسی میں اپنی اپنی حیثیتوں کے مطابق کوئی کمی نہیں کی۔ قرآن مجید کے ساتھ مسلمانوں کے شغف کا حال تاریخ حفاظِ قرآن، تفاسیر قرآن اور تاریخ علومِ قرآن پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوجاتا ہے۔

قرآن سے عشق کے مظاہر مسلم معاشرے میں ہر سطح پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ حفظ وتلاوت وتجوید سے لے کر تحریر مصاحف میں اہتمام وتزیین تک اور حروف وحرکات ونقاطِ قرآن کو شمار کرنے سے لے کر اس کے رموز واسرار کی نقاب کشائی کی علمی اور عملی کوششوں تک ایک عالم نہیں بلکہ عالم عالم نورِ ظہور کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے!

اس مقام پر ہم بانیِ جمہوریہ اسلامی ایران آیۃ اللہ العظمیٰ امام خمینیؒ کے اس جملے پر اس گفتگو کو تمام کرتے ہیں کہ قرآن وہ نعمتِ عظمیٰ ہے کہ اگر انسان تمام عمر سجدۂ شکر ہی میں گزار دے تب بھی حقِ شکر ادا نہیں ہوسکتا!

(۲۷)

ظہورِ دین وفروغِ سنت

اَللّٰھُمَّ اَظْھِرْ بِہٖ دِیْنَکَ وَسُنَّۃَ نَبِیِّکَ حَتّٰی لَا یَسْتَخْفِیَ بِشَیْءٍ مِنَ الْحَقِّ مَخَافَۃَ اَحَدٍ مِنَ الْخَلْقِ.

اے معبود! اپنے دین کو اور اپنے نبیؐ کی سُنّت کو اُن کے ذریعہ سے اس طرح ظاہر فرما کہ پھر خلق میں سے کسی کے خوف سے کوئی بھی شے چھپانی نہ پڑے!

☆☆☆

دعا کا یہ فقرہ قرآنِ مجید کی اُن آیتوں کی طرف ناظر ہے جن میں ''مکمل غلبۂ دین'' کی بات کہی گئی ہے اور جن کی تفسیر وتاویل کے ذیل میں حضرت مہدیِ منتظر علیہ السلام کے ظہور وسلطنت کے بارے میں حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔

یہ سورۂ توبہ، سورۂ فتح اور سورۂ صف کی آیتیں ہیں۔

(۱) ﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾

(سورۂ توبہ آیت ۳۳)

''وہی ہے وہ (معبود برحق) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا تا کہ اُسے تمام ادیان پر غلبہ عطا کرے چاہے مشرکین اسے کتنا ہی ناپسند کریں۔''

بعینہ یہی آیت سورۂ صف میں بھی آئی ہے۔ (سورۂ صف آیت ۹) البتہ سورۂ فتح میں آیت کا آخری جملہ مختلف ہے۔

﴿هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ كَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا﴾ (سورۂ فتح آیت ۲۸)

''وہی ہے وہ (معبودِ برحق) جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دینِ حق

کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے تمام دینوں پر غلبہ عطا فرمائے اور بس معبودِ برحق ہی گواہی کے لیے کافی ہے!''

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان آیات سے متعلق فرمایا ہے:

''وَاللّٰهِ مَا یَجِیْئُ تَأْوِیْلُهَا حَتّٰی یَخْرُجَ الْقَائِمُ الْمَهْدِیُّ''

''معبودِ برحق کی قسم ان آیتوں کی تاویل نہیں آئے گی جب تک کہ مہدیِ قائم ظہور نہ کریں گے۔''

اِس کے علاوہ زیرِ غور فقرے میں سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُس کی حُجّیت یعنی سنتِ نبویؐ کی آئین ساز وقانون ساز حیثیت کی طرف دعوتِ فکر دی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ قرآنِ مجید کے بعد اساسِ دین اور مآخذ شریعت سیرتِ نبویؐ ہے! اور یہ ایسی بدیہی بات ہے جس پر کوئی دلیل پیش کرنا یا کسی شخص کا اس پر دلیل طلب کرنا محض حماقت ہے، عقلِ انسانی جن دلائل سے نبی کی ضرورت کو تسلیم کرتی ہے، نبی کو تسلیم کر لینے کے بعد اس کی سیرت وسنت کی حجیت کو تسلیم کرنے کے لیے اسے کسی بھی استدلال وبرہان کی ضرورت باقی نہیں رہتی! بحمد اللہ نبی خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتِ مبارکہ کے مأخذِ شریعت ہونے پر فی الجملہ تمام مسلمانوں کا اتفاق بھی ہے۔ لیکن ''سنت'' کی تعریف، اس کی تقسیم اس کے استناد، اس کی تفسیر و تاویل یا اس کے اطلاق ونفاذ کے باب میں بہت سی بحثیں اور مشکلیں پیدا ہوگئی ہیں۔ بعض مسلم علماء اور دانشور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو حیثیتیں تھیں۔ ایک پیغمبرانہ حیثیت تھی اور دوسری ذاتی وشخصی وبشری۔ آپؐ کی سیرت وسنتِ پیغمبرانہ تو اساس ومأخذِ دین وشریعت ہے لیکن آپؐ کی

ذاتی و شخصی سیرت وسنت ''آئین و قانون ساز حیثیت نہیں رکھتی''۔ ظاہر ہے کہ یہ نظریہ پیغمبرِ خدا کی ''عصمت'' کو تسلیم کرنے والوں کے لیے محض ایک اضحکہ ہے۔

پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت وسنت کو بغیر کسی ''تبعیض'' یا تقسیم کے خود ربِّ کریم نے قرآن مجید میں ''حُجّت'' اور ماٴخذِ شریعت قرار دیا ہے، قرآن کے ارشاد و بیان کے بعد خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ''سیرت وسنت'' کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپؐ کے اہلبیت سے ہونے والے ائمہٴ دین نے ''سیرتِ طیبہ'' اور ''سنتِ مطہرہ'' کو دین و شریعت اور علم و معرفت کا ناقابلِ تغیر ستون اور سرچشمہ قرار دیا ہے۔ آیت قرآنی ہے:

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾

(حشر ۵۹/۷)

''...اور جو کچھ رسول تمہیں دے اُسے لے لو اور جس بات سے منع کرے اُسے ترک کردو!''

اس سلسلے میں دوسری آیتِ قرآنی یہ ہے:

﴿لقد كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

(سورہٴ احزاب ۳۳/۲۱)

''تمہارے لیے رسول اللہ کی شخصیت میں بہترین مثال موجود ہے''۔

اس باب میں تیسری آیت یہ ہے:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾

(سورہٴ نجم ۵۳/۳،۴)

''اور یہ (رسول) اپنی ہوائے نفس سے نہیں بولتے جو کچھ بولتے ہیں وہ اُن کو بھیجی گئی وحی ہوتی ہے''۔

اس باب میں چوتھی آیت یہ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ...﴾ (انفال/۲۴)

''اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں دعوت دیں جس امر میں تمہاری زندگی ہے...''۔

اس باب میں پانچویں آیت یہ ہے:

﴿قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي ...﴾

(آل عمران آیت ۳۱)

''اے رسول کہہ دیجیے: اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو...!!''۔

اس وقت ہم انہیں پانچ آیتوں پر اکتفا کرتے ہیں ورنہ ایسی اور بھی آیتیں ہیں جن سے حُجّیتِ سنتِ نبوی کا اثبات و ثبوت حاصل ہوتا ہے۔

☆☆☆

یہاں پر دُعائے افتتاح کے اس پورے بند میں ایک اور بات بھی کہی گئی ہے، جو ایک انتہائی اہم، عقلی، دینی اور تاریخی حکمت، حُکم اور تدبیر پر گفتگو کی متقاضی ہے جس پر عقل اور دین تو متفق ہیں لیکن افسوس ہے کہ بعض مسلمان علما، صرف نظری اعتبار سے بلکہ محض بر سبیل مُناظرہ، اس کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں۔ میری مُراد ''حُکمِ تقیہ'' سے متعلق ہے۔

سب سے پہلے اس کی لفظی اور لغوی تحقیق کر لیجیے۔

''تقیہ'' کا مادّہ یا Rootword وہی ہے جو ''تقویٰ'' کا ہے۔ یہ حیرت

انگیز بات ہے کہ تقویٰ کا پابند تقیہ کا مخالف کیوں کر ہو سکتا ہے؟!

اس کا مادّہ ہے: وق ی

التقویٰ-فَعْلیٰ - جیسے نجویٰ، اصل میں وَقوی تھا۔ وَقِیَۃٌ سے بمعنیٰ مَنعَۃ، عربی علمِ صرف کے قواعد کے مُطابق واو، ت سے منقلب ہو گیا، اسی طرح لفظ 'تقاۃ' اصل میں وُقاۃ تھا۔

مجمع البحرین طُریحی میں ہے 'التقیۃ والتقاۃ اِسمانِ موضوعانِ مَوضِعَ الاتّقاء' تقیہ اور تقاۃ، اتقاء کے قائم مقام اسماء بنائے گئے ہیں۔

تقیہ کے ایک معنی خوف کے ہیں۔ جس کے لازمی معنیٰ میں عقاب بھی شامل ہے۔ چنانچہ امیر المؤمنین علیہ السلام کے ایک خطبہ میں یہ لفظ غالباً اسی معنی میں استعمال ہوا ہے فرماتے ہیں:

وَرُبَّمَا اِستَحلیٰ النّاسُ الثَّنآءَ بعدَ البلآءِ فَلا تُثنُوا عَلَیَّ بِجَمِیلِ ثناءٍ لِاِخرَاجِي نَفسِي اِلیٰ اللّٰهِ سُبحانهُ وَاِلَیکُم مِنَ التَّقِیَّةِ فِي حُقُوقٍ لَم اَفرُغ مِن اَدَائِها" (نہج البلاغہ نسخہ صبحی صالح ۲۱۶ص ۳۳۵)

"اکثر لوگ آزمائش کے بعد مدح وثنا کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن تم لوگ ستائش نہ کرو کہ اطاعتِ خدا اور تمہارے حقوق کی ادئیگی سے عہدہ برآ ہو گیا ہوں، کہیں تم مجھے اُن حقوق کے خوف سے نکالو جن کے ادا کرنے سے ابھی میں فارغ نہیں ہوا..."

☆☆☆

اصطلاحِ فقہ وکلام میں 'تقیہ' کے معنی یہ ہیں کہ "دشمن کے خوف سے جبکہ

اُس سے مقاومت کی طاقت نہ ہو یا مقاومت موثر نہ ہو تو مؤمن جان مال اور عزت بچانے کی خاطر اپنے ایمان کو دل میں چھپالے اور اُس کا اظہار نہ کرے!"

اس کی اساس قرآن مجید کی یہ صریح آیت ہے:

"لَایَتَّخِذِ المُومِنُونَ الکٰفِرِینَ اَولِیَاءَ مِن دُونِ المؤمِنِینَ وَمَن یَفعَلُ ذَالِکَ فَلَیسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيءٍ اِلَّا اَن تَتَّقُوا مِنهُم تُقَیَۃً"

(سورۂ آل عمران آیت ۲۸)

"ایماندار، ایمانداروں کو چھوڑ کر، اللہ کے منکروں کو اپنا دوست (یا مددگار و سرپرست) نہ بنائیں! اور جو ایسا کرے گا اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔

سوائے اس کے کہ جب تم اُن (کے ظلم وستم) سے بچنے کے لیے تقیہ اختیار کرو!"

علامۂ بزرگوار شیخ محسن نجفی مدظلہ العالی نے اپنے تفسیری حواشی میں اس آیت کے ذیل میں پیش کیے جانے والے مباحث کا بہت عمدہ خُلاصہ لکھ دیا ہے۔ اس لیے میں اُن کے الفاظ مستعار لے رہا ہوں:

"اِلَّا اَن تَتَّقُوا" استثنائے منقطع نہیں متصل ہے۔ یعنی کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ نہ ظاہراً نہ حقیقۃً، اِلَّا اَن تتقوا، ہاں اگر البتہ ان سے بچنا مقصود ہو تو ظاہراً دوست بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔"

"اس آیت سے جوازِ تقیہ کے ثابت ہونے کے بارے میں اصحاب، تابعین، تبع تابعین، فقہاء اور مفسرین میں سے کسی کو اختلاف نہیں ہے۔"

علامہ محسن نجفی نے تفسیر ابن کثیر، ابی السعود، رازی، بیضاوی، قرطبی، روح المعانی، المنار، ظلال القرآن، بیان القرآن تھانوی اور تفہیم القرآن مودودی وغیرہ کا حوالہ بھی دیا ہے۔

(القرآن الکریم، ترجمہ وحاشیہ از (علامہ) محسن علی نجفی، دار القرآن الکریم اسلام آباد، ص ۵۶)

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ صدر اسلام سے لے کر آج تک محققین علماء کے درمیان کبھی بھی اختلافی نہیں رہا۔ اس لیے کہ یہ ایک عقلی تقاضا، ایک عاقلانہ اور عُقلائی حکمت و تدبیر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک حُکمِ قرآنی بھی ہے۔ اِسے محض اُن ''پیشہ وَر مناظرہ بازوں'' نے ایک اختلافی مسئلہ ٹھہرالیا ہے جن کا کام اطاعتِ خدا و رسول نہیں ہے بلکہ وہ یا تو ہوائے نفسانی کے تحت یا ''دین دشمن، شیاطینِ انس و جن'' کی محض اندھی یا منفعت پرستانہ خدمت گزاری میں امتِ مسلمہ میں تفرقہ اندازی کے لیے مأمور رہتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

(۲۸)

ولایتِ حق
یا
دولتِ احسان و کرم

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَرْغَبُ اِلَيْكَ فِي دَوْلَةٍ كَرِيْمَةٍ تُعِزُّ بِهَا الْاِسْلاٰمَ وَأَهْلَهُ وَتُذِلُّ بِهَا النِّفَاقَ وَ اَهْلَهُ وَتَجْعَلُنَا فِيْهَامِنَ الدُّعَاةِ اِلَىٰ طَاعَتِكَ وَالْقَادَةِ اِلَىٰ سَبِيْلِكَ وَتَرْزُقُنَا بِهَا كَرَامَةَ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ اللّٰهُمَّ مَاعَرَّفْتَنَا مِنَ الْحَقِّ فَحَمِّلْنَاهُ وَمَا قَصُرْنَا عَنْهُ فَبَلِّغْنَاهُ اللّٰهُمَّ الْمُمْ بِهِ شَعَثَنَا وَاشْعَبْ بِهِ صَدْعَنَا وَارْتُقْ بِهِ فَتْقَنَا وَكَثِّرْ بِهِ قِلَّتَنَا وَأَعْزِزْ بِهِ ذِلَّتَنَاوَأَغْنِ بِهِ عَائِلَنَاوَاقْضِ بِهِ عَنْ مُغْرَمِنَا وَاجْبُرْ بِهِ فَقْرَنَا وَسُدَّ بِهِ خَلَّتَنَا وَيَسِّرْ بِهِ عُسْرَنَا وَ بَيِّضْ بِهِ وَجُوْهَنَا وَفُكَّ بِهِ أَسْرَنَاوَأَنْجِحْ بِهِ طَلِبَتَنَا وَأَنْجِزْبِهِ مَوَاعِيدَنَا وَاسْتَجِبْ بِهِ دَعْوَتَنَا وَأَعْطِنَابِهِ سُؤْلَنَاوَبَلِّغْنَا بِهِ مِنَ الدُّنْيَا وَالآخِرَةِ آمَالَنَا وَأَعْطِنَابِهِ فَوْقَ رَغْبَتِنَايَاخَيْرَالْمَسْؤُولِيْنَ وَأَوْسَعَ الْمُعْطِيْنَ اشْفِ بِهِ صُدُوْرَنَا وَأَذْهِبْ بِهِ غَيْضَ قُلُوْبِنَا وَاهْدِنَابِهِ لِمَااخْتُلِفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِي مَنْ تَشَاءُ اِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ وَانْصُرْنَا بِهِ عَلَىٰ عَدُوِّكَ وَعَدُوِّنَا اِلٰهَ الْحَقِّ آمِينَ!

اے معبود! ہم تجھ سے وہ باشرف حکومت چاہتے ہیں جس کے ذریعہ تو اسلام اور اہل اسلام کو عزت عطا فرمائے اور جس کے ذریعہ تو نفاق اور اہل نفاق کو ذلیل کرے اور جس (حکومت) میں تو ہمیں اپنی اطاعت کی طرف بلانے والوں میں اور اپنے راستے کی طرف رہنمائی کرنے والوں میں قرار دے اور جس کے ذریعہ تو ہم کو دینا و آخرت کی بزرگی عطا فرمائے!!

اے معبود! جتنا حق تو نے ہمیں پہچنوایا ہے، اتنی سکت دے اور جو ہم جاننے سے قاصر رہ گئے ہیں اس تک رسائی فرما! اے معبود! ان کے ذریعہ سے ہمیں ایک لڑی میں پرو دے! ہماری بکھری ٹکڑیوں کو جمع کر دے ہماری فرقت کو قربت

سے بدل دے، انہیں کے ذریعہ سے ہماری کمی کو کثرت میں بدل دے، انہیں کے ذریعہ سے ہماری ذلت کو عزت سے بدل دے، انہیں کے ذریعہ سے ہمارے مفلسوں کو تونگر بنا دے، انہیں کے ذریعہ سے ہمارے قرضداروں کی ادئیگی فرما دے، انہیں کے ذریعہ سے ہماری ناداری کی تلافی کردے انہیں کے ذریعہ سے ہماری حاجتوں کو پورا کردے، انہیں کے ذریعہ سے ہماری دشواریوں کو سہل بنادے، انہیں کے ذریعہ سے ہمیں اپنے مقصد میں کامیاب فرما، انہیں کے ذریعہ سے ہمارے وعدوں کی ایفا فرما، انہیں کے وسیلے سے ہماری دعاؤں کو قبول فرما انہیں کے وسیلے سے ہمارے سوال پورے کردے، انہیں کے وسیلے سے ہماری تمام دنیا و آخرت کی آرزوئیں برلا، اور ان کی طفیل میں ہمیں ہماری امید سے سوا دے، اے بہترین سوال پورا کرنے والے، اے سب سے زیادہ عطا کرنے والے، ان کے ذریعہ ہمارے سینوں کو سکون عطا فرما، ہمارے دلوں کا دکھ دور کردے، اپنے مشیت سے ہماری اس حق کی طرف رہنمائی فرما جس میں اختلاف ڈال دیا گیا، بیشک تو ہی جس کو چاہے صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرماتا ہے، اور انہیں کے ذریعہ ہمیں اپنے اور ہمارے دشمن پر نصرت عطا فرما، اے حق کے معبود ہماری دعا قبول فرما!

☆☆☆☆☆☆

یہ فقرۂ دعا جسے اکثر مستقل طور پر بھی قنوت یا تعقیب نماز میں تلاوت کرتے ہیں نہایت صاف اور صریح لفظوں میں ''حکومت اسلامی'' کے قیام کی دُعا ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ نظامِ ولایتِ الٰہیہ اور لازمی یا ضمنی طور پر موضوعِ ولایتِ فقیہ سے بھی مربوط ہے۔ یہ مسئلہ بطور خاص اس عہد کے اہم ترین مسائل میں سے ہے، اس لیے اس پر گفتگو کر لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ گزشتہ فقرے میں خوف اور

تقیے کے حالات کو برطرف کرنے کی دعا تھی۔ ظاہر ہے کہ تقیہ اور خوف کے حالات ختم ہوں گے تبھی ایک بے خوف وخطر معاشرۂ امن وانسانیت یا ''حکومتِ اسلامی'' کی تشکیل ہوگی۔ اس لحاظ سے ان فقروں کے مضامین کا رَبط اور تسلسل بھی قابلِ غور ہے۔

نظریۂ ولایتِ فقیہ کے تعلق سے میں نے امام خمینیؒ کے بارے میں اپنے ایک مقالے میں کچھ لکھا تھا جس میں آیۃ اللہ شہید باقر الصدرؒ کی تشریح کو اختیار کیا تھا۔ اس مقام پر صرف چند الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ ہم اپنے اسی مقالے کا اقتباس نقل کردینا مناسب سمجھتے ہیں۔

''اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ شریعت اسلامیہ کا ڈھانچہ، انسانی معاشرے کی تنظیم اور استحکام کے لیے مضبوط ترین قلعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انسانی معاشرے کی تنظیم اور استحکام کی ظاہری عملی شکل ''بنائے حکومت'' ہے۔ چنانچہ شریعت اسلامیہ میں بنائے حکومت کے جملہ تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ البتہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اجتہاد کے ارتقائی سفر میں کئی مرحلوں سے گزر کر اس کے تمام خدوخال اپنے واضح ترین اور قطعی شکل وصورت میں نظریۂ ''ولایت فقیہ'' کے قالب میں سامنے آئے ہیں۔ جسے آیۃ اللہ العظمیٰ امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے حوزۂ علمیہ نجف (عراق) میں اپنے فقہی لیکچرز کے ضمن میں پیش کیا تھا۔

آیت اللہ خمینیؒ کے بعد اس نظریہ کے فقہی، سیاسی، اقتصادی، اور اجتماعی پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے کے لیے شہید اسلام آیۃ اللہ سید محمد باقر الصدر اور خود آیت اللہ خمینی کے شاگردوں میں آیت اللہ شہید مرتضیٰ مطہری، علامہ شیخ حسین علی منتظری، آیۃ اللہ شیخ حسین مظاہری، جمہوری اسلامی ایران کے سابق صدر

ہاشمی رفسنجانی اور موجودہ رہبر انقلاب آیت اللہ خامنہ ای وغیرہ نے بے حد مفید بحثیں شائع فرمائیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان سب کا جائزہ لینا اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ضرورت اور گنجائش کے مطابق چند نکات کے ضمن میں اصل نظریۂ ولایتِ فقیہ کی وضاحت کچھ اس طرح کی جاسکتی ہے:

۱- تمام انسان بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کے مخلوق اور اسی کے بندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں آزاد اور فاعلِ مختار خلق فرمایا ہے۔ چنانچہ کسی بھی انسان پر کسی بھی دوسرے انسان یا ''چند انسانوں'' کے کسی مجموعے یا کسی بھی دوسری شے کو کوئی تسلط یا اقتدار حاصل نہیں۔ بلکہ ہر طرح کا تسلط اور اقتدار مخصوص ہے صرف ذات باری تعالیٰ عزّ اسمہٗ وجل شانہ کے لیے اور وہی تمام ثانوی اختیارات کا مصدر ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تمام انبیائے کرام نے اسی نظریہ کو پیش کیا جو کلمۂ ''لا الٰہ الّا اللہ'' کے مؤجز ترین ''متن'' میں پوشیدہ اور عیاں ہے!

۲- جس طرح تمام تسلط اور اقتدار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے۔ اسی طرح کائنات کی تمام چیزوں کی ملکیت ومالکیت بھی حقیقۃً صرف اور صرف اسی ذات پاک کے لیے ہے اور بس!

''لا ولایة بالاصل الا للہ تعالیٰ''

۳- بے شک ''انسان'' کو اللہ تعالیٰ کی خلافت سونپی گئی ہے اور اسے اس پوری کائنات پر تصرّف اور اقتدار وتسلط عطا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا اولین انحصار اللہ تعالیٰ کا پیغام اور اس کے احکام کے حامل اس کے معصوم نمائندوں۔ انبیاء ومرسلین علیہم السلام کی ذواتِ مقدسہ میں ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانی

معاشرے کے تمام نظم و نسق کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت کسی بھی طرح چھپائی نہیں جا سکتی کہ تمام انبیاء و مرسلین اللہ تعالیٰ کی حکومت یعنی صرف اور صرف احکام الٰہیہ کے نفوذ و نفاذ ہی کے لیے کوشاں رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ مکمل اور ظاہری اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہوئے جیسے حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ وغیرہ۔ اور کچھ اپنی عمر کے بیشتر حصہ میں اس کے لیے جد و جہد کرتے رہے جیسے حضرت موسیٰؑ۔ حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دور وہ ہے کہ آپ نے ''مدینہ منورہ'' میں اس ''حکومت الٰہیہ'' کو اس امتیاز کے ساتھ قائم فرمایا جس کی مثال کسی بھی نبی کے یہاں نہیں مل سکتی۔

٣- آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد آپ کے اَوصیاء برحق اور ائمہ اہل بیت علیہم السلام اسی ''حکومت الٰہیہ'' کے نمائندے رہے اور جس کو جب جہاں جتنا بھی موقع ملا، قانون الٰہی کے نفاذ ہی میں کوشاں رہا۔ یہاں تک کہ ائمہ اہل بیت میں سے بارہویں امام حضرت محمد مہدی ابن امام حسن العسکری علیہما السلام نے دنیا سے روپوشی اختیار فرمائی۔ اور یہ ایک عام اصول مقرر فرمایا کہ اب تک تو شریعت اور قانونِ الٰہی کے متعلق تمام سوالات ہم براہِ راست بتانے کے ذمہ دار تھے ___ لیکن!

''اب جو بھی تازہ واقعات پیش آئیں اُن میں اُن کی طرف رجوع کیا جائے جو ہماری حدیثوں کو بیان کرنے والے ہیں، وہ ہماری طرف سے تم پر حجت ہیں اور ہم اللہ کی حجت ہیں!''

''اِسی ''نص'' یا ''توقیع'' (فرمان) کی بناء پر فقہائے اُمت کو امام یا وصیِ رسول اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ''نیابت عامہ'' [نہ کہ نیابت

خاصہ] حاصل ہوتی ہے۔ اور ''حدیث رسول'' کا حامل و عالم، فقیہ اسلام، امت کے تمام امور کا مسئول اور مراقب (رہبر اور نگراں) ہوتا ہے۔''

٤- وہ ایک ''فرد'' یا متعدد افراد جو اس درجہ کے فقیہ ہوں کہ انہیں ''نیابت عامہ'' کے منصب کا اہل مان لیا گیا ہو۔ اور وہ اشخاص و افراد جنہیں دیگر تمام افراد ملّت نے اپنی نمائندگی دے کر اپنے امور کے نظم و نسق کا ''وکیل'' بنایا ہو۔ ''قاعدۂ شوریٰ'' کے تحت باہم مل کر اپنے زمانے کے سب سے بڑے ماہرِ قانونِ الٰہی کی نگرانی میں حکومت قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں ___ اس طرح معاشرے پر کسی ایک انسان کی بھی حکومت کا تصور نہیں ابھرتا، بلکہ اصلی حکومت اللہ تعالیٰ یعنی اس کے قوانین کی ہوتی ہے۔ جس کے زیرِ سایہ تمام افرادِ ملت یا افرادِ انسانی برابر کی آزادی کے حق دار اور مساویانہ حقوق سے بہرہ مند ہوتے ہیں۔ چونکہ اس میں ''ماہرِ قانونِ الٰہی'' یعنی ''فقیہ'' کی حیثیت اور اس کا رول سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے اس لیے اس نظریہ کو 'نظریہ ولایت فقیہ' یا (Theory of the final authority of the Jurist) کا عنوان ہی دیا جا سکتا ہے''۔

یہ ہے ''نظریہ ولایت فقیہ'' کی عمومیت پسندانہ توضیح یا ایک عمومی تعبیر (عمومی اس معنی میں کہ غیر متخصصانہ اور فقہ و قانون کی مخصوص اصطلاحوں سے عاری ہے) جسے ایک عام اور معمولی یا سطحی علم اور اطلاع رکھنے والے بھی سمجھ سکتے ہیں۔

یہ نکات تو ''حکومتِ الٰہیہ'' یا سیاستِ دینی کی مَرکزیت یا مشہور اصطلاح کے مطابق نظریۂ ولایتِ فقیہ کی نظریاتی بنیاد کی وضاحت میں عرض کیے گئے۔ دعائے افتتاح کے محولہ بالا فقرے ہیں ربِّ کریم سے جو التجا کی گئی ہے، جس

"دولتِ کریمہ" کا تقاضا کیا گیا ہے اور اس کے جن خصوصیات کا تذکرہ کیا گیا ہے غور کیجیے تو وہ اِس نظریہ کی عَملی تطبیق کے بہترین ثمرات کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اب اس مخصوص بحث یعنی بحثِ ولایتِ فقیہ سے قطعِ نظر کرتے ہوئے دعائے افتتاح کے زیرِ غور جملوں اور ان سے متصل فقروں کو پڑھیے اور ان کی معنویت کو سمجھنے کی مزید کوشش کیجیے۔ اِن میں سے ہر فقرہ لسانی اور معنوی دونوں طرح کی خصوصیات کے لحاظ سے خاصا اہم اور توجہ طلب ہے۔

"اللھم المم بہ شعثنا" کے جملے سے وانصرنا بہ علیٰ عدوّک وعدونا الٰہ الحق آمین" تک ایک ایک جملہ نظمِ معاشرۂ انسانی کے ایک ایک لازمی تقاضے کی نشاندہی کرتا ہے اور ایک مدینۂ فاضلہ، مَدنیۃ السلام، مَدنیۃ الاسلام ایک شہرِ امن وعافیت یا فردوسِ تمدن انسانی کی ضرورتوں کو پیش کرتا ہے اور رب کریم سے اِن ضرورتوں کو اُس کے وَلی، حضرت امام مہدی علیہ السلام کے ذریعہ سے پورا کردینے کی درخواست پر مشتمل ہے۔ صرف انہیں جملوں کی مفصل شرح ایک مکمل دفتر چاہتی ہے لیکن اَب اِس دفتر میں اس کی سمائی نہیں ہے۔ توفیق رَفیق ہوئی تو یہ جملے اور اس کے علاوہ اور بہت سے تشنۂ وضاحت جملے اور نکتے جو شرحِ دعائے افتتاح کے اِس "دورے" میں رہ گئے ہیں کسی آئندہ دورۂ بحث میں شامل کیے جائیں گے۔

☆☆☆☆☆

(۲۹)

نالۂ ہجر ونوحۂ فرقت

یا

ماتمِ ہجرِ پیغمبرؐ!

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَشْکُوْا اِلَیْکَ فَقْدَ نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ آلِہٖ!

''اے معبود! ہمیں تجھ سے اپنے نبی صلی علیہ وآلہ وسلم کی جدائی کا گلہ ہے۔''

اس دعا کا یہ فقرہ اپنے انداز کا بالکل ہی انوکھا فقرہ ہے۔ دوسری متداول دعاؤں میں سے کسی میں اس طرح کا کوئی فقرہ نظر نہیں آتا۔ یہ ایک فقرہ پورا ایک مرثیہ ہے! یہ ہجرِ پیغمبرؐ کا نوحہ ہے!! جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے انتہا محبت ہی کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اُن کی جُدائی کا غم ابھی تازہ ہے! اس لحاظ سے یہ فقرہ جذبۂ سوگواری اور فلسفۂ عزاداری پر بھی غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔

ائمۂ اہل بیت علیہم السلام نے یادِ خدا میں اشک ریزی کے ساتھ ساتھ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیاء اللہ کے ہجر وفراق میں بھی اشک ریزی اور ماتم گساری کی تعلیم دی ہے، اور اسے بھی روحانی تربیت، تہذیبِ نفس اور سیر و سلوک الی اللہ کا ایک انتہائی مؤثر ذریعہ قرار دیا ہے۔

قرآنِ مجید میں عظمت وجلالِ کبریائی کے تصور سے اور خشوع وخشیت الٰہی سے معبود برحق کے سچے سجدہ گزاروں کی کیفیتوں میں اُن کے ''بہت رونے'' کو زبانِ قدرت نے بہت سراہا ہے۔

﴿...وَیَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ یَبْکُوْنَ وَیَزِیْدُهُمْ خُشُوْعاً...﴾

(سورۂ اسراء: ۱۰۹)

''...اور وہ روتے ہوئے منہ کے بل گر جاتے ہیں اور یہ ان کے خشوع میں اضافہ کا سبب بنتا ہے!''

اسی طرح ''کلامِ الٰہی کو سن کر'' اس کے آگے خشوع وخشیت سے رونے والوں کی ستائش کی گئی ہے:

﴿اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ آیَاتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوا سُجَّداً وَبُکِیّاً...﴾

(سورۂ مریم آیت: ۵۸)

''جب ان کے سامنے آیاتِ الٰہی- ''آیاتُ الرحمٰن'' کی تلاوت ہوتی تھی تو وہ سجدے میں گر پڑتے تھے اور روتے تھے!''

قرآنِ مجید میں ایک جگہ خدا کے بعض سرکش بندوں (فرعون اور آلِ فرعون) کی ہلاکت پر زمین وآسمان کے نہ رونے کا ذکر کیا گیا ہے جو کہ عبرت کی خاطر ہے! جس کا ''مفہوم''[۱] بہت واضح ہے کہ اللہ کے نیکوکار بندوں خصوصاً انبیاء، مرسلین، اوصیائے مرسلین اور اولیاء اللہ کی جدائی یا ان کی شہادتوں پر زمین وآسمان اور اہلِ زمین واہلِ آسمان روتے ہیں! اور انہیں رونا چاہیے!!

یہ سورۂ دخان کی ۲۹ رویں آیت ہے:

﴿فَمَا بَکَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَاءُ وَالاَرْضُ وَمَا کَانُوا مُنْظَرِینَ﴾

''پھر نہ آسمان وزمین نے ان پر گریہ کیا اور نہ وہ مہلت پانے والوں میں سے تھے!''

اس آیت کے ذیل میں احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ارشاداتِ ائمۂ دین علیہم السلام میں یہ صراحت موجود ہے کہ نبیِؑ خدا حضرت یحییٰؑ کی شہادت پر آسمان سُرخ ہوگیا اور خون کے قطرے گرے! اور سبط رسول امام حسین علیہ السلام کی شہادت پر بھی آسمان سُرخ ہوگیا۔ یہ تو علامۂ جلال الدین سیوطیؒ نے تفسیر درِّ

۱؎ یہاں پر ''مفہوم'' صرف لغوی معنی میں استعمال نہیں کیا گیا ہے بلکہ اسے ''اصولِ فقہ'' کی ایک اصطلاح کے طور پر بھی برتا گیا ہے۔

منثور میں درج فرمایا ہے۔ تفسیر مجمع البیان میں یہ ہے کہ حضرت یحییٰؑ اور حضرت امام حسین علیہما السلام کی شہادتوں پر آسمان نے چالیس روز تک گریہ کیا!

اس مقام پر یہ تذکرہ ضروری ہے کہ نبیِ خاتم، سید المرسلین اور محبوبِ رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اُمّت کو بطورِ خاص اپنے مصائب کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

آپؐ کی یہ حدیث مشہور ہے:

"مَا اُوذِیَ اَحَدٌ مَا اُذِیتُ فِي اللّٰه"

(کسی کو بھی اتنی اذیت نہیں دی گئی جتنی اذیت اللہ کی راہ میں مجھے دی گئی)۔

اِس حدیث کو حافظ ابونُعیم نے حلیۃ الاولیا میں انس بن مالک سے مرفوعاً نقل کیا ہے اور اصل حدیث بخاری میں ہے۔

یہ حدیث غور طلب ہے۔ گزشتہ انبیاء میں سے تو کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں آرے سے چیر ڈالا گیا، طرح طرح سے اذیتیں دیکر قتل کیا گیا، سولی پر لٹکایا گیا، اور اسی طرح نہ جانے کتنے واقعات ہیں جو بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں نظر نہیں آتے۔ لیکن آنحضرتؐ کا یہ ارشاد سوچنے پر مجبور کرتا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ آپ کی زندگی تنہا نہیں تھی۔ آپؐ کے اہل بیت آپؐ ہی کی زندگی کے تسلسل کی حیثیت رکھتے تھے اور جو جو مصیبتیں ان پر پڑیں وہ سب خود آنحضرتؐ کے لیے انتہائی اذیت ناک مصیبتوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ جناب شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی کتاب "سرّ الشہادتین" سے بھی اسی نکتہ کا استفادہ ہوتا ہے، اُن کے علاوہ بھی بے شمار علماء، فقہاء، محدثین، عرفاء اور اولیائے اُمت رضوان اللہ تعالیٰ

علیہم اجمعین نے اسی حقیقت کے پیشِ نظر پیغمبرؐ و اہلبیتِ پیغمبرؐ خصوصاً فرزندِ رسولؐ حضرت امام حسین علیہ السلام کے دلدوز مصائب اور آپ کی شہادت کے تعلق سے مراسمِ عزاداری کو قائم فرمایا ہے۔

آنحضرتؐ کا یہ ارشاد بھی بے حد اہم ہے جسے ابوالعباس المبرّد نے "الکامل" (ج ۳ ص ۹۱) میں نقل کیا ہے:

تَعَزَّوا عَنْ مَصَائِبِكُمْ بِيْ

"تم اپنے مصائب کا پُرسہ مجھے دیا کرو"

اس ارشادِ پیغمبرؐ سے عام افرادِ امت کے لیے بھی یہ اندازہ کرلینا کچھ مشکل نہیں ہے کہ آنحضرتؐ کے دل میں اُن کے لیے کتنی شفقت پائی جاتی تھی، اور ساتھ ہی یہ فکر بھی پیدا ہوتی ہے کہ جب عام افرادِ امت کے مصائب پر آنحضرتؐ کو تسلیت پیش کی جاسکتی ہے تو پھر خود آنحضرتؐ کے جگر پاروں، آپ کے اہلبیت اور خصوصاً آپ کے فرزندوں حسن اور حسین علیہما السلام کے مصائب پر آپؐ کی خدمت اقدس میں تعزیت کا کس قدر اہتمام کیا جانا چاہیے!

مُبرد کی نقل کردہ حدیث کی تائید اور توضیح میں رئیسِ مذہبِ مالکیہ امام مالک کی مشہور کتاب "موطا" کی ایک حدیث بھی قابلِ ذکر ہے۔

کتاب الجنائز، باب جامع الحِسبة فی المصیبة میں وارد ہے:

عن عبدالرحمن بن القاسم اَنَّ رسُولَ اللهِ صلی اللهُ علیهِ وسلم قالَ:

"لِيُعَزِّيَ المُسلمِينَ فِي مَصَائِبِهِمْ المصيبةُ بِي".

"عبدالرحمٰن بن قاسم سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ

(وآلہ) وسلم نے:

مسلمانوں کو اپنی مصیبتوں میں میرے مصائب کا تذکرہ کرکے تعزیت کرنی چاہیے۔"

☆☆☆

اس مقام پر خود آنحضرتؐ کی وفات پر آپؐ کی پارۂ جان وتن، خنکیِ چشمِ رحمت حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا کے رنج ومحن، غم والم، تاثراتِ غم اور اُس یادگار مرثیہ کا ذکر نہ کرنا بجائے خود ایک ستم ہوگا جس کی تاریخ اور ادب کی دنیا میں ایک لازوال گونج ہے۔

اَحادیث اور مَرویّات کے مشہور قاموسی مجموعے "کنزُ العُمّال" میں حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰ علیہ السلام سے اور خادمِ رسولؐ انس سے روایتیں کی گئیں ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس دنیائے دنی اور دارِ فانی کی طرف سے اپنی آنکھیں موڑ لیں تو آپؐ کی "تنہا یادگار" سیدۂ کونین حضرت فاطمہ الزہراء سلام اللہ علیہا بے قرار ہو ہو کر یہ جملے فرماتی تھیں:

"وا ابتــاه مِــنْ رَبــه مَــا أدْنــاه

وا أبتــاه جـنـــان الــخـلـد مـأواه

وا ابتــاه ربُّــه يُـكْـرِمـهُ اذا أدْنَـاه

الرَّب والرسل تُسَلِّمُ عَلَيهِ حتّى تَلَقّاه!"

میں ان فقروں کا ترجمہ کرکے اِن کے اصلی تاثُر کو ضایع یا کم نہیں کرنا چاہتا۔

ہاں! خادم ودربانِ رسولؐ انس نے حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کا ایک ایسا

جملہ بھی نقل کیا ہے جسے جتنی بار پڑھتا ہوں، کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے، دل کٹ کر رہ جاتا ہے اور آنکھوں میں بے اختیار آنسو آجاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دفن کرکے پلٹے تو جناب فاطمہؑ نے فرمایا:

"كَيْفَ طَابَتْ اَنْفُسُكُمْ أنْ تَحْثُوا عَلَىٰ رَسُولِ اللّٰهِ التُّرابَ!"

"کیسے تمہارے دلوں نے رسول اللہ پر مٹی ڈالنا گوارا کیا!"

(کنز العمال ج ۷ ص ۲۶۱)

جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کی زبانی مرثیہ پیغمبرؐ کے اشعار بھی تاریخ کی کتابوں میں جس قدر شہرت رکھتے ہیں کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔

علامہ بہائی نے کشکول (ج ۳ ص ۲۴) میں "المعتبر" کے حوالے سے نقل کیا ہے: اِنَّ فَـاطِـمَةَ عَـلَيْهَـا السَّلام قَبَضَـتْ مِـنْ تُـرابِ قَبرِ النَّبِيِّ فوضعتْهَا عَلَىٰ عَيْنِهَا فَقَالَتْ:

مَــاذَا عَــلَــىٰ مَـنْ شَـمَّ تُـرْبَـةَ اَحْـمَـدَ

اَنْ لَا يَشُــمَّ مَـدَى الـزَّمَـانِ غَـوالِـيَا

صُبَّــتْ عَــلَــيَّ مَـصَـائِـبُ لَـوْ اَنَّهَــا

صُبَّــتْ عَـلَـىٰ الاَيَّـامِ صِـرْنَ لَـيَـالِـيَا!

فاطمہ زہرا علیہا السلام نے قبرِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاک کو اٹھا کر اپنی آنکھوں پر رکھا اور فرمایا:

جس نے تربتِ احمدؐ کی نکہت پالی ہو اگر وہ تمام عرصۂ دہر کوئی اور خوشبو نہ بھی سونگھے تو کیا ہے! (مراد یہ ہے کہ پیغمبرؐ کو سپردِ خاک کردینے کے بعد اَب کوئی زیب وزینت کا محل باقی نہیں رہا! بلکہ اب تا قیامت سوگواری ہی زیبا ہے!)

اور فرمایا:

میرے بابا، پیغمبرِ خدا کے گزر جانے سے مجھ پر وہ مصائب آپڑے ہیں کہ اگر دنوں پر پڑتے تو وہ راتوں میں بدل جاتے!

در این بلا بجائے من ار روزگار بود

روزِ سپید او شبِ تاریک می نمود

☆☆☆

کنز العمال اور اس کے علاوہ احادیث کے متعدد مجموعوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر حضرتِ خضر علیہ السلام کا ''اہلبیت'' کی تعزیت کے لیے آنا اور ان کے تعزیتی کلمات بھی نقل کیے گیے ہیں۔ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

''فلمّا قُبِضَ رَسُولُ اللّٰهِ صلی اللہ علیهِ وآلِهٖ وسَلَّمَ وَجَائتِ التَّعزِيَةُ جَاءَ آتٍ يَسْمَعُونَ حِسَّهٗ وَلا يَرَونَ شَخْصَهٗ فَقَالَ: ''السَّلامُ عَلَيْكُمْ اَهْلَ الْبَيْتِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ، فِي اللّٰهِ عَزَاءٌ مِنْ كُلِّ مُصِيبَةٍ وخَلَفٌ مِنْ كُلِّ هَالِكٍ ودَرْكٌ مِنْ كُلِّ مَا فَاتَ، فَبِاللّٰهِ ثِقُوا، وَإِيَّاهُ فَارْجُوا فَإِنَّ الْمَحْرُومَ مَحْرُومُ الثَّوابِ وَإِنَّ الْمَصَائِبَ مَنْ حرمَ الثَّوابَ والسَّلامُ عَلَيْكُمْ!'' قَالَ عَلِيٌّ: هَلْ تَدْرُونَ مَنْ هٰذا؟ قَالُوا: لا! قَالَ: هٰذا الْخَضِرُ.

العدوانی وابن سعد و البیهقی فی الدلائل (کنز العمال ج ۷ ح ۱۸۷۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اہلبیتؑ نے کتنا اور کب تک غم منایا اس کا ایک اندازہ وصیِ رسول امیر المؤمنین علی مرتضیٰ علیہ السلام کے اس

مکالمہ سے بھی ہوتا ہے جو علامہ شریف رضی نے نہج البلاغہ میں نقل کیا ہے:

''قِيلَ لَهٗ (عَلَيْهِ السَّلامُ): لَوْ غَيَّرتَ شَيْبَكَ يَا اَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ! فَقَالَ عَلَيهِ السَّلامُ: الْخِضَابُ زِينَةٌ و نَحْنُ قَوْمٌ فِي مُصِيبَةٍ. يُرِيدُ وَفَاةَ رَسُولِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم!

(نہج البلاغہ نسخۂ صبحی صالح، ص۵۵۳)

آپؑ سے کہا گیا: اے امیر المؤمنین! آپ خضاب لگاتے تو کیا اچھا ہوتا! آپ نے فرمایا: خضاب زینت ہے اور ہم تو مصیبت میں ہیں!

مصیبت سے آپؑ کی مراد وفاتِ پیغمبرؐ تھی!

حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے عمل اور آپؑ کے اِس ارشاد سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ بیتِ اطہارؑ نے کتنے دنوں تک آنحضرتؐ کے وفات پر سوگواری کے مراسم برپا رکھے (اس لیے کہ جس وقت آنحضرتؐ کی وفات ہوئی تھی حضرت علیؑ کی عمر مبارک صرف ۳۳ برس تھی اور آپ کے محاسنِ مبارک سفید نہیں ہوئے تھے!)۔

وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نبیؐ یا امام کی وفات پر ترکِ زینت ولذات مستحسن ہے!

ائمۂ اہلِ بیت علیہم السلام نے ذکرِ پیغمبرؐ کو جاری، یادِ پیغمبرؐ کو باقی، اور آپ کے ہجر وفراق کے غم کو زندہ اور آپؐ کی وفات سے فیضِ ربّانی اور سلسلۂ وحیِ الٰہی کے منقطع ہوجانے کے اَلَم کو پائندہ رکھنے کے لیے، تاکہ امتِ مسلمہ آپ کی محبت اور آپ کے قرب کے احساس سے بے گانہ نہ ہوجائے، آپؐ کے روزِ وفات کو ہمیشہ کے لیے روزِ غم قرار دیا ہے، اور اس روز آپؐ کی زیارت کرنے کی تاکید

فرمائی ہے۔ چاہے نزدیک سے ہو، چاہے دور سے، جس سے جس طرح بھی ممکن ہو۔ زیارت کے کلمات میں بھی ایسا دردوغم بھرا ہوا ہے کہ زیارت پڑھتے وقت کسی عاشقِ رسولؐ کی آنکھیں خشک نہیں رہ سکتیں!

☆☆☆☆☆

دعائے افتتاح کے اس کے بعد کے فقروں میں فرزندِ رسول، مہدیِ آلِ بتول، مہدیِ موعود ومہدیِ برحق، حضرت ولیِ عصر، امام آخر، وصیِ خاتم، تتمہ وخلاصۂ آلِ عصمت حضرت حجت - امام وخلیفہ وسلطان وولیِ قائم حضرتِ ابوالقاسم م ح م د بن الحسن.... ابن حسین.... ابن علی بن ابی طالب علیہم السلام کی غیبت کا گلہ ہے۔ دشمنوں کی کثرت، اپنی قلت، زمانے کی آزمائشوں کی شدّت اور زمانے بھر کی ہم پر زور آزمائیوں کا تذکرہ ہے اور حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کی آل پاک پر درود وسلام کے صدقہ میں خدا سے مدد، فتح ونصرت، کشائشِ حالات، دفعِ ضرر، اقتدارِ حق، ظہورِ حجت، سایۂ رحمت اور لباسِ عافیت کی دعا ہے۔ اِن کلمات کے ذیل میں بھی بہت سے مطالب اور نکات عرض کرنے کی گنجائش باقی ہے لیکن اِس کتاب کے معینہ سطور وصفحات ختم ہو گئے اس لیے گفتگو یہیں پر ناتمام چھوڑتے ہیں۔

کام کو بس ربُّ الارباب ہی اِتمام تک پہونچانے والا ہے!

سُبحَانَ رَبِّکَ رَبِّ العِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُونَ

وَسَلَامٌ عَلَیٰ المُرسَلِینَ

وَالحَمدُ لِلّٰہِ رَبِّ العَالَمِین.

وَصَلَّی اللّٰہ عَلَیٰ حَبِیبِہِ المُصطَفیٰ

وَعَلَیٰ عِترَتِہٖ وَسَلَّم تَسلِیماً کَثِیراً

تشکر واعتذار

دعائے افتتاح کی شرح سب سے پہلے بعض طلبہ کے سامنے بصورتِ درس پیش کی گئی تھی۔ اس کے بعد اسے مجلسی تقاضوں کے تحت کچھ اضافوں کے ساتھ بلیک برن (برطانیہ) میں شبہائے ماہِ مبارکِ رمضان کی مجلسوں میں پیش کیا گیا، اور جو کچھ بطورِ درس و بحث بیان کیا گیا یا مختلف مجالس میں عرض کیا گیا اسے وقتاً فوقتاً تحریر بھی کیا جاتا رہا، اسی لیے اس کتاب میں کہیں تقریرِ درس کا سا انداز پایا جاتا ہے اور کہیں اس سے ذرا مختلف اسلوبِ عرض وطرزِ نگارش ہے۔

جس وقت یہ شرح بیان کی گئی تھی اور لکھی گئی تھی اس وقت تک اس دعا کی کوئی دوسری شرح سامنے نہیں آئی تھی، لیکن چونکہ اس کی اشاعت کی نوبت اب آئی ہے، اِس عرصہ میں ایک شرح مولفہ جناب آیۃ اللہ محمد رضا مہدوی کنی منظرِ عام پر آچکی ہے اس لیے پہلے خیال ہوا کہ اسے شایع ہی نہ کیا جائے، لیکن قدرے تامل کے بعد اندازہ ہوا کہ اس میں جو مطالب پیش کیے گئے وہ اُس کتاب سے بالکل مختلف ہیں اس لیے اس کی اشاعت میں کوئی مضایقہ نہیں ہے۔ اب جو کچھ بھی ہے قارئین کے سامنے ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کے لیے برادرِ مکرم (ڈاکٹر) سید رضوان کاظمی (ابن ڈاکٹر سید غلام حیدر کاظمی مرحوم ومغفور) اور محبِّ مکرم سید امیر عباس زیدی (فرزندِ جناب ڈاکٹر سید ممتاز حیدر زیدی مرحوم ومغفور) کے گرانقدر عطیات کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے بس میں نہیں ہے۔ دست بدعا ہوں کہ ربِّ کریم ان کے توفیقاتِ خیر میں بیش از بیش برکتیں عطا فرمائے۔

اس کتاب کی تحریر و تزئین اور اس کے مسودہ کی قرأت کے لیے عزیزی مولوی فیضان احمدندوی، عزیز مکرم ڈاکٹر عبد السلام صدیقی اور صدیقِ مکرم ڈاکٹر مکتوب الرحمان قاسمی (ایم۔آر۔قاسمی، علیگ) صاحبان کا بھی صمیمِ قلب سے ممنون ہوں۔

اردو کے معتبر ادیب شفیقِ معظم جناب غلام حیدر صاحب نقوی کا میں کسی بھی طرح شکریہ ادا نہیں کرسکتا جنہوں نے اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود پریس جانے سے پہلے اس کتاب کو از اول تا آخر پڑھ کر کتابت کی بعض اہم غلطیوں کی نشاندہی فرمائی۔

ربِّ کریم سے بتوسلِ حضراتِ محمد وآلِ محمد علیہم الصلاۃ والسلام اس ناچیز خدمت کی قبولیت کی عاجزانہ درخواست ہے اور بس!

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ وَ بِہٖ اِعْتَصَمْتُ وَبِہٖ اَثِقُ وَ عَلَیْہِ اَتَوَکَّلُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ وصلّی اللّٰہُ عَلیٰ حَبِیْبِہِ الْمُصْطَفٰی وَ عَلیٰ عِتْرَتِہٖ وَ ذُرِّیَّتِہٖ وَسَلَّمَ کَثِیْراً کَثِیْراً

ناچیز

عقیل الرضوی الغروی عفی عنہ

۳؍شعبان المعظم ۱۴۲۵ھ

قطعۂ تاریخ تالیف

از

ڈاکٹر سید مسعود حسن رضوی مسعودؔ رودولوی

وہ ضیا پاشی ''چراغِ راہ'' نے کی ہے کہ بس
جلوہ گر ہے چشمِ ہر سالک میں ہر راہِ فَلاح

سب منازل، سب مقامات و مشاہد منکشف
جگمگا اٹھے ہیں متنِ زیست کے گرد و نواح

یہ حقیقت میں ہے نورِ دیدۂ دانشوری
کلکِ علامہ نے روشن کی ہے یہ شمعِ فلاح

اے عقیلِ خاندانِ ہادی(۱) و فتحِ علی(۲)
تیری یہ تصنیف ہے منشورِ ہر خیر و صلاح

اے غَرِیؔ(۳) سے منتسب، اے دین و دانش کے عقیل
آلِ فتح(۴) اللہ کی تاریخ کے نجمِ صَباح

مہدیِ دوراں امامِ عصرؑ کے الفاظ کی
شرح لکھنے کا شرف پایا زہے بختِ نجاح

سالِ شمسی میں لکھی مسعودؔ نے تاریخ طبع
گوہرِ اصل کرامت ہے دعائے افتتاح

2003

(۱)(۲)(۴) :یہ مؤلفِ ''چراغِ راہ'' علامہ غروی کے شرفِ نسبی کی طرف اشارہ ہے، علامہ سید عقیل الغروی بن حجۃ الاسلام مولانا سید سبط حسن رضوی بن میر ہادی حسین رضوی بن میر صاحب علی بن میر خوش وقت علی بن میر فتح علی فتح اللہ رضوی نیشاپوری صاحبِ حُسینیہ و بانیِ اوقافِ خیریہ دراطرافِ بنارس و مرزاپور۔

(۳) :غَرِی نجفِ اشرف کا تاریخی نام ہے، جہاں مولائے کائنات، امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کا مزارِ مقدس ہے۔

فہرست مطالب وموضوعات

۲۳	رحمت	۶۸، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۵، ۷۶، ۷۸، ۷۹، ۸۱، ۸۲، //، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، //، ۳۴؛ //، //، //، ۱۴۰، ۱۴۵، ۱۵۰، ۱۵۴، ۱۷۹، ۱۸۳، //، ۲۱۶، //، //، ۲۱۷، //، //، ۲۱۹، ۲۲۰، //، //، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۳۲، ۲۳۸، ۲۵۳، ۲۵۴، //، ۲۵۹، ۲۶۰، //، ۲۶۲، //، //، //، ۲۶۳، ۲۶۸، ۲۸۴، //، //، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۷، ۳۳۸، //، ۳۳۹، ۳۶۸، ۳۷۲۔
۲۴	صفات	۶۹، ۹۳، ۹۷، //، //، //، //، ۹۸، //، //، //، ۹۹، //، ۱۰۱، ۱۰۲، //، //، ۱۰۳۔
۲۵	صفات ثبوتیہ	۹۷، ۹۹، //، //، ۱۰۰، ۱۹۰، ۲۱۲۔
۲۶	صفاتِ سلبیہ	۹۷، ۹۹، //، ۱۰۰، ۱۰۶، //، ۱۰۷، ۱۱۰، ۱۳۰، ۱۳۷، ۱۵۹، ۱۹۰۔
۲۷	صفات جلالیہ	۱۰۰، //، ۱۵۹۔
۲۸	صفاتِ جمالیہ	۱۰۰۔
۲۹	عزاداری	۳۶۴، ۳۶۷۔
۳۰	عذاب	۱۳۳، //، //، ۱۳۴، //، //، ۱۳۶، //، //، ۱۴۹، ۱۵۶، ۲۴۱۔
۳۱	فدک	۲۵۶، //، //، //۔
۳۲	فروعِ دین	۳۰۲، ۲۶۶، ۲۹۴، ۲۹۵۔
۳۳	کرامات	۲۳۸، //، ۲۵۸، ۳۰۴۔
۳۴	لطف	۵۷، ۵۸، ۶۳، //، ۶۴، ۶۵، //، //، //، ۶۶، //، //، ۶۷، //، //، //، //، //، //، ۶۸، //، //، //، //، ۱۰۱، ۱۱۸، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۴۰، ۱۴۲، ۱۵۵، ۱۶۳، ۱۶۵، ۱۷۱، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۵، ۱۹۷، //، //، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۳، //، ۲۰۵، ۲۰۶، //، ۲۶۸، ۲۸۴، ۳۳۶، //، //، //، //، ۳۳۸۔
۳۵	مسئلۂ جبر واختیار	۶۸، ۱۴۷، ۱۵۴، ۱۸۵، ۱۸۷، //، //، //، //، //۔
۳۶	معجزہ	۲۲۹، //، ۲۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹۔
۳۷	معجزۂ قولی	۲۹۹، //، ۳۹۹۔
۳۸	معجزۂ فعلی	۲۹۹، //، ۲۳۰، //، ۳۳۹۔
۳۹	مباہلہ	۲۳۸، ۲۵۶، //، //، ۲۶۷، //، ۲۶۸، ۳۴۱، //۔
۴۰	نبوت	۶۶، ۶۸، ۱۷۴، ۱۹۹، //، ۲۰۵، //، ۲۲۴، //، ۲۲۶، //، ۲۲۹، ۲۴۲، //، ۲۶۱، //، ۲۸۶، ۲۹۱، ۲۹۹، //، ۳۰۵، ۳۰۷، ۳۱۲، ۳۲۵، //، //، ۳۲۸، //، ۳۳۸۔
۴۱	نبی	۶۱، //، ۷۸، ۸۸، ۹۱، ۱۲۰، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۹، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۵، //، //، ۲۴۹، ۲۶۰، //، ۲۷۳، ۲۸۸، ۲۹۴، ۳۱۱، ۳۲۰، ۳۲۵، ۳۲۸، ۳۳۵، ۳۳۹، //، ۳۴۳، ۳۴۸، ۳۴۹، //، ۳۵۰، ۳۶۰، ۳۶۸، ۳۶۶، ۳۷۱۔
۴۲	ولی	۱۱۷، ۱۱۸، ۲۲۴، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، //، //، //، //، //، ۲۴۷، //، //، //، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۶، ۲۶۰، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۲۴، ۳۳۴، //، //، //، //، //، //، //، //، ۳۷۲، //۔

فہرستِ مآخذ ومصادر

●	قرآن	۵۹، ۶۰، ۶۱، ۷۰، //، ۷۵، //، ۷۷، ۸۴، //، ۸۶، //، //، ۸۷، //، //، //، ۸۸، ۸۹، //، ۹۱، ۹۳، //، //، //، //، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۸، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، //، //، ۱۱۹، ۱۲۲، //، ۱۳۲، ۱۳۳، //، ۱۳۴، //، ۱۳۵، //، ۱۳۶، //، ۱۳۸، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۷، ۱۵۲، ۱۵۶، //، //، ۱۵۹، ۱۶۵، ۱۷۰، ۱۷۲، //، ۱۷۳، //، ۱۷۴، ۱۷۷، ۱۸۵، //، ۱۹۲، //، //، //، ۱۹۳، ۱۹۶، //، //، //، ۱۹۷، ۱۹۹، //، ۲۲۰، //، ۲۰۱، //، ۲۰۲، //، ۲۰۳، ۲۰۵، //، ۲۱۱، ۲۱۴، ۲۱۵، //، //، ۲۱۶، //، //، ۲۱۷، ۲۲۲، //، //، ۲۲۴، ۲۲۹، //، //، ۲۳۰، ۲۳۳، //، //، ۲۳۴، ۲۳۸، //، //، ۲۴۰، ۲۴۴، //، ۲۴۶، ۲۵۴، ۲۵۶، ۲۵۷، //، ۲۶۰، ۲۶۲، ۲۶۷، ۲۷۹، //، //، ۲۷۰، ۲۷۵، //، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۶۷، //، //، ۲۸۸، ۲۹۰، ۲۹۵، //، ۳۰۵، //، //، ۳۱۰، ۳۲۵، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، //، //، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۷، ۳۳۸، //، //، ۳۳۹، //، ۳۴۰، //، //، //، ۳۴۱، //، //، //، ۳۴۲، //، //، //، [illegible]، //، //، //، //، //، //، ۳۴۵، //، //، //، //، //، //، //، //، //، //، ۳۴۶، //، //، [illegible]، //، //، //، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، //، //، //، ۳۵۳، ۳۵۴، //، //، //، //، //، [illegible]، ۳۶۵، [illegible]
۱	انجیل	۲۱۴، //۔
۲	اصولِ کافی	۱۱۷، ۱۹۷۔
۳	انجیلِ اہلبیت	۲۹۶۔
۴	الارشادات والتنبیہات	۸۸۔
۵	امالی	۳۰۰، //۔
۶	التوحید	۹۲، ۱۱۸۔
۷	الاقبال	۴۵، ۴۹۔
۸	استیعاب	۲۵۱، ۲۵۸، ۲۸۰۔
۹	الرسالۃ الدینیۃ	۳۰۳۔
۱۰	الصواعق المحرقہ	۲۴۲۔
۱۱	الکامل	۶۱، ۲۲۸، ۲۴۳، //، ۳۶۷۔
۱۲	الامام	۲۴۸، //، ۲۴۹، //۔
۱۳	المہدی فی القرآن	۳۳۰۔
۱۴	المعتبر	۳۶۹۔

۳۸۰

۳۸۱

	کنز العمال	۲۸۰،۳۶۸،۳۶۹،۳۷۰،//۔
	گلشن زار	۱۰۰۔
	لمعہ	۳۰۵۔
	معجم رجال الحدیث	۴۸۔
	مفاتیح الجنات	۵۱۔
۷	مہذب اللغات	۱۴۶۔
۹	مفاتیح الجنان	۵۲،//۔
۱۱	موسوعۃ الامام الصادق	۳۰۴۔
۱۴	مجع کبیر	۲۷۵۔
۱۵	معانی الاخبار	۱۱۸۔
۱۷	مجمع البحرین طریحی	۱۸۷،۳۵۲
۲۰	موطا	۳۶۷۔
	منہاج الصالحین	۳۰۵۔
	مصباح الفقیہ	۳۰۵۔
	مستمسک	۳۰۵۔
	مکاسب	۳۰۵۔
	نہج البلاغہ	۵۸،۷۶،//،۱۱۶،//،۱۸۸،۲۴۴،۲۴۵،۳۵۲،۳۷۱۔
	نورالابصار	۲۶۱۔
۲۲	وسائل الشیعہ	۴۸۔
۲۵	وظائف الشیعہ	۴۸۔
۲۶	وسیلۃ الدارین فی انصار الحسین	۲۷۸،۲۷۹۔
۴۱	ینابیع المودۃ	۲۹۱۔

The actual price of the book is that you read this book carefully with affection and concern for your own self while the material price of it is Rs. 200/= only.
The sale proceeds will be untilised for the services offered by the *"Safina Charitable Hospital & Research Centre".*
Rizwan Kazmi.
Ameer Abbass.

CHERAGH-E-RÃH

EXEGESIS OF DUÃ-E-IFTETÃH

VOL. 1.

By :

ALLAMA
SAYYID AQEEL ALGHARVI

Published by :

MAKTABA-E-KÃINÃT. DELHI

2004

Price : Rs. 200/00
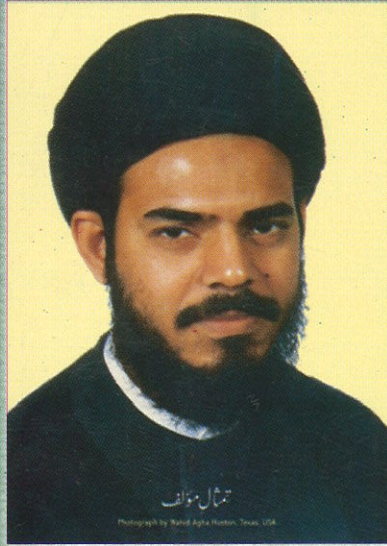
The actual price of the book is that you read this book carefully with affection and concern for your own self while the material price of it is Rs. 200/= only.

The sale proceeds will be untilised for the services offered by the

"Safina Charitable Hospital & Research Centre".

Rizwan Kazmi
Ameer Abbass

MAKTABA-E-KÃINÃT.